”چہارسُو“

...... پانچواں درویش

یہ میری سرگزشت ہے، انقلاب ایران کی تاریخ نہیں۔ البتہ ایران میں تین سال کے دوران ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک ملاؤں کی زیر اثر حالات نے جو کروٹیں بدلیں ان کو میں نے خوبی، سچائی اور غیر جانبداری کے ساتھ بیان کر دیا۔ ایران میں میرا بارہ سالہ قیام ایک تاریخ ساز دور تھا۔ اس مدت میں میرا شکار بھی جاری رہا، اطمینان بھی رہا، اور پھر میری نظروں کے سامنے ایک عظیم انقلاب برپا ہوا جس نے ساری دنیا کو حیران کر دیا۔ ایک مطلق العنان، نہایت مدبر، بظاہر اپنے ملک کا ہردلعزیز بادشاہ جس کے اشارۂ ابرو پر ایرانی قوم کو جان قربان کرنے پر آمادہ خیال کیا جاتا تھا وہ تخت وتاج چھوڑ کر ملک سے فرار ہو گیا۔ میرا معاملہ مختلف تھا ممکن ہے میں خوف زدہ ہو گیا اگر میں ٹھہر جاتا اور جو انقلابی ادارے مجھ سے باز پرس کرنا چاہتے تھے ان کو میں اپنی حیثیت واضح بتا دیتا اور ان کی تحقیقات میں تعاون کرتا تو وہ مجھے بھی شاید تہران میں رہنے دیتے۔ مجھے تہران سے محبت تھی، ایرانیوں سے محبت تھی، ایران کی آب وہوا سے انس تھا۔ واقعہ یہ ہے میں ایران چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود عبدالرضا نے مشورہ دیا تھا کہ میں ایران ترک کر دوں۔ میں نہ شہنشاہ ایران کی رعایا تھا نہ آیت اللہ خمینی کا مرید یا مقلد۔ میرے لیے دونوں مساوی الحیثیت تھے۔ میں نے نہ تو شاہ ایران کی مدح سرائی کی ہے نہ خمینی کے قصیدے لکھے ہیں۔ اسی طرح میں نے کسی کی مذمت بھی نہیں کی لیکن سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ میری کوشش یہی رہی کہ غیر جانبدارانہ بیانات ہی قلمبند کروں۔ میں نے وہی لکھا جو عام لوگوں کے خیالات تھے اور جس طرح واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ میں شہنشاہ ایران محمد رضا پہلوی کا معترف بھی ہوں۔ ان کو پاکستان سے محبت تھی اور وقتاً فوقتاً سرکاری تقریبات میں شرکت کے لیے بے تکلفانہ پاکستان آتے رہتے تھے۔ ایسی ہی ایک تاریخی اور نایاب تصویر یہاں دیکھی جاسکتی ہے جب شاہ ایران اسکندر مرزا کی صدارت کے دوران کراچی کی ایک تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ جس وقت شہنشاہ ایران کو مہرآباد ایئر پورٹ پر اپنے وطن کو ترک کرتے دکھایا جا رہا تھا اس وقت میں نے لوگوں کی بڑی تعداد کو زار و قطار روتے دیکھا۔ لیکن یہ لوگ ملاؤں اور انقلابی خونیوں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ کھل کر رو بھی نہیں سکتے تھے۔

قارئین محترم ''پانچواں درویش'' کی نسبت اجمالی تعارف آپ کی توجہ کے لیے پیش کیا جوں جوں آپ کتاب کی ورق گردانی کریں گے ؤوں ؤوں آپ کی دلچسپی تحیّر میں بدلتی جائے گی کہ تیسری دنیا بالخصوص مسلم ممالک میں حالات کبھی بھی کوئی بھی رُخ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کا سبب براہِ راست نہ سہی بین السطور بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس کے بارے میں کتاب پڑھ ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

...... نقشبند قمر نقوی بخاری

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۶۵۰ روپے،، دستیابی: ریحان کتاب گھر، اردو بازار، کراچی۔

...... مٹھی بھر زندگی

بقول پروفیسر مرزا اسلم بیگ:

''اس وقت حیدرآباد میں صرف شاکر جمال نے افسانے کے چراغ کو روشن کیا ہوا ہے۔''

افسانہ نویس، شاعر اور ڈرامہ نگار (تھیٹر) شاکر جمال حیدرآباد کی ایک فعال ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مٹھی بھر زندگی'' ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آیا ہے جس میں بیس افسانے شامل ہیں تقریباً تمام افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے گرد گھومتے ہیں جس میں طبقاتی کشمکش، بھوک، محرومی، دھوکا، بے بسی کا دکھ اور اختیارات کی ہوس ہے۔ یہ افسانے خاص کر ''بند گلی''، ''پچھلا پہر''، ''پھول چوک''، ''پہلی تاریخ''، ''دعائیں''، ''چار نمبر گلی''، ''پس خوردہ'' اور ''راہِ دشوار'' کے علاوہ کتاب میں ایسے کئی افسانے ہیں جو ہمیں رونے، چپ رہنے، ملامت کرنے، احتجاج کرنے اور تماشا گروں کو ختم کرنے کا سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر طاہرہ اقبال:

''ہر کہانی نفرتوں کے بیج کی بیج کنی کی خواہش نظر آتی ہے۔''

......نوید سروش

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: 4/264، سرفراز کالونی، حیدرآباد۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۸،شمارہ:ستمبر،اکتوبر ۲۰۱۹ء

رابطہ:537/D-1 ،گلی نمبر18،ویسٹریج-III ،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆☆
☆

○●○

قرطاسِ اعزاز

ذکیہ مشہدی

کے نام

○●○

اس مرتبہ دنیا زاد میں تمہاری ایک نئی یافت اور دریافت محسوس ہوئیں، کم از کم میرے لیے۔ بھئی کیا خوب افسانہ ہے۔ داستانی لحن ایسی کہ رجب علی سرور اور میر امن کا سارالحن اور طرز بیان افسانے کے بانکپن اور اختصار میں اس طرح یکجان کر کے سمودیا ہے کہ بس کیا کہوں میرے پاس تو الفاظ نہیں۔ اس افسانے کے پہلے حصے میں مغل سردار کی آمد اور وفات اور پھر دوسرے میں بنواری کا چائے خانہ المونیم کی پرات میں پکوڑے لیے ہے۔ میں خوب پیاز اور ہری مرچوں سے تیار مصالحہ اور سیاہ رنگ کی کڑھائی میں ویسی ہی رنگت کا ابلتا تیل ٹیڑھا میڑھا المونیم کا کٹورا جس کے تتیئے کی طرح ڈنک مارنے والی ہری مرچوں اور دھنئے کی چٹنی۔ اس پر مستزاد گمّا اینٹوں کو جوڑ کر بنائی ہوئی بیٹھک کے ساتھ بہاری ڈکشن۔ بنواری کے ہوٹلو اپر سارے Five Star ہوٹل قربان کر دیئے، بے سروسامانی۔۔۔ مجھے تو یہی لگا کہ اسی سب نے میرے حق میں مسیحائی کی کہ میں اپنی ساری تکلیفوں کو بھول کر بنواری کے ہوٹلو اپر پہنچی ہوئی ہوں اور پتّے پر دھرے پکوڑے چٹ پٹی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی ہوں۔

دوسری چیز جس نے اپنے گردوپیش اور ماحول سے لے جا کر تمہارا ہم سفر بنایا وہ تمہارا وہ سفرنامہ ہے جس میں قاری بلا ارادہ ہی تمہارا ہم سفر بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سفر کے ہر مرحلے پر شریک احوال رہتا ہے۔ انتظار صاحب کی شخصیت ان کے ذہن کی سادگی اور گہرائی بھی بن بلائے ہی ساتھ ساتھ چلتی ہوئی۔ بڑا لطف آیا خصوصاً ان ناشتے اور کھانے کے Timing پر اصرار بھئی یہ تو ہمارے گھرانوں کی سب سے اہم تاکید اور اصرار ہوا کرتی تھی۔ اور ان کا کہنا تھا کہ ہمارے غذائی نظام اوقات کا حفظانِ صحت کے عمل میں بڑا دخل ہے۔

الطاف فاطمہ

○●○

اردو
کہانی
کا
بانکپن

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : ذکیہ سلطانہ مشہدی
قلمی نام : ذکیہ مشہدی
تاریخ پیدائش: ۱۹۴۴ء (امروہا)
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے سائیکالوجی (لکھنؤ)

مطبوعات:

۱۔ پرائے چہرے ۱۹۸۴ء
۲۔ تاریک راہوں کے مسافر ۱۹۹۳ء
۳۔ سدائے بازگشت ۲۰۰۳ء
۴۔ نقشِ ناتمام ۲۰۰۸ء
۵۔ یہ جہانِ رنگ وبُو ۲۰۱۳ء
۶۔ منتخب افسانے ۲۰۱۶ء
۷۔ آنکھاں دیکھی ۲۰۱۶ء
۸۔ پارسابی بی کا بگھار (ناولٹ) ۲۰۱۶ء

تراجم:

(ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی)

۱۔ پاک ہیرو، مصنف رام لال صاحب (اردو سے ہندی)
۲۔ نیلا چاند، مصنف شیو پرساد سنگھ (ہندی سے اردو)
۳۔ شیڈو فرام لداخ، مصنف بھابانی بھٹ چاریہ (انگریزی سے اردو)
۴۔ دی لاسٹ سلیوٹ، سنتوش کمار گوش کے بنگالی ناول ’’شیش نمشکار‘‘ کا انگریزی ورژن (اردو ترجمہ)

(نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی کے لیے)

۱۔ پرایا گھر، مصنف گیلانی بانو (انگریزی سے اردو)
۲۔ Bridging Connections، سری لنکا سے چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ (انگریزی سے اردو)
۳۔ ایوانِ غزل ایک ناول، مصنف گیلانی بانو (اردو سے انگریزی)

(خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

۱۔ Understanding human behaviour، منصف پروفیسر شمشاد حسین (انگریزی سے اردو اور ہندی میں ترجمہ)

(خواندگی بالغاں، بہار)

۱۔ تعلیم بالغاں سینٹر (گورنمنٹ بہار) کی رہنمائی میں دیسی عوام کے لیے تقریباً دودرجن کتابوں کا ترجمہ آسان ہندی اور اردو میں۔
۲۔ دو کتابیں تعلیم بالغاں سیل آف نیشنل بک ٹرسٹ، بھارت کے لیے لکھی گئیں (ہندی میں)
۳۔ نئی دہلی میں ایک کتاب مہاتما گاندھی پر تعلیم بالغاں کے ڈائریکٹوریٹ کے لیے ۲۰۰۸ء میں آسان ہندی میں لکھی گئی۔
۴۔ تقریباً آدھا درجن کتابیں نیم خواندگان کے لیے لکھی گئیں تا کہ انہیں صحت، صفائی اور روزہ مرہ اُمور کی تعلیم دی جاسکے۔

شرکتِ سیمینار:

۱۔ کبیر کے دوہوں میں عورت کا تصور
۲۔ شکیلہ اختر
۳۔ مسائل اور امکانات کا اردو ترجمہ
۴۔ بلونت سنگھ کی پنجابی سوانح حیات پر رتن سنگھ کی اردو کارکردگی
۵۔ اردو ادب میں غیر کا تصور

اعزازات:

۱۔ پہلی تین چھوٹی کہانیوں کے مجموعے پر بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ۔
۲۔ خواندگی میں شراکت (اضافے) پر بہار گورنمنٹ ایوارڈ (۲۰۰۳ء)
۳۔ بہار اُردو اکیڈمی نے سہیل عظیم آبادی ایوارڈ سے نوازا (۲۰۱۵ء)
۴۔ نیم خواندگی پر لکھی تین کتابوں پر گورنمنٹ اور سینٹرل گورنمنٹ ایوارڈ
۵۔ غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی نے مرزا غالب ایوارڈ برائے فکشن (۲۰۱۶ء)
۶۔ شمیم نکہت فاؤنڈیشن، لکھنؤ کی جانب سے فکشن ایوارڈ (۲۰۱۸ء)
۷۔ دی لاسٹ سلیوٹ کے ترجمہ پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (۲۰۱۸ء)

’’باہیا کیہہ جاناں میں کون‘‘ پر کام جاری ہے۔ بچوں کی کہانیوں پر بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ کہانیاں بچوں کی دنیا (N.C.P.U.L) نئی دہلی میں شائع ہوتی ہیں۔

تجربہ:

۱۔ آبادیاتی تحقیقاتی سینٹر، یونیورسٹی آف لکھنؤ میں ایک سال کے لیے تحقیقاتی اسسٹنٹ کے طور پر کام کا تجربہ۔
۲۔ لورنٹو کونوٹ کالج لکھنؤ میں ۶۔ سال بطور سائیکالوجی ٹیچر کا تجربہ۔

براہِ راست ...... گلزار جاوید

چھار سو کے ابتدائی ایام میں "براہِ راست" کی نسبت یکسانیت کے حوالے سے اُستادِ محترم سید ضمیر جعفیری ھمیشه متفکر رھتے اور گاھے به گاھے اس حوالے سے تبادله خیال بھی جاری رکھتے که ھم شعر و سخن ، افسانه،تنقید اور تحقیق کے حوالے سے اس مکالمے کی تازگی اور توانائی کو کب تک برقرار رکھ پائیں گے۔ وقت کے ساتھ آپ کے تعاون اور حوصله افزائی نے اس سلسلے کو نه صرف دیر پا کیا بلکه علم و ادب کے باھنر،ثقه اور بلند قامت اھلِ قلم نے براہِ راست کو ھمیشه یه کھه کر سراھا که آپ کا یه کام تنقید و تحقیق کے حامل افراد کے لیے جس قدر مفید ھے اُسی قدر آنے والے وقتوں کے لیے صاحبِ قرطاسِ اعزاز کو جانچنے اور پرکھنے میں بھی مفید و مددگار رھے گا۔

ذیل کے مکالمے میں محترمه ذکیه مشھدی نے جوابات کی شکل میں جو انداز اور لب ولھجه اپنایا ھے اُس سے ھمارے دل میں کچھ واھمے جگه پا رھے ھیں۔ تین دھائیوں پر مشتمل علماء و حکماء کی رائے کو اولیت دی جائے یا محترمه کے اندازِ سخن کو پیش نظر رکھا جائے۔

ھمیشه کی مانند عام فھم محاورے کے مطابق گیند آپ کی جانب لڑھکا دی گئی ھے۔ معامله اھم بھی ھے اور سنجیده بھی اس سے زیاده اھمیت کی حامل ھمارے پیش نظر آپ کی رائے ھے جس کی روشنی میں ھمارے ارادوں کو تقویت بھی مل سکتی ھے اور ضعف پھنچنے کے امکانات بھی ھیں مگر ھم کشاده دلی اور کشاده ذھنی کے ساتھ پیشگی طور پر سرِ خم ھیں ---!!!

☆ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم ہر بار گفتگو کی ابتدا نئے ڈھنگ اور نئے انداز سے کریں۔ ہر بار مگر بیتے دنوں سے ہمکلامی مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی؟

☆☆ آپ کے اس سوال کی صورت (Form) سوال جیسی تو نہیں ہے لیکن سمجھ میں یہ آیا کہ آپ کو راقم الحروف کی زندگی سے وابستہ کوائف درکار ہیں۔

☆ سطور بالا کی روشنی میں تعلیمی حوالے سے تفصیل جاننا اور نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں سے آ گاہی حاصل کرنا بھی ضروری ہے؟

☆☆ میرا تعلق ہندوستان کے اتر پردیش (عرف عام میں یو-پی) کے دو اضلاع سے تقریباً برابر کا ہے۔ایک لکھنؤ اور دوسرا پڑوس کا ضلع سلطان پور اودھ۔ میری ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم (اپنے وقت کے لحاظ سے اعلیٰ) انھیں دونوں جگہوں میں ہوئی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ سلطان پور اودھ کے گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول سے کیا اور بی.اے اور ایم.اے (نفسیات) کی ڈگریاں لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔

غیر نصابی سرگرمیوں کے تحت کسی خاص سرگرمی پر توجہ نہیں دی۔لاپروا اور کھلنڈرا مزاج پایا تھا۔ ہائی اسکول (دسویں جماعت) کے دوران میں نے ڈرائنگ اور پینٹنگ بطور اختیاری مضمون لے رکھی تھیں۔ ہائی اسکول کے بعد بھی انھیں جاری رکھا۔اکثر پینٹنگ کرتی رہتی تھی۔ نیچر اسٹڈی میرا پسندیدہ موضوع تھا۔ گریجویشن ختم ہوتے ہوتے یہ شوق بھی معدوم ہوگیا۔ مطالعے کی شوقین تھی، کبھی کبھار مباحثوں میں حصہ لیتی تھی۔کوئی قابلِ ذکر بات نہیں جو بتاؤں۔ کچھ انعام حاصل کیے تھے، کچھ وظیفے ملے تھے۔ان کا بالتفصیل ذکر ضروری نہیں سمجھتی۔ زمانۂ طالب علمی کی باتیں ہیں۔قابلِ ذکر صرف دو گولڈ میڈل ہیں جو میں نے ۱۹۶۴ء میں گریجویشن میں اردو اور ایجوکیشن (ایجوکیشن بھی ایک مضمون تھا) میں یونیورسٹی میں لڑکیوں میں ٹاپ کرنے پر حاصل کیے تھے۔ یہ میرے پاس محفوظ ہیں۔

☆ آپ کے دل، دماغ اور احساس میں تخلیقی سوتے کب اور کس طور پھوٹنا شروع ہوئے اور پہلا ارادی قدم کس سمت بڑھا؟

☆☆ اس سوال کا حتمی جواب شاید ہی کوئی دے سکے۔ اس لیے کہ کوئی مقررہ لمحہ یا دن یا وقت عموماً نہیں ہوتا ہے جب پہلے پہل کسی تخلیقیت کا احساس ہوتا ہو۔قدرت مختلف سطح کی انفرادی ذہانت عطا کرتی ہے اور ذہانت کے ساتھ ہی کچھ خصوصی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو Aptitudes کہلاتی ہیں۔ تقریباً ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خصوصی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر اس کی آبیاری ہوئی اور ماحول سازگار ملا تو وہ فروغ پاتی ہے ورنہ خفتہ رہ جاتی ہے۔ میں جب بھی ہندی یا انگریزی (اردو اسکول میں نہیں تھی) کی کلاس میں کوئی مضمون لکھتی تو عموماً ٹیچر اس کی تعریف کیا کرتی تھیں۔۱۹۶۱ء میں اسکول سے پہلی بار میگزین نکلا جس کے لیے لڑکیوں سے مضمون/کہانی/نظم وغیرہ دینے کی فرمائش کی گئی۔ یہ میگزین ہندی میں تھا۔ میں نے کہانی لکھی ''چمپا کی خوشبو'' یہ ہندی میں تھی۔ ہندی لکچرر میگزین کی ایڈیٹر تھیں انھوں نے قدرے بے یقینی کے عالم میں پوچھا ''یہ کہانی تم نے لکھی

ہے'' وہ بڑی درشت مزاج اور سخت گیر لیکن نہایت اعلیٰ درجے کی استاد تھیں۔ میں نے ضرور ہکلاتے ہوئے جواب دیا ہوگا کہ میں نے ہی لکھی ہے۔ انھوں نے قدرے توقف کیا پھر بولیں۔ ''اگر سچ بول رہی ہو تو لکھتی رہنا۔ بہت آگے جاؤ گی۔'' میں نے ان کی بات پر کان نہیں دھرے۔ باقاعدگی سے کبھی نہیں لکھا۔ جھٹ پٹ لکھتی رہی زیادہ تر ضائع کرتی رہی۔ ۱۹۷۲ء میں میری شادی ہوئی۔ ابتدا میں گھریلو زندگی کی مصروفیات اچھی لگیں۔ پھر خیال آیا کہ اتنا پڑھ لکھ کر میں کیا کر رہی ہوں تو شوہر کے بڑے بھائی کے مشورے پر ترجمے شروع کیے۔ پھر کہانیاں بھی باقاعدگی سے لکھیں۔

☆ آپ جیسی خوش شکل اور خوش فکر خاتون اگر شعری دنیا میں قدم رکھے تو چند غزلیں یا مشاعرے شہرت و ناموری کے لیے کافی ہوتے ہیں اس کے باوجود آپ نے نثر بالخصوص افسانے کا انتخاب کیا؟

☆☆ شاعری کے لیے پہلی شرط طبیعت کا موزوں ہونا ہے۔ میرے اندر اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیا آپ کا خیال ہے لوگ شہرت اور نام و نمود کے لیے لکھتے ہیں؟ یہ سوچ، گستاخی معاف، بہت گھٹیا سوچ ہے۔

☆ ایک کامیاب افسانہ نگار کے لیے کن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے اور ان کو جانچنے کا طریقہ کار کیا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں کامیاب افسانہ نگار کے لیے حساس طبیعت، قوت مشاہدہ، زبان پر دسترس اور وسیع مطالعہ ضروری اوصاف ہیں۔ ان کو پرکھنے کا کوئی پیمانہ میں نہیں بتا سکوں گی یوں بھی ادب داخلی چیز ہے، اس کو معروضی طور پر پرکھنا بہت مشکل ہے۔ قاری کی اپنی فہم و فراست اور مطالعے کی گہرائی اس کے بارے میں کوئی معتدل رائے قائم کر سکتی ہے۔ واضح طور پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ایک اعلیٰ درجے کا ادب پارہ وہ ہے جو فکر کو مہمیز دیتا ہے اور ساتھ ہی کہیں قاری کی جمالیاتی حِس کو بھی تسکین پہنچاتا ہے۔ انبساط کا عنصر اتنا ہی اہم ہے جتنا فکرانگیزی۔ ورنہ تحریر اخباری رپورٹ بن جاتی ہے۔

☆ کامیاب افسانہ نگار کے لیے کن اوصاف کو ضروری گردانتی ہیں اور اُن کو دسترس میں لانے کے لیے کس طرح کے جتن کیے جاتے ہیں؟

☆☆ آپ کے اس سوال کے نصف حصے کا جواب تو اوپر آ گیا ہے۔ افسانہ نگاری، شاعری وغیرہ کی صلاحیت بڑی حد تک قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ اگر آپ نفسیات کی زبان استعمال کریں تو یہ specific abilities کے زمرے میں آتی ہیں۔ حساس دل بھی فطری طور پر حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ یہ مزاج (temprament) کا جز ہے جو اُن خواص میں سے ہے جو بڑی حد تک پیدائشی ہوتے ہیں۔ اب رہی بات قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تو کتابوں کا مطالعہ اور گرد و پیش کی طرف سے آنکھیں کھلی رکھنا ضرور اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ آپ ان قدیم مصنّفین اور شعرا کا مطالعہ کریں جن کے وقت میں کتابیں نہیں تھیں، لائبریریوں کی تو بات چھوڑ دیجیے۔ خوب صورت اشعار، فکرانگیز تحریریں ان کی قوت مشاہدہ کی شاہد ہیں۔ میں محض کبیر کی مثال دوں گی۔ کیا پاکستان میں لوگ کبیر کو پڑھتے ہیں؟ بڑے احترام کے ساتھ میں انھیں جاہل کہوں گی۔ ایک جاہل انسان جو خود کہہ رہا ہے کہ میں نے نہ کاغذ کو ہاتھ لگایا نہ کبھی قلم چھوا اس طرح کے دل کو چھونے والی ساکھیاں اور سبد کہتا ہے۔ ایک مثال سنیے:

''نینوں کی کر کوٹھری، پوتری پلنگ بچھائے، پلکوں کی چلمن ڈاری کے پیا کو لیا رِجھائے''

میں نے اپنی آنکھوں کی کوٹھری میں پتلی کا پلنگ بچھایا اور پلکوں کی چلمن ڈال کے محبوب کو رِجھا کر (وہاں قید کر لیا) یہ معرفت کا شعر ہے اس لیے کہ کبیر کے یہاں دنیاوی عشق کا گزر نہیں ہے۔ ملک محمد جائسی کے یہاں غضب کی جمالیات ہیں۔

بس ایک بات کہنا چاہوں گی وہ یہ کہ آج کے فکشن نگار کسی خاص موضوع کو ہاتھ لگانا چاہیں تو اس کے تعلق سے تمام معلومات حاصل کر لیں ورنہ مضحکہ خیز نتائج برآمد ہوں گے جیسے ہمارے یہاں کے ایک مشہور ناول نگار نے اپنے ناول کے ہیرو کو جنسیات (sexology) میں آنرز کرتے دکھایا ہے جیسے یہ بی۔اے کا کورس ہو۔ علاوہ ازیں جو فکشن حقیقت پر مبنی نہ ہو اس میں تاثر نہیں پیدا ہو سکتا۔ ضروری نہیں کہ تکنیکی موضوع سب کو معلوم ہو، لیکن اس پر لکھنا چاہتے ہیں تو بنیادی باتیں معلوم کر لینی چاہئیں۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ اسی طرح کی کئی کہانیاں دیکھیں اور یہ پاپولر فکشن کی نہیں بلکہ ادبی حیثیت کی تخلیقات کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے آدی باسیوں پر لکھنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے خصوصاً نکسل تحریک کے حوالے سے لیکن مجھے آدی باسیوں کے لائف اسٹائل اور ماحول سے واقفیت نہیں ہے اس لیے اس موضوع کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بنگلہ مصنفہ مہاشویتا دیوی نے ان کے درمیان رہ کر، بلکہ ایکٹوسٹ بن کر بہت کام کیا اور معرکہ کا ادب پیش کیا۔

☆ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے روزمرّہ واقعات اور اخباری تراشے جمع کر کے کہانی گھڑنے یا بنانے کی جو بات کی ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے اور آپ کی پوزیشن اس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ فاروقی صاحب کے مشاہدے پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں خاص طور پر جب کہ وہ سامنے کی حقیقت ہو۔ واقعہ ہے کہ اکثر سہل پسند اردو افسانہ نگار اخبار میں چھپے واقعات پر اکہری اور سطحی کہانیاں لکھ ڈالتے ہیں۔ فلمی/ادبی پرچے شمع میں اسی طرح کی کہانیاں بہت آتی تھیں۔ ابھی حال ہی میں الور میں مارے گئے پہلو خان پر ایک افسانہ پڑھا۔ لیکن میں یہاں یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ اخبار اور دوسرے ذرائع ابلاغ ہی بڑی حد تک یہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں کہ سماج میں کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ لوگوں کی فکر کیا ہے۔ ہمارے سربراہ کیا کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دورِ حاضر کو ماضی سے جوڑنا، یا بذاتِ خود اس کی عکاسی کرنا فکشن کے

بنیادی مقاصد میں ہے۔مشہور بزرگ ہندی مصنفہ منّو بھنڈاری نے ۱۹۸۲ء میں ناولٹ ''مہابھوج'' لکھا جو بے حد معروف ہوا۔اس پر انھوں نے ڈرامہ بھی بنایا جو نہ جانے کتنی بار کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا۔یہ ناولٹ ۱۹۷۷ء میں بہار کے ایک گاؤں بیلچھی میں ہوئے ہریجنوں کے قتلِ عام پر سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا لیکن اس میں واقعہ سطحی طور پر بیان نہیں ہوا، بلکہ بیان ہوا ہی نہیں ہے۔اس کی روح ہے اس میں، سیاسی ہستیوں کے اقتدار اور جرائم کی دنیا کے گٹھ جوڑ، ان کے شاطرانہ ہتھکنڈے نہایت چابکدستی سے یوں بیان ہوئے ہیں کہ 'کہانی پن' بھی برقرار ہے اور 'مغز' بھی۔مسز بھنڈاری نے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ وہ بہت سی خبروں کے تراشے نکال نکال کر فائل کرتی جاتی ہیں۔لیکن کبھی ان کے یہاں کوئی اکہری یا سطحی کہانی جو خبروں پر مبنی ہو، نہیں دیکھی۔تو معیاری افسانہ/ ناول جس کا آئیڈیا خبروں سے لیا گیا ہو لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ افسانہ نگار واقعہ کو گہرائی سے پرکھے اور اس کی جڑوں تک رسائی حاصل کر کے لکھے۔

☆ اسی رائے میں خواتین افسانہ نگاروں کی جانب اُنگلی اُٹھا کر فاروقی صاحب آپ کے خیال میں زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے؟

☆☆ میں فاروقی صاحب کو زیرِ بحث لانا مناسب نہیں سمجھتی۔گفتگو طویل ہو سکتی ہے اور متنازعہ بھی۔

☆ مشاہدے کی بات ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں کا آغاز اکثر پختہ و نیم پختہ رومانوی کہانیوں سے ہوا کرتا ہے۔آپ نے گھریلو ماحول کو کس بنا پر فوقیت دی؟

☆☆ یہ آپ کی عصبیت بول رہی ہے۔کن خواتین افسانہ نگاروں کی بات کر رہے ہیں آپ؟ اور کتنی خواتین کو آپ نے ان کی ابتدائی کہانیوں سے لے کر آخر تک پڑھا ہے؟ گھریلو ماحول سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا خالہ، چچی، پھوپھی کی سرگزشت، عم زاد سے عشق؟ اور شوہر کی بیوی پر زیادتیاں؟ معاف کیجیے گا اس سطح کی کہانیاں میں نے ابتدا میں بھی نہیں لکھیں۔میری ابتدا کی کہانیوں میں 'نروان' ہے جو Kleptomania پر مبنی ہے۔'وہ ایک صبح'، 'نالی کا کیڑا'، 'کالے میگھا پانی دے' ان میں سے کوئی بھی اس طرح کی گھریلو کہانی نہیں ہے جو کوئی بھی ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص 'گھریلو' کی تعریف کے تحت لائے گا۔بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ میری کہانیوں میں زیادہ پختگی آئی ہو اور ابتدائی کہانیاں اس سطح کی نہ ہوں جو بعد کی کہانیاں ہیں۔

☆ جو لوگ خواتین کی نسبت لکھے گئے آپ کے افسانوں کو یک رنگ گردانتے ہیں آپ اُنہیں کن الفاظ میں مخاطب کرنا پسند کریں گی؟

☆☆ ان سے کہوں گی ذرا غور سے پڑھیے۔پھر بات کیجیے گا اور دلائل کے ساتھ۔

☆ آپ کے افسانوں میں صنفِ نازک کے مسائل و معاملات پر اُس طرح آواز نہیں اُٹھائی جاتی جس طرح اُن کا حق ہے یا آپ کی دیگر ہم عصر اُس کی نسبت متحرک نظر آتی ہیں؟

☆☆ میں خواتین کو انسانی معاشرے سے الگ کوئی چیز یا انسانوں سے الگ کوئی مخلوق نہیں گردانتی، وہ زندگی کی بُنت میں شامل ہیں۔اگر میری ہم عصر خواتین زندگی کے کسی 'جز' کو زیادہ توجہ دے رہی ہیں تو یہ ان کا چوائس ہے۔میرے حساب سے ہر وہ انسان مظلوم ہے جس پر ظلم ہو۔پہلو خان، حافظ جنید، نریندر ڈھابولکر، گلبرگی، پنسارے کے ساتھ گوری لنکیش قتل کی گئی۔آصفہ اور نربھیا کو نہایت بہیمانہ زنا بالجبر کے بعد قتل کیا گیا۔اب بتائیے کیا صرف گوری، آصفہ اور نربھیا پر ظلم ہوئے؟ روہت ویمولا اور نجیب کی ماؤں سے پوچھئے ان کے بیٹے کہاں ہیں؟ ویسے یہ کہتی چلوں کہ یہ نام جو میں نے گنوائے یہ انفرادی مثالیں ہی نہیں یہ معاشرے کی سوچ میں آتی تبدیلی کا مظہر ہیں جو قابلِ توجہ ہے۔

☆ ہر باشعور انسان عورت کو کائنات کی حسین ترین مخلوق گردانتا ہے پھر یہ ''عورت ہونے کا زیاں'' والی بات پرانے ریکارڈ کو دہرانے والی بات نہیں؟

☆☆ کائنات کی حسین ترین مخلوق سمجھنا اور بات ہے اور قابلِ احترام و مساوات کی مستحق سمجھنا اور بات۔ہمارے یہاں ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور ہندو سمجھتے 'ماتری دیوو بھَوَ' (matri devo bhavah) کہتے ہیں یعنی ماں دیوتا سمان ہے۔پھر ماں کے ساتھ ہر گھر میں ایسا ہی سلوک ہو رہا ہے جو ان اقوال کے موافق ہو؟ آپ اپنے سوال میں چھپے تضاد کو خود محسوس کریں ذرا۔

☆ ''ایک کنبے کے گیارہ افراد کا قتل بغل کے گاؤں میں قریب چوبیس قتل، مشرق کے پورے گاؤں کا صفایا'' آپ کے افسانے یقیناً اس سماج کی دین ہیں مگر اس قدر بے رحمی سے اُن کا پردہ چاک کرنا قاری کے لیے ذہنی کوفت یا اذیت کا باعث نہیں بنتا؟

☆☆ اگر کسی افسانہ نگار کے قتل و غارت گری کے بیان سے قاری کو ذہنی کوفت ہوتی ہے تو شاید وہ گرد و پیش کے واقعات سے آنکھیں بند کر کے رہتا ہے۔افسانے بھی نہ پڑھے۔یا ڈھونڈھ کر صرف واجدہ تبسم، ابن صفی جیسے مصنفین کو تفریحِ طبع کے لیے پڑھے، لیکن ٹھہریے۔ابن صفی بھی کبھی کبھی کسی بھیانک قتل یا جرم کی عکاسی کرتے ہیں تو پھر ادب سرے سے پڑھے ہی نہیں تفریحی ہو یا ادبِ عالیہ اور ہاں ہسٹری تو کبھی نہ پڑھے۔

☆ جس رفتار سے آپ ظلم و تشدد کا پردہ چاک کر رہی ہیں معاشرے میں یہ مکروہات اُسی رفتار سے پھل اور پھول رہی ہیں؟

☆☆ آپ نے جوش کا شعر یقیناً پڑھا/ سنا ہوگا:

ایں جناب آتے رہے اور آں جناب آتے رہے
نسل انسانی مگر محروم درماں ہی رہی

بتائیے ذرا میں کیا اور میری بساط کیا کہ اصلاح معاشرہ کر سکوں۔ادیب سماج کے کوڑھ دکھاتے رہتے ہیں۔شاید۔شاید کہیں کسی دل میں انسانیت کی شمع روشن کر سکیں۔یہ 'شاید' لکھواتا رہتا ہے۔

☆ دنیا برق رفتاری سے آگے کی جانب سرپٹ دوڑے جارہی ہے اور آپ کے ہاں اُکتاہٹ کے ساتھ بندھ باندھنے کی خواہش چہ معنی دارد؟

☆☆ آپ روبرو بیٹھ کر انٹرویو لیتے تو میں آپ سے پوچھتی کہ اس سوال سے آپ کا مطلب کیا ہے اور اکتاہٹ کہاں ہے؟ افسانوں میں یا میرے مزاج میں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

☆ کچھ لوگ ماضی کی نسبت آپ کے رجحان کو ناسٹلجیا سے جوڑتے ہیں تو کچھ لوگ آپ کی سوچ کو دقیانوسی گردان کر جی کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں؟

☆☆ دیکھیے جاوید صاحب۔ حال کی جڑیں ماضی میں ہی ہوتی ہیں۔ حال کی صراحت ماضی کے بغیر ناممکن تو نہیں لیکن ادھوری رہے گی اور کچھ معاملات میں تو یقیناً ناگزیر۔ آپ دو پڑوسی ملکوں کے درمیان یہ جو بدبختانہ مخاصمت ہے اس کی جڑیں کہاں تلاش کریں گے؟ اسرائیل غریب فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ کررہا ہے اس کی جڑیں کہاں ہیں؟ رہا میری سوچ کو دقیانوسی گردانے کا سوال تو اگر کوئی انسان دوستی کو دقیانوسی گردانتا ہے تو میں اس کا کیا کرسکتی ہوں۔ میں مثبت اقدار کی علم بردار ہوں، جس کا جو جی چاہے کہے۔

☆ ایک خیال یہ بھی اکثر زیر بحث آتا ہے کہ آپ نے خود کو گھریلو اور دیہی ماحول تک محدود کرکے اپنے امکانات کسی قدر کم کرلیے ہیں؟

☆☆ نہ میں نے خود کو دیہی ماحول تک محدود رکھا ہے نہ گھریلو ماحول تک۔ اور اس 'گھریلو' والی بات کا جواب میں آپ کے کسی پچھلے سوال میں بھی دے چکی ہوں۔ اس طرح کی بات وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے میرے بہت تھوڑے سے افسانے پڑھ کر رائے قائم کرلی ہو۔ اور یوں تو قرۃ العین حیدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صرف اونچے طبقے، خصوصاً فیوڈل کلاس کی ترجمان رہیں۔ ہر مصنف زندگی کے ہر گوشے میں نہیں جھانک سکتا۔ کچھ گوشوں سے وہ زیادہ مانوس ہوتا ہے، کچھ میں اسے زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے ایک عمر گزاردینے کے بعد بہت سے ایوانوں کے دروازے کھل جائیں لیکن سب سے عہدہ برآ ہونا بھی تو ممکن نہیں۔ میں مہاشویتا دیوی اور آدی باسیوں کی مثال دے چکی ہوں۔

☆ کرداروں کا تانا بانا بھی آپ کا اختصاص مانا جاتا ہے مثال کے طور پر ''چھجو'' ''فداعلی کے کریلے اور اردو'' کوئی خاص وجہ، جواز یا سبب اس عمل کا ضرور ہونا چاہیے؟

☆☆ ہر فکشن نگار کی کچھ تخلیقات ضرور کردار اساس ہوتی ہیں۔ کیا یہ افسانے منصوبہ بند طریقے سے لکھے جاتے ہیں؟ کیا یہ کردار ذہن میں تراشے جاتے اور تخیل کی اُپج ہوتے ہیں؟ دوسروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی لیکن میں نے کچھ خیالات کا اظہار کرداروں پر ارتکاز کرکے کیا ہے اور یہ سارے کردار وہ ہیں جنھیں میں نے دیکھا ہے۔ بے شک باقی تخیل کی کشیدہ کاری ہے جیسے چھجو۔ جنھیں مخمور سعیدی مرحوم نے ویسا ہی سمجھا جیسا میں انھیں پیش کرنا چاہتی تھی۔ میں ان کے خط سے، جو انھوں نے بطور مدیر ایوان اردو لکھا تھا، چند سطریں مقتبس کررہی ہوں:

''......(کہانی) بہت پسند آئی۔ کئی جہتیں سمیٹے ہوئے ہے لیکن بین السطور سے برستے زمان و مکان کے باوجود انسانی مقدرات کے تسلسل اور ان کے مابین ایک رشتۂ وحدت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ خصوصیت سے داد طلب ہے۔ لہجے کے دھیمے پن میں کہیں کہیں آپ نے طنز کی جو تیز دھار سمودی ہے وہ اس پر مستزاد۔''

(مخمور سعیدی، 26/11)

اسی طرح فداعلی کریلے اور اردو فداعلی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ اردو کے down hill سفر کی کہانی ہے۔ جن کہانیوں کے عنوان آپ نے کردار اساس کہانیوں کے بطور پیش کیے ان میں کردار کوریئر (courier) ہیں جو کچھ حالات، واقعات، کیفیات و جذبات کو ڈھو کر قاری تک پہنچاتے ہیں۔ میری ان سے بھی زیادہ کردار اساس کہانی ہے فضلو بابا ٹُخ ٹُخ۔ اس میں فضلو بابا خالص اردو جانتے ہی نہیں، اَدھی بولتے ہیں لیکن بدایوں میں اردو کے حوالے سے فساد ہوتے ہیں تو مارے جاتے ہیں کہ اردو ان کی قوم سے جوڑی جاتی ہے۔

☆ آپ کے افسانوں میں امتیاز کا ذکر کرنے والے صرف ایک رُخ پر توجہ کیوں مرکوز کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ آپ کا یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیسا امتیاز اور کون لوگ؟ ویسے دوسروں کی فکر یا اعمال کے لیے میں جواب دہ ہوں بھی نہیں۔

☆ گزشتہ ایک صدی سے اردو ادب میں عورت کی مظلومیت کی داستان ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہے۔ اُن مَردوں کی بابت کوئی بات نہیں کرتا جو برسرِ روزگار یا صاحب حیثیت شریکِ حیات کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہورہے ہیں؟

☆☆ گزشتہ ایک صدی - آپ اس پر غور کریں۔ کیا اردو کا افسانوی ادب ایک صدی سے بہت زیادہ پرانا ہے؟ عورتوں کو پہلے تو قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ توجہ ملنی شروع ہوئی تو یوں کہ وعظ و پند کے دریا بہا دیے گئے اور ایک نہایت غیر فعال قربانی کی دیوی کا روپ پیش کیا گیا۔ پھر کہیں اس کے مسائل زیر بحث آئے اب بے شک یہ موضوع پامال ہوتا جارہا ہے۔ لیکن ٹھہریے - موضوع پامال نہیں ہے۔ اس کا ٹریٹمنٹ پامال ہے۔ اتنی جہتیں ہیں اس مسئلے کی کہ وہ کبھی سمٹے گا بھی نہیں۔ یہ افسانہ نگار کی ژرف بینی پر ہے کہ وہ کہاں سے کیا لے کر آتا ہے کہ موضوع پامال نہ محسوس ہو اور ایک نئے پہلو پر روشنی پڑے۔

محترم آپ کے اس سوال کی نوعیت ایسی ہے کہ میں اس کے جواب میں آپ سے ہی کچھ سوال کروں گی۔ کیا آپ کے خیال سے اس پر از فتنہ و شر دنیا میں مردوں کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کی بیویاں ان سے زیادہ بااختیار یا دولت مند ہونے کے سبب انھیں ستارہی ہیں؟ بلاشبہ عورت ہونے کا مطلب مظلوم ہونا نہیں ہے اور بعض عورتیں اپنے مردوں کے لیے وبال جان بن

جاتی ہیں لیکن وہ صرف بیویاں ہی نہیں ہوتیں، بیٹی، بہن، بھاوج، خالہ، چچی، پڑوسن، محبوبہ کچھ بھی ہوسکتی ہیں۔اس صورت حال کی عکاسی افسانوی ادب میں بالکل ہی نہ ہوئی ہو ایسا نہیں ہے۔جیلانی بانو کا افسانہ 'پرایا گھر' ایسے ہی موضوع کا احاطہ کرتا ہے، اور آپ کے پسندیدہ پہلو یعنی زن وشو کا تعلق ہے۔خاکسار نے بھی 'کھرنڈ' اسی موضوع پر لکھا ہے۔اب میں کتنے افسانے گنواؤں۔ایک بات بس بتاتی چلوں کہ عورت کا بااختیار یا صاحبِ ثروت ہونا بھی ضروری نہیں۔بس کڑوا مزاج اور انسانی اقدار کے تئیں بے حسی کافی ہے دوسروں کو ستانے کے لیے۔قبلہ جہاں انسانی رشتوں کا معاملہ آتا ہے وہاں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ آپ جالے ہٹاتے رہیے، مزید پیدا ہوتے جائیں گے۔صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔لکھیں۔

☆ حال ہی میں آپ کو تراجم پر ساہتیہ اکادمی کی جانب سے جو انعام ملا ہے اُس کی بابت آپ کے احساسات اور اس باب میں مستقبل کے ارادوں کے حوالے سے کچھ بتلائیے؟

☆☆ میں نے ساہتیہ اکیڈمی کے لیے ہندی/ اردو/ انگریزی میں چار ترجمے کیے ہیں۔چاروں فکشن۔انعام بحیثیت مجموعی نہیں بلکہ اکیڈمی کے ضوابط کے مطابق ایک کتاب پر ملتا ہے۔مجھے سال ۲۰۱۸ء کا ترجمے کا ایوارڈ جس کتاب پر ملا وہ ایک انعام یافتہ بنگلہ ناول 'شیش نمشکار' (مصنفہ سنتوش کمار گھوش) ہے۔مجھے بنگلہ نہیں آتی اس کے انگریزی ترجمے The Last Salute کو میں نے اردو میں 'آخری سلام' کے نام سے منتقل کیا۔ظاہر ہے کسی کاوش کے وصف کا اعتراف مصنف/ مترجم کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے لیکن اب میں نے یہ سوچا ہے کہ ترجمہ نہیں کروں گی۔بہت وقت لگتا ہے۔دماغ سوزی طبع زاد تحریر سے زیادہ ہوتی ہے۔اور اگر آپ خود فکشن نگار بھی ہیں (جیسے خاکسار) تو طبع زاد فکشن کے لیے وقت نہیں مل پاتا۔

☆ اتنا کچھ لکھنے، قاری کا وسیع حلقہ پیدا کرنے اور کافی نام کمانے کے باوجود ناقدانِ فن کی آپ کی جانب عدم توجہ کے اسباب آپ کے خیال میں کیا ہیں؟

☆☆ میں کوئی حتمی وجہ تو نہیں بتا سکتی، لیکن مجھے زیادہ شکایت بھی نہیں۔ایم سلیم رحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی، آصف فرخی، علی احمد فاطمی جیسے نقادوں نے لائق توجہ سمجھا۔ہاں ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر محمد کاظم، اسلم جمشید پوری اور فاروق ارگلی بھی ہیں۔کچھ اور نام بھی ہیں جنھوں نے مکمل مضمون تو نہیں لیکن اپنے مضامین کا ایک حصہ وقف کیا ہے۔ان میں سکندر احمد مرحوم تھے جو جوان العمری میں انتقال کر گئے۔انھوں نے میرے ابتدائی دور کے افسانے 'نروان' پر اپنے ایک مضمون میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔(سکندر سے اردو ادب کو میدان تنقید میں بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔افسوس موت نے انھیں مہلت نہیں دی۔) حقانی القاسمی صاحب نے بھی تانیثیت کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں لکھنا چاہتی ہوں اس لیے لکھتی ہوں۔نام و نمود کی حیثیت ثانوی ہے۔قارئین پسند کرتے ہیں اور پسند کرنے والے قارئین میں محمد عمر میمن (اب مرحوم و مغفور) جیسے جید عالم ہیں۔اور بھی جن قارئین سے فیڈ بیک ملتا رہا ہے وہ ذہین اور باذوق قاری ہیں۔کئی تو خود بلند پایہ ادیب/ شاعر/ مترجم/ مبصر ہیں۔میں اتنے میں خوش ہوں اور جو وقت ملتا ہے، لکھنے پڑھنے کی نذر کرتی رہتی ہوں۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں طرح طرح کی لابی اور پسند ناپسند کے ماحول نے صنفِ نازک کے لیے ادب کو کارِ دشوار بنا رکھ دیا ہے؟

☆☆ اس طرح کی لابیاں (Lobbies) اور پسند ناپسند صرف صنف نازک کے لیے ہی کیوں دشواریاں کھڑی کریں گی۔یہ مرد مصنفین کی راہ میں بھی حائل ہوسکتی ہیں۔ویسے میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ادب کے میدان میں خواتین کی موجودگی بہت نمایاں ہے اور معتبر بھی۔کچھ دشواریاں ہوسکتی ہیں لیکن وہ ہر شعبۂ حیات میں ہیں۔لگن اور دیانت داری ان پر قابو پاسکتی ہے، کام کوئی بھی ہو۔

☆ اردو شاعری میں متشاعروں کا ذکر بڑی شدّ و مد سے کیا جاتا ہے مگر وہ نہ صرف اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں بلکہ روز بروز اُن کی تعداد میں اضافہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔اردو نثر میں بے بصیرت اور ناخالق لوگوں کی بابت آواز بلند کیوں نہیں کی جاتی؟

☆☆ دنیا میں جو کوبڑ ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔لیکن صرف باذوق، ذی علم افراد کی نظر میں۔شاعروں، بے چاروں کو خوش ہو لینے دیجیے اور ان لوگوں کو بھی جو انھیں سراہتے ہیں۔یہ بھی entertainment industry ہے۔کیا کیجیے گا۔

☆ حسن عسکری صاحب کا گلہ آپ کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا "تقسیم ہند کے حوالے سے بہت سے لوگوں نے لکھا مگر ایک ہی طرح کا" مذکورہ بالا رائے ایک لاٹھی سے ہانکنے والے محاورے کی زد میں نہیں آتی نیز فاروقی صاحب تو اس حوالے سے یہاں تک کہہ گئے کہ اکثر فن پارے ففٹی ففٹی یعنی پانچ ہندو مارے تو بعد میں پانچ مسلمان قتل کرا کر حساب برابر کر دیا؟

☆☆ آپ کے یہ دو سوال دراصل ایک سوال کے دو حصے ہیں اس لیے میں نے انھیں ساتھ میں لے لیا۔انھیں آپ نے جناب فاروقی کے مضمون سے اخذ کیا ہے۔دراصل سوال نمبر 26 بھی حسن عسکری صاحب کا بیان ہے۔میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ تقسیم کے متعلق جو بھی لکھا گیا اس میں یکسانیت ہے۔تقسیم ہند اپنی صدی کے دس بڑی المیوں میں سے ایک ہے۔اس کے اسباب آج تک متعین نہ ہوسکے۔اس کے اتنے زیادہ اور پیچیدہ پہلو ہیں کہ آج بھی لوگ اسے تھیم بنا رہے ہیں اور کہیں باسی پن نہیں آیا۔میں پھر یہ دوہراؤں گی کہ آپ کے کام کی خوبی (quality) کسی نئے پہلو کو گرفت میں لینے اور پھر اس کو

برتنے کے اسلوب پر منحصر ہوگی۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے رتن سنگھ کا ایک مختصر افسانہ پڑھا تھا، 'پانی میں لگی آگ' اور اب ایک ناول پڑھ رہی ہوں (ہندی میں) 'باجے والی گلی'۔ یہ ایک معروف ادیب راج کمار کیسوانی لکھ رہے ہیں جنھوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان آنے والے سندھیوں کو موضوع بنایا ہے۔ بے حد موثر ناول ہے جس کے اسلوب میں تازگی اور نیا پن ہے۔ یہ قسطوں میں ہندی رسالے پہل میں شائع ہو رہا ہے۔

جناب حسن عسکری بڑے دانش ور اور ذی علم انسان تھے، لیکن میں ان سے اختلاف کی جسارت کر رہی ہوں۔ دوسری یہ ففٹی ففٹی والی بات کافی حد تک صحیح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے مسلمان ادیبوں میں اخلاقی جرأت کم ہے۔ گرچہ فرقہ وارانہ فسادات میں اقلیتیں بری طرح نقصان اٹھاتی ہیں لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت کی عکاسی کر پاتے ہیں۔ اور اب جو صورت حال ہے اس میں تو وطن دشمنی کا ٹھپہ لگنا اور آسان اور خوف ناک ہو گیا ہے۔ ہمارے ہندی ادیب بہت بہتر ہیں۔ ان میں اخلاقی جرأت بوجہ زیادہ ہے۔

☆ ہنری جیمس کے بقول کہانی سنانے کا نہیں دکھانے کا فن ہے۔ آپ اس عمل یا رائے سے کس حد تک متفق ہیں اور اپنی کہانیوں کا رنگ روپ کس چیز کو سامنے رکھ کر بناتی سنوارتی ہیں؟

☆☆ ہنری جیمس کا مطلب یہ ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہونا چاہیے گویا وہ واقعات و مناظر کے بہاؤ میں شریک ہے۔ افسانے میں یہ کیفیت مصنف کی دیانت داری، حساسیت (sensitivity) اور کرداروں کے تئیں گہری ہمدردی (بغیر میلو ڈراما) سے پیدا ہوتی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ پر دسترس بھی شرط ہے۔ الطاف فاطمہ مرحومہ نے یہی تو لکھا کہ انھیں محسوس ہوا کہ وہ خود بنواری کے ہوٹلوا پہ بیٹھی کھٹی چٹنی میں پکوڑے ڈبو ڈبو کر کھا رہی ہیں۔ ابھی حال میں میں نے ایک افسانہ مدیر اثبات کی فرمائش پر انھیں بھیجا جس کا عنوان ہے 'دیا باتی کی بیلا'۔ ان کا جواب آیا ''افسانہ ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ افسانے کی زبان کی برجستگی اور تصنع سے پاک اسلوب کے علاوہ آپ ہمیشہ ہمیں افسانے کے کرداروں کے ساتھ اس کے محل وقوع میں گھسیٹ لیتی ہیں.....'' غالباً افسانہ دکھانے کی چیز اسی لیے کہا۔ ویسے بھی ہنری جیمس سے اختلاف کی گنجائش تقریباً نہیں ہے۔

☆ افلاطون نے ڈراما یا شاعری میں غیر حقیقی باتوں کے در آنے کا جو ذکر کیا ہے اردو افسانہ کس حد تک اُس کی زد میں آتا ہے؟

☆☆ خاموشی۔۔۔!

☆ الطاف آپا نے آپ کے اندازِ بیان کو رجب علی سُرور اور میر امّن کے مشابہہ گردان کر حقیقت بیان کی ہے یا حقِ دوستی؟

☆☆ آپ کے اس سوال پر مجھے بہت غصہ آیا ہے۔ نہ میں الطاف فاطمہ کو جانتی تھی، نہ وہ مجھے۔ ان کے خط سے یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ انھوں نے پہلی بار میری کوئی کہانی پڑھی ہے۔ پسند آنے پر انھوں نے تعریف کر دی تو دوستی کا پہلو کہاں سے آ گیا۔ شاید آپ دوستی کا پہلو ہر اس آرٹیکل، ہر اس توصیفی کلمے میں ڈھونڈیں گے جو کسی نے میرے لیے کہا ہے۔ میں آپ کو 'چہارسُو' (جو رینو بہل صاحبہ کی معرفت میرے پاس آیا اور آپ کے گوشہ نکالنے کی تجویز بھی) دیکھنے سے پہلے قطعی نہیں جانتی تھی۔ اور اب بھی صرف ایک مدیر اور مصنف کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ ذاتی طور پر بالکل نہیں۔ تو آپ کس دوستی کے تحت گوشہ نکال رہے ہیں؟ الطاف فاطمہ تو ان کا خط جو انھوں نے بستر علالت سے 'دنیازاد' کے لیے رقم کیا، میرے لیے باعث صد افتخار ہے۔ چہارسو کے گوشے سے کہیں زیادہ۔ امید ہے آپ ان سطور کو حذف نہیں کریں گے۔

☆ ڈاکٹر آصف فرخی آپ کے ہاں چیخوف، ولیم بڑیور اور ایلس منرو کی تلاش میں کس حد تک کامیاب رہے؟

☆☆ ''آصف فرخی کا کہنا ہے کہ وہ ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں چیخوف اور ایلس منرو کو ڈھونڈنے چلے تھے لیکن ذکیہ مشہدی کو تلاش کرنے میں کامیاب رہے۔'' (یعنی ان کے منفرد اسلوب کے)

☆ اس سب کے باوجود فرخی صاحب کو آپ کی کہانیاں آدھی ادھوری کیوں لگتی ہیں؟

☆☆ ''کہانیاں اس لیے آدھی ادھوری لگتی ہیں کہ زندگی بھی آدھی ادھوری کہانی ہے جو صرف موت پر مکمل ہو سکتی ہے۔''

☆ پروفیسر علی فاطمی کو یہ سوال اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ افسانوں اور فن پاروں کا کام قاری کو رُلانا ہے یا کچھ اور؟

☆☆ جس مجموعے (صدائے بازگشت) پر فاطمی صاحب نے مضمون لکھا، اس کا نام میں نے ''دیکھ کبیرا رویا'' تجویز کیا تھا جو بعد میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے اسی وجہ سے پوچھا لیکن پھر اپنے مضمون میں اس حوالے سے خود ہی کچھ جواب بھی دیے۔

☆ ہر آدمی بالخصوص تخلیق کار کا کوئی نظریہ، فکر اور فلاسفی ضرور ہوتی ہے۔ آپ کمیونسٹ ہیں نا سوشلسٹ، ترقی پسند ہیں نا جنوادی، فیمنزم سے آپ کا تعلق ہے نہ دریدہ سے آپ کو لگاؤ، پھر آپ کا نظریہ تخلیق کیا ہے؟

☆☆ میں اپنے دَور یا اپنے دَور سے کچھ ہی قبل چلنے والی تحریکوں یا خیالات (یوں کہیے اِزم) سے قطعی بے بہرہ ہوں یا انھوں نے مجھے چھوا ہی نہ ہو ایسا نہیں ہے، نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی پڑھا لکھا، گرد و پیش سے دلچسپی رکھنے والا انسان، زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ مکاتبِ فکر سے بالکل بے گانہ رہے۔ میرے ساتھ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں نے کسی 'اِزم' کو بطور پروپیگنڈا استعمال نہیں کیا، نہ کسی مخصوص مکتبِ خیال کو فروغ دینے کے ارادے سے لکھا۔ میرا موقف انسان دوستی ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سماج میں مکمل مساوات قائم ہو جائے اور عقائد یا رنگ و نسل کو لے کر اختلافات نہ ہوں لیکن یہ تو ضرور ہو سکتا ہے کہ یہ خلیجیں بہت گہری نہ ہوں اور اختلافات کو خون سے نہ رنگا جائے۔ اس موقف کو، دل کے اس

درد کو آپ جس نظریہ کا نام دیں، جو ازم سمجھیں وہی میرا نظریۂ تخلیق ہے۔ ویسے میں آپ کے اس مفروضے سے اتفاق نہیں کرتی کہ ہر تخلیق کار کا کوئی نظریۂ فکر اور فلسفہ ضرور ہوتا ہے۔(خاص طور پر اردو کے حوالے سے)۔

☆ یہ رائے بہت تکلیف دہ ہے کہ اردو والوں نے باہمی یگانت کو خیر باد کہہ دیا ہے اوّل آپ کے خیالات دوئم اثرات کی بابت جاننا ضروری ہے؟

☆☆ خاموشی۔۔۔!

☆ اس بیگانگی اور لاتعلقی کے ردِعمل میں جو ادب تخلیق ہوگا اُس کا مزاج اور مواد کس قدر اعتبار کا حامل گردانا جاسکتا ہے؟

☆☆ خاموشی۔۔۔!

☆ اگر اس سوال کو ہم اردو زبان و ادب کے مستقبل بلخصوص ہندوستان کے موجودہ سیاسی، سماجی، ثقافتی حالات سے جوڑ کر آپ کے سامنے پیش کریں تو منطقی جواب کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ یہ تینوں سوال باہم مربوط ہیں اور تینوں ہی میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کیا آپ کے خیال سے ادیبوں کو ایک متحدہ انجمن بنا لینی چاہیے اور پھر اتفاق رائے سے لکھنا چاہیے؟ ان کے موضوعات اس تنظیم کے سربراہان کے ذریعے طے پانے چاہئیں؟ اسلوب ان کے ذریعے پہلے تسلیم کرالینا چاہیے؟ کیا سب مل کر سسٹم کے خلاف فعال تحریک چھیڑیں؟ اس طرح کی یگانگت تو ممکن نہیں ہے ہاں انفرادی طور پر ادیب ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ اردو کا تعلق اقلیت سے ہے۔ اس وقت اقلیت کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے اس لیے احتجاج میں زور ذرا کم نظر آتا ہے۔

☆ بین المذاہب شادیوں کی نسبت آپ کی تشویش میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ بدلتے عالمی اور علاقائی ماحول میں اس مسئلے کو کس طور حل کیا جاسکتا ہے؟

☆☆ قبلہ ذرا میری تحریریں توجہ دے کر خود پڑھ لیجیے۔ مجھے بین المذاہب شادیوں سے کوئی تشویش نہیں ہے۔ یہ شادیاں اس وقت سے چلی آرہی ہیں جب مسلمانوں نے برصغیر کی سرزمین پر مالابار کے علاقے میں بطور تاجر قدم رکھے تھے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں بطور فاتح قدم رکھے۔ اس سے ایک مقامی خاتون لادی کے عشق کی داستانیں مشہور ہیں۔ ہمارے محترم امیر خسرو (جو آپ کے بھی محترم ہیں) کی ننہال ہندو تھی اور ہندو رہی۔ اکبر کے وقت سے مغل شاہی خاندان میں مقامی ہندو خون شامل ہوا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے جسے ہندو مخالف کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے ایک ہندو خاتون سے شادی کی تھی۔ آج تو سماجی قربت (باوجود منافرت میں اضافے کے) بہت بڑھی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں بے محابا ملتے ہیں۔ آپ دو عاقل و بالغ انسانوں کو کوئی رشتہ بنانے سے نہیں روک سکتے بھلے ہی غیرت کے نام پر قتل کیوں نہ کرتے رہیں جو صرف بین المذاہب شادیوں کے لیے ہی نہیں ہوتے بلکہ قبیلوں، ذات اور کنبہ جاتی مخاصمت کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے کن کہانیوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے بین المذاہب شادیوں سے تشویش ہے مجھے تو تشویش ہے اپنے یہاں بھنوری بائی اور آپ کے یہاں کی مختاران مائی کو گینگ ریپ کی سزا دیے جانے جیسے واقعات سے۔

بہر کیف جن لوگوں کو مذہب/ کنبے/ ذات/ قبیلے سے باہر کی شادیوں پر اعتراض ہے وہ شروع سے ہی اپنے بچوں کو قابو میں رکھیں۔ یا پھر ایک ظلم کریں کہ بچپن میں شادی کریں۔ اب اگر شادی کی رسی بھی تڑالی تو پھر تو کچھ کہا ہی نہیں جاسکے گا۔ بہر کیف میں اس سلسلے میں کوئی لائحۂ عمل نہیں پیش کرسکتی۔

☆ آپ سمیت جب اردو والے عظمت رفتہ کا نوحہ پڑھتے ہیں تو لامحالہ قاری کے ذہن میں یہ سوال سر اُبھارتا ہے کہ کون سی عظمتِ رفتہ عرب، ترک ، ایران، افغانستان یا کوئی اور؟

☆☆ دوسروں سے مجھے مطلب نہیں لیکن میں نے عظمت رفتہ کا نوحہ کب اور کہاں پڑھا؟ اب بغیر حوالہ دیے بیان پر بیان دیے جارہے ہیں اور ان بیانات کو سوال بنا کر پیش کررہے ہیں۔ میں نے حال کو ماضی سے جوڑا ضرور ہے۔ ہدّو کا ہاتھی۔ بوئے سلطانی اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن ان میں ماضی کا نوحہ نہیں ہے بلکہ پدرم سلطان بود بھلا کر جس حال میں ہم جی رہے ہیں اس سے ایڈجسٹ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ باقی اور لوگ ماضی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں تو وہ جانیں لیکن عرب ترک ایران اور افغانستان کہاں سے آگئے۔ کم از کم برصغیر کے مسلمانوں کا ماضی تو وہ ہے جو ہندوستان کا ماضی ہے۔ اس میں ہڑپا اور موہن جوڈارو بھی شامل ہیں اور سنٹرل ایشین اقتدار کی آمد بھی۔ اور ان دونوں کے درمیان بہت کچھ ہے۔

☆ اردو دنیا کی ہلچل میں ڈالر، پونڈ، یورو، دینار، درہم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر وہاں کے اہلِ قلم ہمارے اور آپ کے حالات سے نہ صرف لاتعلق بلکہ نئی طرح کی زبان، ثقافت اور اُدب تخلیق کر کے اپنی نئی نسل سے قطعی طور پر بے گانہ ہیں جو ان سب چیزوں سے لاتعلق بھی ہے اور اجنبی بھی؟

☆☆ یہاں آپ کا سوال کیا؟ اس اسٹیٹمنٹ پر سوالیہ نشان لگانے کے بعد بھی یہ سوال نہیں بن سکا۔ آپ سوال کی وضاحت کریں۔

☆ بظاہر پوری انسانیت مظلوم اور بیمار ہو چکی ہے۔ تیسری دنیا بلخصوص اردو والے اس حوالے سے کس طرح کی خدمات انجام دے رہے ہیں یا دے سکتے ہیں؟

☆☆ پیارے چھوٹے بھائی، اتنا مبالغہ نہ کریں، پوری انسانیت نہ آج بیمار اور مظلوم ہے نہ پہلے کبھی تھی۔ ہاں اس کا ایک سیکشن کہیں نہ کہیں بیمار و مظلوم ہمیشہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ بڑے بڑے بین الاقوامی مسائل جنھوں نے دنیا کے کئی ملکوں میں تباہی مچا رکھی ہے ادیبوں کے ذریعے حل کر لیے جائیں یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں ادیب اپنی آواز بلند کر کے ان لوگوں کی توجہ ضرور مبذول کرا سکتے ہیں جن کے ہاتھ میں مسائل کو حل کرنے کی تھوڑی بہت قوت ہے۔ اردو ادیب بھی بلاشبہ ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کرا رہے ہیں شرط یہ ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی کوئی سنے بھی تو۔

انگوٹھی

ذکیہ مشہدی

اس غریب برہمن کسان کے گھر پکھراج کی وہ قیمتی انگوٹھی کہاں سے آئی یہ بھی دراصل ایک داستان ہی تھی۔ وہ غریب کسان دراصل اتنا غریب بھی نہ ہوتا اگر وہ چمپارن میں نہ ہوتا اور نیل کی کاشت کرانے والے نیلہے صاحبوں نے اسے محتاجی کی لگار پر نہ لاکھڑا کیا ہوتا۔ زمین تو اس کے پاس اچھی خاصی تھیں لیکن نیل کی جبری کاشت اور اس کاشت کی وجہ سے باقی زمینوں کی زرخیزی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ تقریباً تباہ ہو گیا تھا۔

کسان کے پردادا یا شاید لکڑ دادا گاؤں کے پروہت تھے۔ جگمانی سے کچھ زمینیں مل گئی تھیں اور وہ کھیتی کرنے لگے تھے۔ برہموں نے تو چھتری دھرم تک نبھایا ہے پھر کھیتی کسانی تو ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی تھی۔ رشیوں منیوں تک کے پاس کھیت ہوا کرتے تھے۔ ایک زمیندار نے بڑی خوبصورت، تنومند گائے دان کی تھی۔ وہ بھی بندھی ہوئی تھی اور بیانے کے بعد اچھا دودھ دے رہی تھی۔ تبھی ان کے دروازے پر وہ زخمی مغل سردار اپنی ہی طرح کے بھوکے پیاسے، زخمی گھوڑے پر سوار آن کر گر پڑا تھا۔ بزرگ برہمن نے اسے اٹھایا۔ گھوڑے کو گائے کے بتھان کے پیچھے آم اور کیلے کے جھنڈ میں چھپا دیا۔ دھان کے کوٹھار میں ان دنوں بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ وہاں کتھری بچھا کر مغل بچے کو رکھا اور گاؤں کے وید کو بلایا۔ بزرگ پنڈتائن نے معترض لہجے میں کہا ''ترک ہے۔''

''انسان ہے'' پنڈت جی نے مختصر سا جواب دیا اور مٹی کے کلھڑ میں گیّا کا دودھ لے کر کلھڑ اس کے مونہہ سے لگایا۔ وید جی بھی برہمن تھے اور زیادہ تر ویدا چاریہ برہمن ہی ہوا کرتے تھے۔ دونوں نے آپس میں صلاح کی کہ اس کی خبر کسی کو نہیں لگنی چاہئے ورنہ اس مغل سپاہی کے ساتھ وہ سب بھی مع زن و بچہ مارے جائیں گے۔ اٹھارہ سو ستاون کے زلزلے کی لہریں پوری طرح بیٹھی نہیں تھیں۔ اب بھی لوگ مارے جا رہے تھے، جائدادیں قرق ہو رہی تھیں۔

بھوسے دانے کے باوجود گھوڑا تیسرے دن مر گیا۔

سردار نے کہا ''بابا کوئی بات نہیں۔ اب ہم کون سا گھوڑے پر بیٹھ کر کہیں تیر تفنگ چلانے جا رہے ہیں۔ ہمارے بادشاہ جلا وطن کر دیے گئے۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر طشت پر پیش کئے گئے۔ ہمارے جورو بچوں کی کون ہے۔ اب ہمارا گھوڑا تک مر گیا۔ ہم بھی مر جائیں گے۔ آپ کے یہاں کا پاکیزہ آب و دوانہ قسمت میں لکھا تھا، جتنے دن کھالیں۔''

آٹھویں دن وید جی نے کہا، انہیں کچھ اچھا کھانا کھلا دو۔ برہمن میتھل تھا۔ قرض دام کر کے اس نے مچھلی پکوائی اور پوریاں اور باریک سفید باسمتی کا بھات۔ گھر کا نہایت عمدہ خشک دہی کہ انگوچھے میں باندھ کے لے چلو تو پانی نہ ٹپکے، اور گھی اور گڑ۔ کیلے کے پتّل پر یہ سارا کھانا پروسا گیا۔

کھانا کھا کے سردار پوری طرح اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ زن و بچہ مارا گیا۔ گھر گوروں نے لُوٹ لیا۔ بس یہ انگوٹھی ہے۔'' اس نے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت سے سونے کی موٹی سی انگوٹھی اتاری جس میں بڑا سا پکھراج جگمگا رہا تھا۔ دونوں کونوں پر دو ننھے ہیرے اور تھے۔ ''یہ ہماری زوجہ کی سخت محنت اور محبت دونوں کی نشانی ہے۔ وہ جانہار زری کا کام نہایت عمدہ بناتی تھی۔ دن کو گھر کے سارے کام نمٹاتی، چھوٹوں کو پالتی، بڑوں کی خدمت کرتی اور رات کو چراغ کی روشنی میں مخمل کے ٹکڑوں پر پھول پتے، چاند تارے یوں بناتی کہ دیکھنے والے کی سمجھ میں فوری طور پر یہ نہ آتا کہ یہ کشیدہ کئے گئے ہیں یا چھاپے گئے ہیں۔ بدخشاں سے آکے جواہرات کے ایک سوداگر نے تین سو کشیدہ کئے ہوئے مخملی ٹکڑوں کے بدلے یہ انگوٹھی دی تھی جو اس عفیفہ نے اس لئے قبول کی کہ سوداگر نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ پتھر ہماری حفاظت کرے گا۔ وہ اس نے ہماری انگلی میں پہنائی اب اسے آپ رکھ لیجئے۔''

بزرگ پنڈت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہم نے کسی بدلے کی نیت سے سیوا نہیں کی۔ ہم کچھ نہیں لیں گے۔'' وہ ہنسا۔ ''تب کس کو دیں گے آپ؟ ہمارا اور کون وارث ہے؟ گھوڑے کی زین اور لگام کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ وہ بیچ کر وید جی کا پیسہ چکا دیجئے گا۔''

''رام رام رام۔ وید جی گاؤں میں کسی سے بھی پیسہ نہیں لیتے۔''

''نہ لیں۔ بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے بیاہ کے وقت دے دیجئے گا۔ ہمارے طرف سے تحفہ ہوگا۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

''جلدی پتہ لگ جائے گا کیوں کر رہے ہیں۔'' اس نے انگوٹھی زبردستی مٹھی میں پکڑا دی۔ بس یوں سمجھ لیجئے ہم آپ کے پاس رکھ رہے ہیں۔ جی بچ گئے تو واپس کر دیجئے گا۔ اس سے گھوڑا خرید لیں گے اور چل دیں گے۔ مر گئے تو آپ کی۔'' بزرگ برہمن نے آبدیدہ ہو کر انگوٹھی رکھ لی۔

دوسرے دن علی الصبح سردار نے اپنے چاروں طرف پھلوں کے باغات دیکھے۔ سردے اور سرخ انار اور انگور اور خوبانیاں اور سونے کے طشت اور چاندی کے ظروف میں بہترین شراب جسے شفتالو کے درختوں کے نیچے بادام جیسی آنکھوں والی حسینائیں رقص کرتے ہوئے پیش کر رہی تھیں اور ان سب کے درمیان کیلے کے پتّل پر سوکھا دہی اور گڑ اور گھی پروسا ہوا تھا (دہی جسے انگوچھے میں باندھ کر لے جایا جائے تو ایک بوند پانی نہ ٹپکے) اور ساتھ میں بھنی ہوئی مچھلی اور پھولی ہوئی سنہریاں پوریاں۔

دہی مچھلی کی صدائیں سنتے، دل میں کلمہ طیبہ دوہراتے اس مغل سپاہی

نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔ بزرگ برہمن نے گاؤں کی مسجد کے پیش امام کو بلایا جواس سے بھی زیادہ بوڑھے تھے۔ان کی بھویں اور پلکیں تک سفید ہوگئی تھیں۔وہ زیادہ تر روزے سے رہا کرتے تھے۔بھوسہ گھر سے رات کے کسی پہر بھوسہ ہٹا کر وہاں قبر کھودی گئی۔امام صاحب نے نماز پڑھائی اور سپاہی کو شہید قرار دے کر انہیں کپڑوں میں بغیر غسل دیے دفن کر دیا گیا۔

ترک کی کبر ہمارے بتھان میں؟ پنڈ تائن نے کہا۔

''سوتنتر تا سینانی کی وشرام استھلی ہے، تُرک کی کبرؔ نہیں۔'' گھر کے بزرگ نے سختی سے کہا اور وہاں روز رات کو چالیس دن دیا جلوایا۔ پنڈ تائن شوہر سے انحراف کرنا نہیں جانتی تھیں۔خود دیا جلا کر آیا کرتی تھیں۔(ایک لمبے عرصے کے بعد کستور بائی نے بھی شوہر کے حُکم پر سر جھکا کر ہریجن مہمانوں کو گھر میں جگہ دی۔گھر کے سنڈاس خود صاف کئے)۔

بزرگ پنڈت نے انگوٹھی دھان کی بھوسی کے بیچ ڈال کر اسے ایک چھوٹی سی ٹین کی بکسیا میں رکھا اور کچے گھر کے ایک کونے میں گاڑ کر بڑے بیٹے سے کہا، یہ مغل سینانی کی امانت ہے۔اگلے بیس برس میں شاید اس کی آل اولاد میں کوئی آ نکلے۔کوئی نہیں جانتا وِدھاتا کیا رچتا رہتا ہے۔سو کوئی آجائے تو اطمینان کر کے اسے دیدینا۔بیس برس تک کوئی نہ آیا تبھی تم کو اس پر ادھیکار ملے گا۔لیکن یاد رکھنا اسے مصیبت کے وقت ہی استعمال کرنا۔جیسے ہم اس ویر کے کام آئے وہ ہمارے کام آئے گا۔عام دونوں میں ویسے بھی اتنی قیمتی انگوٹھی ہم غریب برہمنوں کی انگلی میں شوبھا نہیں دے گی۔دس سوال اٹھیں گے۔ بزرگ برہمن نے لمبی عمر پائی۔ پھر لوگوں اور گایوں کی خدمت کرتے ہوئے سورگ سدھارے۔ ملک ان کے سامنے غلام ہی تھا۔اٹھارہ سوستاون کے بعد انگریز زیادہ مضبوط اور زیادہ سفاک ہو گئے تھے۔غریب برہمن کسان کا کنبہ اور زیادہ غریب ہو گیا تھا۔گائے مرگئی تو دوسری گائے بھی نہ خرید سکا۔کھیتی کے لئے بیل چاہئیں تھے کنبے کے نئے سربراہ نے مہاجن سے قرض لیا کہ کم از کم ایک بیل خرید سکے اور بیٹی کی شادی بھی کرے مہاجن نے کہا کہ وہ اتنا پیسہ بغیر کوئی چیز گروی رکھے نہیں دے سکتا۔تب بزرگ برہمن کے پر پوتے نے جو پڑوس کے گاؤں میں بیٹی کا رشتہ ٹھیک کر آیا تھا، مٹی کھود کر وہ انگوٹھی نکالی اور دل ہی دل میں ترک سپاہی کو پرنام کر کے اسے مہاجن کے پاس گروی رکھ دیا۔

انگوٹھی کا نگینہ دیکھ کر ساہوکار کے موںہہ میں پانی بھر آیا۔ اسے لوٹانا نہیں ہے، سوچ کر اس نے اسے شہر لے جا کر جوہری کو دکھایا تو یہ ارادہ اور پختہ ہو گیا۔سُود کا جال کچھ اس طرح جکڑا گیا کہ غریب برہمن کی اگلی چار پانچ نسلیں بھی اس سے آزاد نہ ہو سکیں۔انگوٹھی مہاجن کے پر پوتے کی انگلی میں لو دینے لگی۔ کچھ اور وقت گذرنے کے بعد ہل بیل زمین سب مہاجن کے خاندان کے قبضے میں آگئے۔ برہمن کسان کھیت مجوری کرنے لگا۔

پھر ملک آزاد ہوا اور دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

مہاجن خاندان میں انگوٹھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔اصول کے مطابق وہ بڑے بیٹے کو ملتی تھی۔اب کے بڑے بیٹے نے بیٹی کی شادی طے کرنے کے لئے سمدھیانے میں قدم رکھے تو سمدھی کی نظر انگوٹھی پر ٹکی رہ گئی۔ایسی انگوٹھی راجے مہاراجوں کے پاس ہوتی ہے۔شاطر آنکھوں نے سوچا۔سکھایا پڑھایا لڑکا شادی کے بعد سسرال کے آنگن میں کلیوا پر بیٹھا تو اس نے انگوٹھی کی ضِد پکڑ لی۔ ایک انگوٹھی ہی تو ہے۔کون سا محل دو محلّہ مانگ رہے ہیں سسر نے انگوٹھی اتار کر دے دی۔ پڑھا لکھا داماد تھا گریجویشن کر رہا تھا اور آگے وکالت پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔لڑکی جاہل تھی اور شکل صورت کی بھی دب تھی۔ بھاری رقم اور لوگوں کی ہڑپی ہوئی زمینوں میں سے ایک بڑے پلاٹ پر معاملہ طے ہوا تھا۔اب کلیوا پر بیٹھے لڑکے کی فرمائش کو کیسے ٹھکرایا جاتا۔ساہوکار خوب سمجھتا تھا کہ سماج میں سودی کاروبار کرنے والوں کی اتنی عزت نہیں ہے جتنا پیسہ ہے۔شان شوکت کے لئے ایک آدھ وکیل،افسر،ڈاکٹر کا کنبے میں آنا ضروری ہے۔

انگوٹھی وکیل بننے والے داماد کی انگلی میں جگمگانے لگی۔

وکیل صاحب چمپارن میں کوئی لاء کالج نہ ہونے کے سبب پٹنہ سے وکالت پڑھ کے آنے کے بعد کچھ دن گاؤں والوں کے مقدمے لڑتے رہے پھر پٹنہ مستقل طور پر منتقل ہوگئے۔ ہاں زمینیں ادھر سستی ہونے کے سبب بتیا کے آبائی گاؤں میں خریدیں یا پھر تپاہی میں کہ وہاں ننہال تھا۔نہایت گھاگھ وکیل ثابت ہوئے تھے اور گھاگھ تھے اس لئے کامیاب بھی ہوئے۔لوگوں کو ٹھگنے میں اپنے مہاجن سسر سے کم نہیں تھے۔ایک بڑے راجپوت گھرانے کے ولی عہد بہادر نے ایک دلت لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔دلتوں کو گاندھی بابا خاصہ سر چڑھا گئے تھے اس لئے انہوں نے ایف آئی آر درج کرادی اور مقابلے پر اتر آئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب کے کچھ سیاسی ارادے بھی تھے اس لئے اور زیادہ خم ٹھوک کر میدان میں اترے۔ مقدمہ انہیں وکیل صاحب نے لڑا اور ریپ کو اس صفائی کے ساتھ اپوزیشن کے سر منڈھ کر لڑکے کو ایسا بے داغ چھڑایا کہ دھوم مچ گئی۔خود جج سمجھ رہا تھا کہ لڑکا قصور وار ہے لیکن شہادتوں کی فراہمی اور عدم فراہمی دونوں نے مجبور کر دیا کہ لڑکے کو با عزت بری کر دیا جائے۔ وکیل صاحب کے بینک بیلنس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور شہرت میں بھی پھر وہ لڑکی کہاں گئی، زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا کچھ پتہ نہ چلا۔

وکیل صاحب ایک عرصۂ دراز کے بعد اپنی ننہال پتاہی آئے۔کسی ماموں کی پوتی کی شادی تھی۔اب وہ خود تقریباً ادھیڑ عمر تھے اور ایک بیٹا۔ بیٹی بیاہ چکے تھے۔

پرانی یادیں تازہ کرتے، گاؤں میں گھومتے پھرتے ان کی ملاقات ایک پھٹے حال شخص سے ہوئی۔دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔

''ارے بنواری ہو کیا؟'' وکیل صاحب نے خوش دلی سے سوال کیا

''وکیل بابو؟'' جواب میں بھی سوال کیا گیا

دونوں لپک کر آگے بڑھے لیکن اپنے اپنے حلیے بشرے کا احساس کر کے بغلگیر ہونے سے ذرا پہلے رُک گئے۔ بچپن میں جب وکیل صاحب

نانہال آتے تو بنواری کے ساتھ فٹ بال، گلّی ڈنڈا، کبڈی سارے وہ کھیل کھیلتے جو کم عمر لڑکے کھیلا کرتے ہیں۔

''کیسے ہو بنواری؟'' انہوں نے خلوص سے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں بابو۔ دیا ہے بابو لوگوں کی۔''

''بال بچے کتنے ہیں، کہاں ہیں، اور یہ تم ہمارے سنگی ساتھی ہم سے اتنے زیادہ بوڑھے کیسے دِکھ رہے ہو؟''

''آپ؟ آپ ابھی کہاں بوڑھے ہوئے اور وکیل بابو ہم تنک جلدی میں ہیں۔ وہیں آجایئے نا ہوٹلوا پہ۔ اُو سرکاری اسکولوا کے پاس۔ برگدوا ہے نا۔ وہی کے نیچے۔''

''ارے تم نے ہوٹل کھول لیا ہے بنواری؟'' بنواری لپک جھپک آگے بڑھ چکے تھے۔ پیچھے پلٹ کر مسکرائے۔

پاس سے گذرتے رادھا سوامی اوجھا سے وکیل صاحب نے سوال کیا۔ ''ارے یہ بنواری اس نے ہوٹل کب کھولا۔ چائے خانہ ہوگا۔'' اوجھا جی زور سے ہنسے۔ ''جایئے، جایئے نا۔ پکوان کھا کے آیئے گا۔''

یہ بنواری بھی گاؤں کا ایک نہایت اہم فیچر تھے۔ ان کے بغیر پتاہی پتاہی نہ رہتا۔ کوئی پوچھتا کہ وہ کیا کرتے ہیں تو بڑے فخر سے بتاتے کہ ہوٹل چلاتے ہیں۔ لپک جھپک کہیں چلے جا رہے ہوں اور کوئی بات کرنے کو روکتا تو کہتے، وہیں آجاؤ بھیا، وہیں ہوٹلوا پہ۔ بیٹھ کے آرام سے بتیانا۔ اور واقعی وہ آجاتا تو اپنے نیچے کے چار کمّوں میں سے دو کھینچ کر اسے دے دیتے۔ ہوٹل کا کُل اثاثہ ایک انگیٹھی، بنواری کی صورت سے میچ کرتی سیاہ رنگ کی بڑی سی کڑھائی، اس میں ویسی ہی رنگت کے ابلتے ہوئے تیل، المونیم کی پرات میں خوب پیاز اور ہری مرچیں ڈال کر سانے ہوئے بیسن اور ایک بڑے سے ٹیڑھے میڑھے المونیم کے کٹورے میں تیتّے کی طرح ڈنک مارنے والی ہرے دھنیے کی کھٹی چٹنی پر مشتمل تھا۔ وہ سڑک کے کنارے پلیا کے پاس یہ سارا سامان رکھ لیتے اور بندر کی طرح اچک کر کمّوں پر بیٹھ جاتے۔ ایک طرف تھوڑی سی دوری پر سرکاری اسکول تھا اور مخالف سمت لگ بھگ اتنے ہی فاصلہ پر تاڑی خانہ۔ گیارہ بارہ بجے تک وہ پکوڑے چھان چھان کے اسکولی لونڈوں کے ہاتھ بیچتے، دوپہر میں گھر چلے جاتے اور چار بجے لوٹ کر پھر ہوٹل کھول لیتے۔ شام گہراتی تو ان کے گاہک تاڑی خانے جانے والے لوگ ہوتے۔ پکوڑے کے دونے اور تاڑی کے چکّڑ لے کر وہ اسکول کے برآمدوں میں بیٹھ جاتے اور جُوا کھیلتے۔ کبھی کبھار کوئی زیادہ پی کر وہیں لم لیٹ ہوجاتا۔ گالی گلوج اور مار پیٹ بھی ہوتی رہتی۔ جس دن زیادہ شور مچتا تو کوئی کانسٹیبل ٹہلتا ہوا آنکلتا۔ کبھی کبھار دروغہ جی آجاتے۔ جس کی جیب سے جو نکلتا وہ جھڑوا لیتے اور دو چار ڈنڈے مار کر سب کو وہاں سے بھگا کر خود بھی غائب ہوجاتے۔ بنواری چھ عدد بچوں کے باپ تھے۔ لشٹم پشٹم زندگی چل رہی تھی۔ اہلیہ محترمہ کبھی کبھی بڑے گھروں میں جا کر اناج پھٹک آتیں۔ موسم میں اچار کے مسالے کوٹ دیتیں۔ بدلے میں کبھی چھاچھ مل جاتی، کبھی دُودھ، کبھی تازہ گڑ اور چوڑا۔ یہ گویا بونس ہوجاتا۔ سارے اسکولی بچوں سے بنواری کو خدا واسطے کی محبت تھی۔ وہ ان کے گاہک تھے۔ نہ جانے کیسے کیسے پیسے بچاتے، ماں باپ کو تنگ کرتے یا دادی نانی کو لیکن ان کے پکوڑے ضرور کھاتے۔ ان کے اپنے ننگ دھڑنگ بچے واہی تباہی گھومتے پھرتے تھے۔ لاکھ چاہا اسکول جاکے نہ دیتے۔ پڑھائی ویسے خود بنواری کو بھی کوئی خاص کارآمد مشغلہ نہیں لگا کرتی تھی۔ جو پڑھ رہے تھے وہ کون سا تیر مار رہے تھے یا مار لیں گے۔ ہاں جب سے مِڈ ڈے میل ملنا شروع ہوا تھا وہ دوپہر کے وقت اسکول پہنچ جاتے اور پتلی کھچڑی کھا کے بھاگ نکلتے۔ کچھ بے وقوف ضرور تھے جو پابندی سے اسکول آتے۔ اور ان میں سے ایسا کوئی نہیں تھا جس نے بنواری کا نمک نہیں کھایا تھا۔ بنواری دونے میں پکوڑے رکھ کر ان پر چٹنی ڈالتے اور اس دوران لڑکے کے سارے خاندان کی خیریت پوچھتے جاتے۔ لڑکے کے پاس پیسے نہ ہوئے تو ادھار دے کر بنواری اس سے کبھی تقاضہ نہیں کرتے تھے۔ گاؤں کی بھجن منڈلی کے وہ سربراہ تھے۔ پھاگن میں چیتی گانے والوں میں سب سے اونچی آواز ان کی ہوا کرتی تھی۔ برلعاش سے بدمعاش لڑکے نے بھی کبھی ان کے پیسے مارے نہیں تھے خواہ ان کی رقم چکانے کے لئے کسی اور سے بے ایمانی کر کے روپیہ کیوں نہ اینٹھنا پڑ جائے۔

گھومتے پھرتے لوگوں سے ملتے ملاتے وکیل صاحب بنواری کے ہوٹل پر بھی پہنچ گئے۔ پہنچ کیا گئے راستہ ہی ادھر سے نکلتا تھا۔ 'ہوٹل' دیکھ کر وہ نہایت محظوظ ہوئے۔ تبھی اسکول کی چھٹی ہوئی تھی اور بنواری لڑکوں سے گھر گئے تھے ''بنواری کا کا پچاس پیسے کے پکوڑے۔'' ''بنواری چاچا ایک روپے کے پکوڑے'' ''بنواری بابو ایک روپے کے پکوڑے ایک روپیہ ادھار.....'' بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وکیل صاحب چپ چاپ کنارے کھڑے ہوگئے۔ جب غول بیابانی چھٹا تو وہ سامنے آئے 'ارے وکیل بابو۔ کب سے کھڑے ہیں؟ آیئے آیئے۔ انہوں نے نہایت بے تکلفی سے دو کمّے نکال کر انہیں بھی ویسے ہی بٹھا لیا جیسے وہ اوروں کو بٹھایا کرتے تھے۔ دونے میں اپنے حساب سے دو ڈھائی روپے کے پکوڑے رکھے اور چٹنی ڈال کر انہیں پیش کئے۔ پھر نام بنام سات پشتوں کی خیریت پوچھ ڈالی اور اپنی بھی بتادی۔

''سندر یاد ہے وکیل بابو؟''

''ہاں وہ تمہارا چچیرا بھائی۔ تم سے تو بہت چھوٹا تھا۔''

''پورے پندرہ برس۔ اب تو تیس برس کا ہوگیا۔ جوانی ڈھلنے پر آگئی۔ بیاہ ہی نہیں کرتا۔ کرے تو کیسے۔ جا کے چندریکا سنگھ سے مل گیا ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی سے سگائی کر دی تھی۔ وہ اس کے نام پر بیٹھی ہے۔ کیا کریں وکیل بابو۔ ہمارے نہ لوگ نہ بہن نہ بھائی۔ ایک وہی ہے اور اتنا آدر، مان دیتا ہے کہ ہم رشتہ بھی نہیں توڑ پاتے۔''

وکیل صاحب چندریکا سنگھ کے نام پر بڑے زور سے چونکے۔ وہ چمپارن کا مشہور ڈکیت تھا۔ دنوں دن اس کی ناموری بڑھتی جارہی تھی۔

''چندریکا تو ڈاکو ہے''

’’یہی تو رونا ہے وکیل بابو ہماری سات پیڑھیوں میں کوئی بدمعاش نہیں ہوا۔ سب سیدھے سپاٹے لوگ۔ لگتا ہے جب یہ پیٹ میں تھا تو چاچی کسی مسان یا کبر گاہ سے گذری ہوگی۔ کوئی ڈکیت تبھی مرا رہا ہوگا۔ اس کی کوکھ میں آن بیٹھا۔‘‘

’’یہاں آتا جاتا ہے؟‘‘ وکیل صاحب، مزید پریشان ہوئے۔

’’اب کیا کہیں۔ وہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔ اس کی منگیتر۔ پھر جب ڈاکو ارہر کے کھیت میں ڈیرا ڈالتے ہیں تو پکوڑے ہمیں سے چھنوا کے لے جاتا ہے۔‘‘

’’کیا غضب کرتے ہو بنواری۔ پکڑے جاؤ گے۔ چکّی پیسو گے جیل میں۔ ڈاکو کو کیا فرق پڑتا ہے۔ تم ٹھہرے گرہست۔ بال بچوں والے، محنت کی کمائی کھانے والے۔‘‘

’’ہم تو وکیل بابو، تھر تھر کانپنے لگتے ہیں وہ آجاتا ہے تو۔ مگر کہتا ہے کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے بھی بھیا کو دیکھا تو وہیں کھود کے گاڑ دیں گے۔‘‘

’’ہم تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔ اپنے کو الگ کرلو۔‘‘

’’کیا الگ کرلیں وکیل بابو۔ اس کی منگیتر کو ہم بھاہو مانتے ہیں۔ پیر چھو کے ہمیں، ہماری گھروالی کو پرنام کرتی ہے۔ بچوں پہ جان دیے رہتی ہے۔ کب تک ہیں آپ گاؤں میں؟ کرشن بن کر اس غریب سُدااما کے گھر پدھاریے۔‘‘

’’تم سے مل لئے بنواری اب کل بتیا جانا ہے۔ سسرالی رشتہ داروں میں شادی ہے۔

’’بتیا! ہوشیار رہے گا بابو۔ ادھر ڈکیتوں نے ڈاکے ڈالنے چھوڑ کر پھروتی کی رقم کے لئے لوگوں کو اٹھانا شروع کردیا ہے۔ سندر کہہ رہا تھا سالے پیسہ رکھتے ہیں بینک میں اور گہنا رکھتے ہیں لاکر میں تو اب ڈاکہ کون چیز پر ڈالا جائے پکڑ کے ٹیٹوا دباتے ہیں تو روپیہ ملتا ہے۔‘‘

وکیل صاحب ہنسنے لگے۔ پھر سو روپئے کا نوٹ بنواری کے گُٹّوں پر رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ’’بچوں کے لئے مٹھائی لے جانا۔‘‘

چندریکا کا گروہ بھی بتیا میں ہی سرگرم تھا۔ پھروتی کی رقم مل جاتی تو لوگ چھوڑ دیے جاتے۔ قتل کی کوئی واردات اب تک نہیں ہوئی تھی لیکن پولیس ان لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈال پائی تھی۔ وکیل صاحب کی شامت جو آئی تو شادی کی تقریب ختم ہونے کے بعد بھی ایک دن کے لئے زمینیں دیکھنے کو رُک گئے۔ شوگر کے مریض تھے اس لئے صبح شام ٹہلنے نکلتے۔ جس دن واپس لوٹنا تھا اس دن علی الصبح کمبل ڈال کے کھینچ لئے گئے۔

ڈاکو کھیتوں کھیتوں گھومتے۔ ان کی کوئی مستقل قیام گاہ نہیں تھی۔ بتیا کے علاقے میں گھاٹیاں نہیں تھیں ارہر اور گنے کی کھیتی بہت تھی جس میں لانبے اور گھنے پودے ان کی پردہ پوشی کرتے۔ گاؤں والوں کو نقل و حرکت کی خبر ملتی بھی تو جان کے خوف سے خاموش رہتے۔

ڈاکوؤں نے وکیل صاحب سے ہی ان کے گھر والوں کو خط لکھوایا۔ فون بوتھ اور موبائل عام نہیں ہوئے تھے بلکہ موبائل تو قطعی نہیں آئے تھے۔ اس لئے پھروتی ہمیشہ خط کے ذریعے مانگی جاتی۔ رقم اور اس کی ادائیگی کے طریقے کی پوری وضاحت کردی جاتی تھی۔ وکیل صاحب بارسوخ آدمی تھے لیکن ان کی جان کو خطرہ لاحق سمجھ کر گھر کے لوگ بہت احتیاط اور سست رفتاری سے کام کر رہے تھے چاہ رہے تھے کہ پولیس درمیان سے ہٹ جائے اور رقم ادا کر کے ہی گھر کے سربراہ کو چھڑا لیا جائے۔ بیوی بچوں کا رو۔ رو کر بُرا حال تھا۔

چندریکا سنگھ نے وکیل صاحب کو مشرقی اور مغربی چمپارن کے انہیں گنّے اور ارہر کے کھیتوں کے درمیان دوڑا رکھا تھا۔ ادھر وکیل صاحب کے جوڑوں پر گٹھیا کا بھی اثر ہو چلا تھا۔ اتنا چلنے کی عادت بھی نہیں تھی، ٹہلا ضرور کرتے تھے۔ اوبڑ کھابڑ زمین پر کئی کئی کلو میٹر چلنا پڑتا، وہ بھی شانے جھکا کر تو پیر سوج جاتے۔ گھٹنوں پر ورم آجاتا تو ایک ڈاکو کڑوا تیل گرم کر کے ان کے پیروں پر مالش کرتا۔ تیار رہئے وکیل بابو۔ کل تو دس کلو میٹر سے کم نہیں دوڑائیں گے۔ یہاں پولیس نے خاص خبری چھوڑ رکھے ہیں۔ زیادہ ٹھہرے تو مارے جائیں گے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ ہمیں کیسے پتہ۔ ہمارے بھی تو خبری ہیں۔‘‘ وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا۔

نوجوان ہاتھوں سے گرم تیل کی مالش نہایت سکون بخش تھی۔ وکیل صاحب کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ’خوش رہو‘ انہوں نے بے اختیار ڈاکو کو ایسے دعا دی جیسے اپنے خاص ملازم کو دیا کرتے تھے۔ پھر بولے ’ارے بھیا کچھ بھگوان کا ڈر خوف ہے کہ نہیں۔ ہمیں کیوں پکڑ رکھا ہے۔ ہمارے ساتھ اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کیوں حرام کی کمائی کھاتے ہو۔‘

لڑکے کے چہرے پر تمسخر کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ دوبارہ کِھلکھلا کر ہنسا۔ ’بھگوان کا ڈر آپ کو ہے وکیل صاحب؟ دودھ کا پانی اور پانی کا دودھ کر کر کے راج محل بنوائے ہوئے ہیں، زمینیں خریدتے جا رہے ہیں اور سنا کہ بہنوں کو جائداد میں حصہ نہیں دے رہے۔ آخر جائیں گے تو خالی ہاتھ نہ۔ پھروتی کی رقم جلدی منگوا لیجئے تو مرتے سمے بال بچوں کا مونہہ دیکھتے ہوئے پران آسانی سے نکلیں گے۔ وِدھی وِدھان کے ساتھ کریا کرم بھی ہو جائے گا ورنہ یہیں گنے کے کھیت میں توپ دیے گئے تو بھوت بن کر بھٹکیں گے۔ لائیے ہاتھ دیجئے ادھر۔

’’اس نے انگلیوں پر بھی گرم تیل لگایا تو نظر ایک بار پھر داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی پر پڑی۔ بڑے نگینے کی دپ دپ کرتی انگوٹھی صورت سے ہی بہت قیمتی لگتی تھی۔

’’وکیل صاحب یہ کیوں پہنتے ہیں؟‘‘ اس نے انگوٹھی والی انگلی پکڑ کر پوچھا۔

’’ہمارے اندر منگل دوش ہے۔ جیوتشی مہاراج نے پکھراج پہننے کو کہا تھا۔‘‘

’’کتنے میں خریدی؟ پھر قہقہہ لگا کر بولا خریدی یا پھر ٹھگی ہے؟‘‘

’’بہت دامی ہے۔‘‘ وکیل صاحب اتنا ہی بولے پھر سوچا اب سسر سے انگوٹھی مانگ کر لینا ٹھگنا تو نہیں ہوا۔

’’منگل دوش تو ہمارے اندر بھی ہے۔ نہ گھر نہ دوار۔ بکّو بکائن کی

طرح گھومتے پھرتے ہیں۔ لائیے انگوٹھی ادھر دیجئے۔'' سندر پھر ہنسا اور انگوٹھی اتارلی جوتیل کی وجہ سے نہایت آسانی سے سرک آئی تھی۔

اس دن وہ لوگ مشرقی چمپارن میں تھے۔ شام کو بڑے اطمینان سے سندر پتاہی پہنچ گیا۔ بھائی کی کڑھائی کے پاس آکر پورے تسلے کا بیسن تلوالیا۔ انگوچھے میں پکوڑے باندھ کر کیلے کے بڑے سے دونے میں ساری چٹنی انڈیلی۔ پھر اس نے انگلی سے وکیل صاحب کی انگوٹھی نکال کر بنواری کی انگلی میں پہنا دی اور سو سو کے دو نوٹ بھی وہیں پٹیا پر دھر دیے۔ یہ پکوڑوں کے دام ہیں۔ کل کے لئے تیل بیسن لے آنا۔ انگوٹھی رمیا کو دے دینا۔ سنار سے اپنے مطابق چھوٹی کرالے گی۔ ابھی اس کے پاس جانا مناسب نہیں۔ وہ پیر چھونے کو جھکا۔

'ہمارے پاس آنا مناسب تھا کیا' بنواری نے بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے ڈانٹا۔ سندر مسکرایا۔ اس کا سیاہ چہرہ غضب کا ملیح تھا۔ ہنستا تو سفید چمکیلے دانت چہرے پر بجلی دوڑاتے چلے جاتے۔ کتنی بار کہیں بھیا ہم سے سوال جواب مت کیا کرو۔ اور پکوڑے سنبھال کر چلتا بنا۔

سندر کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد داروغہ آن نکلے۔ انہیں چکھنا لینا تھا۔ آج ولایتی بوتل کھلی تھی۔

''اتنی جلدی سب جھاڑ پونچھ کے چھٹی؟'' انہوں نے ذرا مشکوک نظروں سے بنواری کو گھورا۔ فوراً ہی نظر اس انگلی پر پڑی جس میں ایک قیمتی نگ والی انگوٹھی چم چم کر رہی تھی۔ کتنی قیمتی ہوگی یہ تو پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا لیکن لگ رہی تھی نہایت بیش قیمت (اصلی پکھراج ٹھہرا)۔ شکل سے ہی راجسی لگ رہی تھی۔

''اب ڈکیتی میں حصہ بھی لگنے لگا۔'' انہوں نے اس کی پسلیوں میں ٹہوکا دیا اور انٹی کھلوائی۔ وکیل صاحب کا دیا نوٹ ابھی خرچ نہیں کیا تھا ساٹھ ستّر بکری کے تھے۔ اتنی رقم، اور انگوٹھی کہاں سے آئی؟ اتار۔ انہوں نے انگوٹھی اتروا کر جیب میں ڈال لی اور روپئے بھی رکھ لئے۔

''سندر کہاں ہے آج کل؟''

بنواری رونے لگا۔ ''مرجائیں گے ہجور۔ سب پیسوا مت لیجئے۔ کل دوکان کیسے لگائیں گے۔ بال بچہ کیا کھائے گا۔''

''سندر کہاں ملے گا؟''

''ہم کیا جانیں ہجور۔ یہ تو آپ ہی پتہ کریں گے۔''

''اس چھنال، چندریکا سنگھ کی رکھیل رمیا کو دھرنا ہوگا تب صحیح پتہ چلے گا۔''

سندر کی محبوبہ کو بنواری اپنی 'بھاہو' مانتا تھا۔ وہ گھر آتی تو بنواری اور اس کی بیوی کے پیر چھوتی، داروغہ نے اسے چھنال کہا تو کسی ایسی چیونٹی کی طرح جو دب کر کاٹ لے، بنواری کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر تن گیا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''داروگہ جی جبان سنبھال کر بات کیجئے اور انگوٹھی بھی واپس کیجئے۔ ہم ایسے نیم دوبر نہیں ہیں۔''

جواب میں داروغہ جی نے اسے تابڑ توڑ کئی ڈنڈے لگائے اور مجرموں کا ساتھ دینے و پولیس افسر کے ساتھ گالی گلوج کرنے کے الزام میں لے جا کر حاجت میں بند کر دیا۔

یہ سارا گاؤں جانتا تھا کہ سندر باقاعدہ چندریکا سنگھ کے گروہ میں شامل ہے لیکن پھر سارا گاؤں یہ بھی جانتا تھا کہ بنواری کا اس کی ڈکیتیوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کی گرفتاری کی خبر دوسرے دن دوپہر تک گاؤں میں گشت کر گئی۔ ادھر کچھ دن سے پتاہی بلکہ چمپارن کے کئی حصوں میں سیاسی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ آئے دن جلسے جلوس۔ الیکشن قریب تھے۔ لونڈوں کو بڑا مزا آتا تالیاں بجاتے ساتھ ہو لیتے۔ کوئی مقامی نیتا تقریر کرتا ہوتا تو کبھی زندہ باد کبھی مردہ باد۔ پھر قہقہے لگاتے چل دیتے۔

تین منزلہ پختہ مکان میں رہنے والے گاؤں کے سربرآوردہ کنبے کا لڑکا جو بچپن میں بنواری کے پکوڑے کھا کر بڑا ہوا تھا۔ اور اس کی بھجن منڈلی میں کھڑتال بجایا کرتا تھا پٹنہ میں پڑھ رہا تھا اور آج کل چھٹیوں میں آیا ہوا تھا۔ اس نے کچھ نوجوانوں کو بٹورا اور تھانے چلا آیا۔

''بنواری کو کیوں گرفتار کیا چچا؟'' اس نے داروغہ سے پوچھا۔

''اس دوکوڑی کے پکوڑے والے سے آپ کو کیا لینا دینا، اشوک بابو' اشوک کے دادا ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر کے افسروں کے ساتھ مل کر آتے تھے اور نیتا گیری کرنے والے پتاہی آتے تو ان کے یہاں بھوج بھات ضرور ہوتا۔ اس لئے ایک لونڈے کے ذریعے جواب طلب کئے جانے کے باوجود انہوں نے لہجے کی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔

''یہی تو ہم بھی پوچھ رہے ہیں تاؤ کہ اس دوکوڑی کے پکوڑے والے سے آپ کو کیا لینا دینا۔''

اب کی داروغہ جی نے خاصہ چیں بہ جبیں ہوکر جواب دیا ''ڈاکوؤں سے سانٹھ گانٹھ رکھنے والے آدمی کے بارے میں آپ ہم سے سوال کر رہے ہیں؟''

''کیا ثبوت ہے؟ ہمت ہے تو چندریکا کو پکڑیے۔ وہ بے چارہ بھگوت بھجن میں ڈوبا غریب آدمی۔'' ''ہاں ہاں چندریکا کو پکڑیے۔ چندریکا کو پکڑیے۔'' لڑکوں نے شور مچایا۔ گروہ میں رمیا کے بھائی اور اس کی برادری کے کئی اور جوان بھی تھے۔

چندریکا داروغہ کی دکھتی رگ تھا۔ ایک بار گرفت میں آ گیا تھا لیکن ایسا جُل دے کر بھاگا تھا کہ داروغہ جی مونہہ دکھانے لائق نہیں رہ گئے تھے۔

انگوٹھی دروغائن کے زیوروں کے ڈبے میں رکھ دی گئی اور سندر کے حوالے سے بنواری پر سختی کی گئی۔ وہ بے چارہ دل کا مریض تھا اور یہ جانتا بھی نہیں تھا کہ اکثر اسے اچانک پسینہ کیوں آتا ہے۔ سانس کیوں پھولتی ہے اور وہ اپنی عمر سے زیادہ تھکتا کیوں ہے۔ تھانے میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مرگیا۔ طالب علموں کی برادری نے مزید شور مچایا۔ کچھ سیاسی لوگ بھی شامل ہوئے تو داروغہ جی

معہ ایک اے ایس آئی معطل کر دیے گئے۔

وکیل صاحب کو بھاری پھروتی دے کران کے عزیزوں نے چھڑا لیا۔ انگوٹھی دروغائن کے ڈبے میں جگر جگر کرتی رہی۔

'نیک بخت وہ انگوٹھی نکال۔' ایک دن داروغہ جی نے دروغائن سے کہا۔

'کیوں؟'

'ہم کہہ رہے ہیں اس لئے۔'

'کسی کو دے مت دیجئے گا۔'

'نہیں دیں گے تو ایک دن فاقے کی نوبت آئے گی۔ سال سے اوپر ہو گیا معطل ہوئے۔ ابھی تک انکوائری ہی چل رہی ہے۔'' انہوں نے جھڑک کر جواب دیا۔ اور ہم کیا کریں گے انگلی میں پتھر لٹکا کے۔'

اس سے پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر میں پولیس افسر ذرا نایاب نسل کے انسان تھے یعنی ایماندار۔ اب جو آئے وہ بالکل نارمل تھے۔ انگوٹھی جس کے نگ کی قیمت کوئی پندرہ بیس لاکھ آنکی گئی اور جس کی بناوٹ کو تاریخی قرار دیا گیا، دروغائن کے ڈبے سے نکل کر ایک بڑے پولیس افسر کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے اسے اطمینان سے انگلی میں ڈال لیا اس لئے کہ وہ بڑے افسر تو تھے ہی، دولت مند خاندان کے داماد بھی تھے۔ ان کی انگلی میں وہ انگوٹھی دیکھ کر سوال نہیں اٹھ سکتے تھے۔ نہ ہی انگوٹھی کی اصل قیمت کا لیبل اس پر چسپاں تھا۔

داروغہ اور ساتھ کے اے ایس آئی، دونوں بحال ہو گئے۔ چندریکا سنگھ کا گروہ کچھ عرصے اور فعال رہا۔ پھر کچھ سال بعد چندریکا اور سندر دونوں پولیس انکاؤنٹر میں مارے گئے۔ سندر کی منگیتر اور محبوبہ کی پولیس کسٹڈی میں اجتماعی عصمت دری کی گئی۔

''ہم کیا سندر سے برے ہیں۔ بھول جا اسے۔ وہ مر چکا۔'' پولیس والوں نے اسے برتتے ہوئے اس کے کانوں میں کہا۔ رمیا نے چھوڑے جانے کے بعد دوسرے ہی دن خودکشی کر لی۔ انگوٹھی ابھی اس بڑے پولیس افسر کی انگلی میں جگمگا رہی تھی۔

''یار اس پوسٹنگ کے لئے تو لاکھوں چل رہے ہیں'' پولیس افسر سے اس کے ایک ہم منصب نے کہا۔

''ٹھیک ہی تو ہے یار۔ بیس پچیس لاکھ دے کر کروڑ کما لئے تو بُرا کیا ہے۔ پچھتر تو ڈب میں رہے۔

''تو لگ جاؤ لائن میں۔ شاید قسمت ساتھ دے جائے۔''

''ہمارے پاس ایسا گرو منتر ہے کہ آزمائیں تو پوسٹنگ ہماری جیب میں ہوگی۔''

''منسٹر صاحب کے پی۔ ایس سے بات کر کے دیکھو۔ ان کا بیٹا سارے معاملات طے کرا رہا ہے۔''

''سنا تو ہم نے بھی ہے۔''

''جوہری نے ہمیں بتایا کہ یہ اینٹیک (antique) ہے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پرانی۔ اور اس کا نگ بدخشاں سے آیا لگتا ہے۔ اس کی بناوٹ بھی سنٹرل ایشیا کی ہے۔'' منسٹر صاحب کے پی۔ ایس کے قریبی وشو موہن جھا کو بتایا گیا۔ پھر پی۔ ایس کے صاحبزادے درمیان میں آئے۔ بات سیڑھی در سیڑھی چل کر 'تھرو پراپر چینل' (through proper channel) آگے بڑھی۔

پولیس افسر نے انگوٹھی انگلی سے اتار دی اور 'بہترین' پوسٹنگ پر چلے گئے جہاں انہیں صرف کوئلے کے مافیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی تھیں۔ دہلی میں ان کی بے نامی کوٹھی کا نقشہ تیار ہونے لگا۔ انگوٹھی اب منسٹر صاحب کی انگلی میں لو دے رہی تھی۔ انگوٹھی جسے ایک محنتی، ایماندار اور وفا شعار عورت نے راتوں کا تیل جلا کر مخمل کے تین سو ٹکڑوں پر زری کی باریک ترین کشیدہ کاری کر کے بدخشاں کے ایک سوداگر سے حاصل کیا تھا اور اپنے شوہر کی انگلی میں اپنی محبت کی نشانی کے طور پر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی سوداگر نے یہ بھی کہا تھا کہ ستارہ شناسوں کے مطابق انگوٹھی کا نگینہ پہننے والے کو آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔

''واعظ کی صحبت''

بہت پُر لطف گو اردو زباں ہے،
مذکر اور مونث کی ہے دقّت،

حجاب و پردہ گھونگھٹ اور برقع،
مذکر ہے یہ کل سامانِ عورت،

مونث ہے جناب شیخ کی ریش،
ہو کچھ بھی اس کی مقدار و طوالت،

مذکر ہو گیا گیسوئے جاناں،
ہوئی اس کی طوالت کی یہ عزّت،

دُوپٹّہ عورتوں کا ہے مذکر،
مونث کیوں ہے دستارِ فضیلت،

فراق و وصل ہیں دونوں مذکر،
مونث ہے مگر واعظ کی صحبت،

ہوئیں جب مونچھ اور داڑھی مونث،
تو پھر کرنا پڑا دونوں کو رخصت..!!

حافظ ولایت اللہ ناگپوری

ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری

شمس الرحمٰن فاروقی
(الہ آباد، بھارت)

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ آج کل افسانہ نگار کو بڑی آسانیاں ہیں۔ پانچ سات موضوعات کم وبیش مقرر ہیں اورانہیں افسانے کا رنگ دینے کے لیے بہت دورنہیں جانا پڑتا۔اخباروں کے تراشے جمع کیے، ٹی۔وی کی خبروں کوغور سے سنا اور پھر انہیں افسانے کا رنگ دے دیا۔ افسانہ نگار کو پروا ہے نہ اس کے پڑھنے والے کوفکر کہ روزمرہ کے واقعات کوافسانہ بنانے کے لیے کیا کیا درکار ہوتا ہے۔عورتوں کا معاملہ تو اور بھی آسان ہے کہ عورت اس ملک میں تقریباً ہمیشہ اور تقریباً ہرجگہ مظلوم ہے۔اب اس میں ایک نیا موضوع جوڑ دیجئے، ماں کے پیٹ میں جنین کی زندگی کا خاتمہ۔ افسانہ آسانی سے تیار ہوسکتا ہے۔عورتوں کے استحصال کا موضوع تو اب اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ خالدہ حسین بھی اس پر افسانہ لکھتی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ ان کے افسانے میں بہت سارا افسانہ بھی ہوتا ہے،صرف خبرنویسی نہیں۔مشکل یہ بھی ہے کہ خربوزے کو دیکھ کرخربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔مرد ہو یا عورت،اسے بازار بھاؤ بھی دیکھنا ہے اورادب کے میدان میں اپنی جگہ بھی بنانی ہے۔ادب سے میری مراد ادبی رسالے ہیں۔

محمد حسن عسکری نے اس بات کی بجا شکایت کی تھی کہ تقسیم ہند کے موضوع پر سبھی لوگوں نے ایک ہی طرح کے افسانے لکھے اوراس بات کا خیال رکھا کہ ہندو مسلمان میں حساب برابر رہے۔انہوں نے پوچھا کہ پھر احتجاج اور المنا کی کے لیے کیا امکان باقی رہ گیا جب اس حمام میں سبھی ننگے ہوں؟ انہوں نے لکھا:

''شروع میں اگر پانچ ہندو مارے گئے تو افسانہ ختم ہوتے ہوتے پانچ مسلمانوں کا حساب پورا ہونا چاہیے۔۔۔فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگار سب سے پہلا دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم سچ بولیں گے مگر ساتھ ہی انہیں یہ فکر ہوتی ہے کہ نہ ہندو ناراض ہوں نہ مسلمان۔غیر جانب داری کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت سے زیادہ قصوروار نہ ٹھہرایا جائے۔''

اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک فریق کو ہمیشہ ظالم اور دوسرے کو ہمیشہ مظلوم ٹھہرایا جائے۔آج کے افسانہ نگاروں سے یہ شکوہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کو دو ہی رنگوں میں کیوں دیکھتے ہیں، روشن اور تاریک۔لیکن یہ بھی ہے کہ دو رنگوں کی تقسیم آسان ہے اور کسی کو سیاسی طور پر برا ماننے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

اب اس ماحول میں ذکیہ مشہدی کے افسانے ''قصۂ جانکی رمن پانڈے'' کا تصور کیجیے۔تصور میں نے غلط کہا کیونکہ یہ افسانہ ایسا ہے کہ اس کو تصور کی حد میں لانا آج کے زمانے میں ناممکن ہی ہے۔لہٰذا افسانہ پڑھ ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جانکی رمن پانڈے زندگی بھر اپنی ہندو بیوی کے ساتھ بھری پری زندگی گزارتے رہے لیکن انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر ایک بے سہارا مسلمان لڑکی سے بھی شادی کر لی تھی اور اس شادی میں لڑکی کی مرضی بھی شامل تھی۔دو کشتیوں میں بیک وقت پاؤں رکھے رکھے زندگی کا سفر کتنی دور تک جاسکتا ہے، یہ مسئلہ اس افسانے کا مسئلہ نہیں ہے۔مسئلہ درحقیقت یہاں یہ ہے کہ لڑکی یعنی مسلمان لڑکی ہندو سے شادی کر کے اکیلے گھر میں رہ کر اوراپنی شادی کو کم وبیش راز میں رکھ کر زندگی کیونکر گزار سکتی ہے؟ اور جب اس کا میاں یعنی جانکی رمن پانڈے مرتا ہے تو اس کی روح کے سکون کے لیے وہ کیا کرنا چاہتی ہے اور کیا کرتی ہے۔

مخلوط شادیاں یا مختلف ذات کے مرد وعورت کی شادیاں یہ موضوع ہمارے سماج کی حقیقت تو بن گیا ہے اوراس حقیقت کے حجم میں مزید اضافہ بھی ہوتا جارہا ہے کیونکہ سماج کا رجحان اسی طرف ہے کہ لڑکی لڑکے میں بلا امتیاز مذہب وملت میل جول (خواہ ایک حد کے اندر ہی سہی) ہوتا رہے۔لیکن یہاں تو ذکیہ مشہدی کے سامنے کئی طرح کی مشکلیں ہیں اگر وہ روایتی قسم کی افسانہ نگار ہوتیں تو قدم بہت پھونک پھونک کر رکھتیں اور یا تو یہ بتاتیں کہ شادی ناکام رہی یا پھر بس نبھتی رہی، اس میں کوئی رس اور کس بل نہ تھا۔یا پھر وہ میاں بیوی کو باغی اور بہادر اور رسم ورواج سے منحرف بتاتیں اور پھر کوشش کرتیں کہ ان کی ازدواجی زندگی میں کہیں سے کچھ توازن یا دنیاوی تلافی کا پہلو پیدا ہو جائے۔اس طرح کے کئی امکان ذہن میں آتے ہیں لیکن ذکیہ مشہدی کا کمال یہ ہے کہ ان کے افسانے میں اس طرح کی روایتی صورت حال کہیں نہیں ہے۔وہ کسی کو قصوروار بھی نہیں ٹھہراتیں نہ ظالم سماج کو، نہ عورت کو، نہ مرد کو۔جانکی رمن پانڈے اپنی دو بیویوں میں خوش ہیں اور ان کی مسلمان بیوی اپنی تنہا شادی شدہ زندگی میں خوش ہے۔جانکی رمن پانڈے نے نہ اسے چھوڑا اور نہ اپنی پہلی بیوی کو۔اور نہ اس کی مسلمان بیوی نے کبھی سوچا کہ میں آزادی حاصل کروں یا اپنے چھوٹے سے گھر میں بند نہ رہ کر باہر آجاؤں۔

اس افسانے کو جس طرح سے بھی دیکھیے سوال ہی سوال سامنے آتے ہیں۔روایتی قسم کا سماجی مسئلہ یا دو مذاہب جن کے ماننے والے کبھی کبھی برسرپیکار بھی ہوجاتے ہیں ان میں کہیں کہیں کسی قسم کے تال میل کا امکان ہے کہ نہیں؟ یا انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی حد کتنی ہے؟ یعنی یہ حد بہت اونچی ہے یا بہت نیچی؟ انسان تھوڑے میں خوش ہوجاتا ہے یا ہر وقت بہت کی تمنا کرتا رہتا ہے؟

قصۂ جانکی رمن پانڈے'' پڑھتے ہوئے اقبال مجید کے ایک بہت پرانے افسانے ''پیٹ کا کیچوا'' کی یاد آجائے تو کچھ عجب نہیں۔لیکن اس میں کوئی توازن یا مقابلے کا پہلو نہ ہوگا۔اقبال مجید کے یہاں صورت حال ایک نقطے پر مرکوز ہے اوراسے نہایت شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس طرح اوراس قدر کہ ''پیٹ کا کیچوا'' ہمارے افسانے کی دنیا میں یادگار بن گیا ہے۔ذکیہ مشہدی کے افسانے میں دنیا نسبتاً زیادہ بڑی اور زیادہ پیچیدہ ہے اور سب سے بڑی بات افسانہ نگار کی جرأت ہے کہ وہ ایسے موضوع سے آنکھ ملانے کی صلاحیت رکھتی ہے جس سے اکثر لوگ کترا کر نکل جاتے ہیں۔اور یہ معاملہ صرف آنکھ ملانے کا نہیں

بلکہ گہرائی میں اترنے کا بھی ہے۔

ذکیہ مشہدی کے ایک افسانے ''ماں'' میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تصور بھی عام لوگوں کے لیے ناممکن ہے۔عنوان سے دھوکا ہوتا ہے کہ بہت سے بہت ہوا تو میکسم گورکی (Maxim Gorki) کے اسی عنوان کے مشہور ناول کا سا کچھ معاملہ ہوگا۔اور یوں بھی ہمارے آج کل کے شاعر اور افسانہ نگار ''ماں'' کا ذکر بہت کرتے ہیں۔مگر یہاں تو روایتی معنی میں بلکہ کسی بھی معنی میں ''ماں'' کا وجود ہی نہیں۔افسانے کی مرکزی کردار ماں تو ہے مگر اس معنی میں کہ اس کی روحانی کائنات میں یہ بھی ممکن ہے کہ تنہا، واماندۂ حال اور دنیاوی رشتوں کی طاقت اور پشت پناہی کے بغیر زندہ رہنے کی کوشش کرنے والے کو وہ اپنی ممتا اس طرح عطا کرے کہ اسے اپنے بستر میں جگہ دے دے۔حسن نعیم کا کیا عمدہ شعر یاد آیا:

سرائے دل میں جگہ دے کہ کاٹ لوں یہ رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

ذکیہ مشہدی کے افسانے ''ماں'' کے مرکزی کردار تنہا اور گاؤں گاؤں گھومنے والے اور کہیں ٹھکانہ نہ رکھنے والے سادھو کو سرائے دل میں جگہ دیتی ہے مگر یوں کہ اسے شریک خواب بھی کر لیتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ذکیہ مشہدی نے عورت اور عورت کے مسائل پر افسانے نہ لکھے ہوں۔مگر یہاں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندو یا مسلمان دونوں طرح کے طبقۂ متوسط یا طبقۂ متوسط کے کچھ نیچے کے گھرانوں کی محض سرسری بود و باش، نوشت و خواند اور خورد و نوش کی واقف کار نہیں ہیں۔وہ کے طرزِ زندگی، طرزِ فکر و احساس کی اداشناس ہیں اور نہ صرف اداشناس ہیں بلکہ انہیں اپنی نثر کے ذریعہ زندہ بھی کر سکتی ہیں۔ان کا بیانیہ محض کہانی لکھنے سے زیادہ کہانی سنانے اور دکھانے کا کام کرتا ہے۔ہنری جیمس کی نظر میں افسانہ نگار کا منتہائے کمال یہ تھا کہ وہ بیان نہ کرے بلکہ دکھائے۔ظاہر ہے کہ یہ درجہ ہر وقت اور ہر جگہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن افسانہ نگار اپنے موضوع کی روح میں اتر کر دیکھے تو وہ ایسی کیفیت پیدا کرسکتا ہے کہ جو کچھ وہ وہاں دیکھے ہمیں بھی اس میں کسی نہ کسی حد تک شریک کر لے۔ذکیہ مشہدی کے سوا میں نے کسی میں یہ بات نہیں دیکھی۔اور یہی وجہ ہے کہ عورت کے بارے میں ان کے افسانے یوں تو بڑی حد تک یک رنگ ہیں لیکن جب تک افسانہ ہمارے سامنے صفحے پر رہتا ہے ہم اس میں شریک رہتے ہیں۔

''یک رنگ'' سے میری کیا مراد ہے یہ ابھی عرض کروں گا۔فی الحال ''شریک رہتے ہیں'' کی مختصر وضاحت کر دوں۔افلاطون نے یہ نکتہ بیان کیا تھا کہ جب ہم کسی ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھتے ہیں بلکہ کسی رزمیہ کو بھی شاعر یا رزمیہ خواں کی زبانی سنتے ہیں تو کسی نہ کسی حد تک ہم خود کو ڈرامے کے واقعات (جو کچھ اسٹیج پر ہو رہا ہے) یا رزمیہ کے منظر جو کچھ رزمیہ میں بیان ہو رہا ہے) میں شریک کر لیتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ یا شاعری کی پیش کش ہمارے اوپر بہت گہرائی تک اثر انداز ہو جاتی ہے۔افلاطون کا الزام یہ تھا کہ ڈرامہ اور شاعری وغیرہ میں غیر حقیقی بلکہ اخلاقی حیثیت سے نقصان دہ باتیں بھی بہت ساری ہوتی ہیں اور ہم ڈرامے یا رزمیے کی پیش کش میں شریک ہو جانے کے باعث خود بھی ان خرابیوں یا نقصان دہ باتوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔

افلاطون کے اس الزام کا کوئی جواب کسی سے بن نہیں پڑا ہے۔ارسطو نے کوشش کی لیکن وہ بھی صرف ایک آدھ نکتہ پیش کر سکا جو پورا جواب نہیں بن سکے۔ہنری جیمس نے افسانہ نگار کو بیان کنندہ کے بجائے پیش کش کنندہ بتانے کی جو کوشش کی تھی وہ اسی وجہ سے کی تھی کہ ایسی صورت میں افسانے کا قاری افسانے میں پوری طرح شامل ہو جائے گا۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں یہ انداز کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ دیہاتی یا ناخواندہ کرداروں کو بھوجپوری زبان ہی میں درج کرتی ہیں (بلکہ مجھے اس سے تو الجھن ہی ہوتی ہے)۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہر اہم اور کبھی کبھی غیر اہم کردار کو بھی ہمارے لیے ایک تصور یا ایک نام سے زیادہ ایک شخص بنا دیتی ہیں۔اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب افسانے کے ماحول اور اس کے مافیہ کے بارے میں ان کی معلومات اخبار اور ٹی وی سے نہیں بلکہ تخیل کی دنیا میں حاصل کی ہوئی ہوتی ہے۔

کچھ دن ہوئے ایک مغربی نقاد نے اپنے یہاں کے افسانوں کے بارے میں شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ افسانے Under imagined ہیں یعنی ان کے مافیہ کو افسانہ نگار نے اپنے تخیل سے نہیں گزارا ہے بلکہ عقل اور معلومات کی دنیا سے اخذ کیا ہے۔ذکیہ مشہدی کے کرداروں پر یہ الزام نہیں لگ سکتا کہ وہ Under imagined ہیں۔یہ خیال رکھئے کہ کسی افسانے میں ''حقیقت'' کا وجود اس بات سے نہیں ثابت ہوتا کہ جو واقعہ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ درحقیقت پیش آیا تھا۔ارسطو نے یہ بات بیشک کہی تھی کہ اگر کوئی واقعہ درحقیقت پیش آ گیا تو یہی اس کی واقعیت کا ثبوت ہے یعنی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قانون لزوم Law of Necessity کی شرطوں کو پورا کرتا ہے۔لیکن یہ بات اس نے ''حقیقت نگاری'' کی ضمن میں نہیں، بلکہ امکان اور وجود کے سیاق و سباق میں کہی تھی، کہ ڈرامے کے پلاٹ میں کیا ممکن ہے اور کیا غیر ممکن ہے؟ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ افسانے میں ''حقیقت'' الگ شے ہے اور ''واقعیت'' الگ شے۔افسانے میں ''حقیقت'' کا وجود تخیل کی بیش از بیش کارفرمائی کے بغیر ناممکن ہے۔آپ اسے قولِ محال سمجھیں تو یہی سہی لیکن میں ان افسانوں سے پناہ مانگتا ہوں جن میں واقعہ ہی واقعہ ہے لیکن حقیقت نہیں ہے۔

تو پھر میرے اس قول کے کیا معنی ہیں کہ عورت کے مسائل کے بارے میں ذکیہ مشہدی کے افسانے بڑی حد تک یک رنگ ہیں؟ (ملحوظ رہے کہ نہ ''قصۂ جانکی رمن پانڈے'' اور نہ ''ماں'' عورت کے مسائل کے بارے میں ہیں) یک رنگی سے میری مراد یہ ہے کہ ان کے افسانوں کی دنیا میں جتنے مرد ہیں وہ نا انصاف ہیں (چاہے انہیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ وہ ناانصافی کر رہے ہیں) بلکہ جس چیز کو ذکیہ مشہدی ناانصافی کے طور پر دیکھتی ہیں، مردوں کی نظر میں وہ فطری اور استحقاق پر مبنی ہے۔کچھ مرد ان کے افسانوں میں ایسے ہیں جو ناانصاف

سے بڑھ کر سفاک، ظالم اور جابر ہیں اور معمولی ہمدردی کے احساس سے بھی عاری ہیں۔اس کے برعکس ذکیہ مشہدی کی دنیا میں عورتیں ساری کی ساری مظلوم ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جو خود کو مظلوم جانتی ہیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو یہ جانتی بھی نہیں کہ وہ مظلوم ہیں۔اس یک رنگی کو کثرت الالوان میں بدلنے کے لیے ذکیہ مشہدی کے پاس کچھ ترکیبیں ہیں لیکن وہ زیادہ تر مجھ جیسے مردوں (یا مردوؤں) کے کان پر سے گزر جاتی ہیں۔

''پارسا بی بی کا بگھار'' اس مجموعے کا طویل ترین افسانہ ہے۔اور تقریباً ایک ناولٹ کا حکم رکھتا ہے۔اس کو پڑھتے ہوئے میں کئی طرح کی کیفیتوں سے دو چار ہوا۔ایک تو وہی جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ذکیہ مشہدی کے کردار پوری طرح ان کے دریائے تخیل کو تیرتے ہوئے نکلتے ہیں اور فوراً ہمارے ملاقاتی بن جاتے ہیں۔مختلف طرح اور مختلف طبقے کے لوگوں اور خاص کر عورتوں کی گفتگو کا آہنگ ذکیہ مشہدی کی مکمل گرفت میں ہے۔لیکن جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے میں اس الجھن میں مبتلا ہونے لگتا ہوں کہ کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل۔عورت اور مرد دونوں اصناف کے کردار مختلف وضع کے ہیں اور مختلف پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔لیکن یہی لگتا ہے کہ ان سب کو ذکیہ مشہدی نے اپنے واحد اور عظیم الشان بیانیے (Grand Narrative) میں قید کر رکھا ہے۔اس اصطلاح سے میری مراد ہے، ایسا بیان جو تمام حقائق کو توجیہہ کر سکے، انہیں بیان کر سکے۔عورتیں سراسر مظلوم ہیں یہ ذکیہ مشہدی کا Grand Narrative ہے۔

ناولٹ کے آخر میں مرکزی عورت کردار (قمر) کی بیٹی رضوانہ ماں کی باتوں پر جھنجھلا کر پیر پٹکتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ مجھے آج ہی ممبئی واپس جانا ہے (جہاں وہ وکلا کی ایک فرم میں کام کرتی ہے۔قانون کی تعلیم اس نے باپ ماں اور خاص کر باپ کی مرضی کے خلاف حاصل کی ہے اور دونوں کی مرضی کے خلاف وہ ممبئی میں کام کرنے چلی جاتی ہے) بیٹی کی ماں قمر نے بھی اپنے وقت میں باپ ماں اور پھر اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف مقاومت کی تھی لیکن وہ ادھوری رہی کیونکہ اسے آخر کار اٹھائیس سال کی عمر میں ایک دوہاجو کو کچھ طوعاً اور کچھ کرہاً اپنا شوہر بنانا پڑا۔لیکن اس نے اتنی مفاومت ضرور کی کہ دو بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد اس نے کہا بس، اب بیٹا بیٹی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بغاوت اسے کچھ مہنگی پڑی، اس کی طرف ذکیہ نے کچھ اشارہ کیا ہے۔رضوانہ نے اب تک کئی باغیانہ قدم اٹھائے ہیں۔وہ آزادی کی طرف مثبت قدم ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی قدم (کم سے کم میرے خیال میں) ایسا نہیں جسے فیصلہ کن قدم سے تعبیر کیا جا سکے۔لیکن ذکیہ میری بات سے متفق نہیں ہیں اور کہتی ہیں کہ رضوانہ کا اپنی ماں کو کچھ ٹیڑھا جواب دے کر اس کے سامنے سے اٹھ آنا اور ممبئی اپنی نوکری پر چلا جانا دراصل مکمل اظہار آزادی کی طرف پہلا قدم ہے۔وہ کہتی ہے کہ رضوانہ اپنے فیصلے آپ ہی کرے گی۔(لیکن یہ بھی تو غور کریں کہ قمر اس طرح مزید مظلوم بن جاتی ہے)

یہ خود اپنی جگہ پر بڑی بات ہے کہ ذکیہ مشہدی نے مکمل اظہارِ آزادی کے امکان سے منہ نہیں موڑا ہے۔عین ممکن ہے کہ افسانہ نگار کی طرح اس کے کچھ قاری بھی اس سے متفق ہوں کہ رضوانہ آزادی کی علامت ہے۔لیکن میں یہ امید تو کر ہی سکتا ہوں کہ ذکیہ مشہدی کی عورتوں کی دنیا میں کچھ مزید انقلابی قدم اٹھیں گے۔''پارسا بی بی کا بگھار'' میرے لیے بہر حال بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے کہ عورتوں کے مسائل (کہ جو آج کل عام سا موضوع بن گیا ہے) پر اتنی شدت سے سوچا ہوا اتنا طویل افسانہ بنانا آسان نہ تھا۔

ذکیہ مشہدی کی دنیائے افسانہ میں اور بہت کچھ ہے۔یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں کہ گزشتہ دو دہائیوں میں ان کا نام ہمارے سامنے بار بار آ تا رہا ہے۔ انہوں نے کئی طرح کے موضوعات کو اپنایا ہے۔گزشتہ تاریخ اور تہذیب کا حافظے سے محو ہو جانا ہمارے زمانے کے لوگوں کا المیہ ہے۔ذکیہ مشہدی کے چھوٹے سے افسانے ''ہدو کا ہاتھی'' میں گزشتہ کی نفاست اور چمک دمک اور حال کی سطحیت اور اس کی بنا پر گزشتہ کی نفاست اور چمک دمک کو بھی محض تفریح کی چیز بنا دینا یہ تمام باتیں بڑی خوبی سے ادا ہو گئی ہیں۔کئی افسانوں میں اس دنیا کا ذکر ہے جو ابھی چند برس پہلے ہمارے درمیان تھی اور آج زندگی کے بدلتے ہوئے معیار نے اسے منتشر کر دیا ہے۔جو لوگ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہ نکلے تھے ان کی اولادیں دور دراز کے دیسوں میں ہیں اور انہیں ٹھیک سے معلوم بھی نہیں کہ ہم کہاں کیا چھوڑ کر آئے ہیں۔ان افسانوں میں گزشتہ کے لیے کوئی ہوک (Nostalgia) نہیں صرف حقیقت کا اظہار ہے۔

کبھی کبھی ذکیہ مشہدی مجھے روایتی قسم کی عورت سے زیادہ کچھ سنگ دل حقائق کو سمجھنے والی اور برتنے والی ہستی معلوم ہوتی ہیں۔اوہام پرستی، یا پابستگی رسم و رہ قدیم، یا صرف تجسس کی کمی کس طرح ہم لوگوں کی زندگیوں کو لطف اور رنگ کی جگہ خوف اور رنج سے بھر دیتی ہے یہ دیکھنا اور جاننا ہو تو ذکیہ مشہدی کے افسانے پڑھیے۔یہ ضرور ہے کہ وہ کبھی کبھی بات کو تھوڑا بہت پھیلا کر کہتی ہیں یا کبھی کبھی خود کلامی ہی کے رنگ میں سہی لیکن سبق آموز کا جامہ پہن لیتی ہیں۔آخر پریم چند اور پھر کرشن چندر اور ایک حد تک عصمت چغتائی کی جانشین جو ٹھہریں۔

گزشتہ چند برسوں میں ذکیہ مشہدی کے جاننے اور چاہنے والوں کی تعداد سرحد پار اور پھر سمندر پار تک پھیلتی جا رہی ہے۔لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ذکیہ مشہدی نے بھی اس بات کو دھیان میں رکھ کر افسانہ لکھا ہو کہ اسے غیر ملکوں کے لوگ یا فلاں مزاج کے لوگ کس طرح پڑھیں گے۔مزاج کی یہ استقامت ان کی بہت بڑی خوبی ہے جو آج کل اچھے اچھوں میں نظر نہیں آتی۔پہلے زمانے میں تو صرف شاعروں کا طریقہ تھا کہ مشاعروں کے سامعین اور ماحول دیکھ کر کلام سناتے تھے۔بہت سے لوگ تو کئی مشاعروں کے بعد منجھ جاتے تھے کہ کون سی غزل کہاں چل سکتی ہے۔افسوس کہ اب افسانہ نگاروں نے بھی یہ انداز اپنانے شروع کر دیے ہیں۔قاری کو سامع فرض کرنا اور پھر اس کے مبینہ مزاج کے اعتبار سے افسانہ لکھنا ہمارے افسانہ نگاروں کے حق میں اچھا نہیں ہے، آسان سہی۔کئی رسالے ایسے ہیں جو ''منی افسانہ'' یا ''افسانچہ'' قسم کی چیز بڑی خوشی سے چھاپ

باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے

صدائے بازگشت

علی احمد فاطمی
(الہ آباد)

ذکیہ مشہدی اردو کے ہنگاموں اور تنازعوں سے دوران سینئر اور کہنہ مشق لکھنے والیوں میں سے ہیں جنہوں نے علم وادب کو بالعموم اور افسانوی ادب کو بالخصوص نہایت سنجیدگی اور فکری وابستگی سے لیا ہے۔ نفسیات کی طالب علم رہیں ذکیہ مشہدی اردو وتہذیب وادب میں سر سے پیر تک رچی بسی ہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں انہوں نے افسانے لکھے اور خوب لکھے۔ کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''صدائے بازگشت'' ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے جو تیرہ مختصر اور طویل افسانوں پر مشتمل ہے اور ''صدائے بازگشت'' سے پہلے اپنے افسانوں کے بارے میں ایک چھوٹی سی تحریر بھی ہے جس میں یہ اعلان کہ اس مجموعہ کا نام پہلے ''دیکھ کبیرا رویا'' تھا اس کے بعد کسی وجہ سے ''صدائے بازگشت'' رکھنا پڑا اور پھر یہ اعتراف:

''واقعات کردار یا حالات متاثر کریں تو ان پر گفتگو کرنا انہیں دوسروں کے سامنے بیان کرنا بھی انسانی خصلتوں میں سے ایک ہے۔ ادیب وشاعر انہیں تحریر کے دائرے میں لا سکتے ہیں۔ بس یہی فرق ہے ان میں اور ان لوگوں میں جو مصنف نہیں ہیں۔ میری تحریروں میں بھی وہ لوگ اور واقعات سموئے ہوئے ہیں جنہوں نے کبھی ذہن کو نوکِ سناں سے کریدا۔ میں نے کہیں صادر نہیں کیے ہیں بس انہیں صفحات پر اتارا ہے۔ کبیر ہوتے تو شاید کچھ زیادہ روتے ہوتے۔''

آخری جملہ معنی خیز ہے کہ شاید حالات پر روتے زیادہ تھے یا یہ افسانے رلاتے زیادہ ہیں اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ اس کا نام ''دیکھ کبیرا رویا'' کیوں نہیں ہوا جبکہ ان افسانوں کی مناسبت سے یہ نام زیادہ موزوں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی تکنیکی وجہ رہی ہو۔ رونا ایک محاورہ ہو سکتا ہے اور رونا راحت بھی، لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہتا ہے کہ کیا افسانوں اور فن پاروں کا کام ''رلانا'' ہے یا اس کی ذمہ داری کچھ اور بھی ہے۔ یہ ذمہ داری کیا ہے اس منطقی بحث میں پڑے بغیر ذکیہ مشہدی نے ان سوالوں کے جواب اپنے افسانوں میں دیے ہیں۔ یہ افسانے اس کے کردار، اس کے مکالمے، اس کا فکر انگیز اور دردمندانہ بیان غرض یہ کہ پورا ماحول صرف دل بہلانے کی چیز نہیں بلکہ ذہن وفکر کو جگانے ہی نہیں جھنجھوڑنے بلکہ نوکِ سناں سے لہولہان کرنے کا کام کرتے ہیں۔ کہیں حالات کے جبر کے ذریعہ، کہیں کرداروں کی مجبوری ولاچاری، کہیں نفرت وعداوت کا زہر، کہیں محبت ودوستی کے سریلے بول، کہیں قدامت کہیں جدیدیت، کہیں مستقبل کا خوف اور کہیں صدائے بازگشت اور ان سب کے درمیان گہری انسانی زندگی کی گھٹتی ہوئی قدر وقیمت، موت در موت، زوال بہ زوال۔ یہ سلسلہ مجموعہ کے پہلے ہی افسانے سے شروع ہو جاتا ہے۔ ابّن ماموں کا بیٹھکہ۔ احباب کی محفل۔ ہری پرشاد کی موت۔ بزرگوں کی فکرمندی (جس میں ہندو ومسلمان سبھی شامل ہیں) اور نوجوانوں کی بے فکری و بے حسی اور اسی بے فکری و بے حسی کی کوکھ سے جنم لینے والی موتیں:

''قصبے میں بیک وقت ایک کنبے کے گیارہ افراد کا قتل۔ بغل کے ضلع کے گاؤں میں ایک ذات سے تعلق رکھنے والے چوبیس آدمی مارے گئے۔ شمال مشرق میں ایک مخصوص قبیلے کے پورے گاؤں کا صفایا۔ پٹھانوں کی اس بستی میں اوسطاً روزانہ دو آدمیوں کا قتل۔''

اور پھر بزرگوں کا یہ کہنا۔۔۔ ''کیا زمانہ آن لگا ہے!''

''قتل یعنی بھی تھے ابھی نہیں۔''

انسان کی زندگی کی بے قدری دیکھ کر ابّن ماموں کے ہاتھ تھرتھرانے لگتے ہیں اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر گھومنے لگتی ہیں اور ٹھکیدار رام دین کہہ اٹھتا ہے۔ ''پانی کیرا ببلبلہ اس مانس کی بات دیکھتے ہی چھپ جائے گا جیوں تارا پربھات۔''

ایک اور افسانہ ہے ''ایک مکوڑے کی موت'' اسی المیہ کو مزید دھار ملتی ہے، ایسی دھار کے قاری لہولہان۔ ایک جاہل گنوار اور بے حد غریب کو لالچ دے کر سیاسی جلسے میں بھیڑ لگانے کے لیے شہر لایا جاتا ہے۔ آٹھ روپے کی لالچ۔ پیر میں ٹائر کی چپل اور ہاتھ میں جھنڈا اور پھر یہ منظر:

''جھنڈا دُھنیا نے پرے رکھ دیا اور چپل ہاتھ میں لے کر گھما گھما کر دیکھنے لگا۔ دیر تک ہاتھوں میں ہی پہنے رہا۔ وہ مقدس شئے تو سر پر رکھنے کے لائق تھی جو اسے یوں آسانی سے حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے پیروں نے صدائے احتجاج بلند کی وہ چپلوں کے عادی نہ تھے، کٹے پڑے سیاہ پیر تالاب کی خشک اور سیاہ مٹی میں پپڑائے ہوئے بوائیاں پھٹے۔۔۔''

ان جملوں میں سماج کے انتہا پر پہنچے ہوئے غریب طبقہ کی نفسیات اور حالات کی ستم ظریفی کا ملا جلا تاثر افسانے کے مقصد کو ہی نہیں فضا کو بھی پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ خوبصورت تخلیقی جملوں سے ڈھل کر یہ افسانہ نہایت اثر انگیزی اور معنی خیزی کے ساتھ دُھنیا کی موت کے انجام کو پہنچتا ہے لیکن المنا کی اور دردنا کی کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ دُھنیا کی لاش سرکاری ضابطے میں آ گئی۔ سرجوڈرم کو ساٹھ روپے دیے گئے اور لاش سونپی گئی۔ یہاں سے ایک دوسرا کردار شروع ہوتا ہے اور بے حسی کی دوسری کہانی لیکن پہلی سے ربط اور گہری معرفت کے ساتھ سرجوڈوم کا لاش ندی میں پھینکنا۔ ساٹھ روپے اور کفن چرانا اور پھر تاڑی کی طرف چل دینا شدید بے حسی کا المیہ بن کر سامنے آتا ہے اور پھر پہلے افسانے کی طرح سوال پھر اٹھتا ہے۔

''روز مرڈر۔ آئے دن قتل۔ یہ ہمارا سماج کدھر جا رہا ہے؟''

اور یہ مصنف کا کام ہے کہ افسانے کے خارج یا باطن سے تڑپتے اور سلگتے ہوئے سوال کچھ اس طرح پُر اثر اور فنکارانہ طور پر اٹھائے کہ جواب کی تلاش سنجیدہ قاری کے لیے ناگزیر ہو جائے۔ کل کفن میں بھی اسی طرح کے سوالات پریم چند نے اٹھائے تھے تب سینئر گھیسو نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا۔ آج کے سوال کا جواب کون دے۔ حالات جسے آج کا افسانہ نگار سچویشن کے ذریعہ پیش کر

کے افسانہ کی زیریں لہروں سے بالائی سطح پر پھوٹتے ہیں اور کل کے مقابلے آج ضرورت سے زیادہ بے رحم اور سفاک سچویشن کے بارے میں غور وفکر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔اس افسانے کے آخری جملوں کو ملاحظہ کیجیے:

''لاش چھپاک سے پانی میں گری اور کچھ لمحوں کے بعد ابھر کر تیرنے لگی۔۔۔دور اللہ میاں کے پچھواڑے بسے ایک دور افتادہ گاؤں میں چند لوگ اپنے ایک پیارے کا انتظار کر رہے تھے جو آٹھ روپے لانے گیا تھا اور شاید کچھ بچی ہوئی پوریاں بھی اور ہندوستان جنت نشان کے کچھ لوگ دوسروں کی عبادت گاہیں ڈھانے اور گلے کاٹنے کے بعد رام راجیہ لانے کے پھیر میں خاصے مصروف تھے۔''

یہ فرق ہے پرانے اور نئے افسانے میں۔کفن میں تھوڑی دیر کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ استحصال کس کا ہو رہا ہے۔گھیسو اور مادھو بیوی کی موت پر جمع کیے ہوئے دھن سے شراب پی جاتے ہیں اور افسانہ ان کے شراب خانے میں رقص پر ختم ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں ایک دلت ہی دوسرے دلت کے ساتھ موت کا بیوپار کرتا ہے اور پھر اختتام افسانے کے کینوس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس لمبی مدت میں استحصال، فرقہ واریت، نفرت و عداوت اور غربت نے گھیسو اور مادھو سے دس گنا زیادہ بے حس اور ظالم کردار پیدا کر دیئے ہیں جس میں اقتدار اور سیاست دانوں کا بڑا اور کلیدی رول ہے اسی لیے یہ افسانہ سیاست سے شروع ہوتا ہے اور مرتی ہوئی آدمیت پر ختم ہوتا ہے۔

''قشقہ'' ان کا ایک اور افسانہ جو غریبی، محرومی، لاتعلقی اور نالائقی سے ہی راست طور پر تعلق رکھتا ہے۔جستجو کا افسانہ۔ایک طرف محرومی ومایوسی، صبر واطمینان، دوسری طرف آرزو اور ارمان۔ان دونوں کے ٹکراؤ اور زمانے کا بدلاؤ یہ سب کچھ محض ایک کردار کے ذریعے سامنے آتا ہے اور یہ ایک مشکل فن ہے جو ماہر قلمکار اور فنکار کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔اردو میں کرداروں یا صرف ایک اہم کردار کے ذریعہ افسانے کا تانا بانا بننے کی روایت نئی نہیں ہے تاہم غیر معمولی ضرور ہے۔''بابو گوپی ناتھ''''کالو بھنگی'' یا ''منگو کوچوان'' صرف ایک کردار نہیں ایک عہد اور ایک معاشرہ کی علامت بن جاتے ہیں۔ذکیہ مشہدی کا یہ علم وہنر صرف جستجو میں ہی نہیں ''فدا علی کریلے اور اردو'' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔اس بنا پر وہ افسانے کی قدیم اور صحت مند راویت سے گہرا رشتہ تو رکھتی ہیں لیکن قدم قدم پر اپنے افسانوں میں آج کے سوالات کھڑا کر کے اسے آج کے مسائل ومصائب سے جوڑ دیتی ہیں۔مثلاً اسی افسانہ کا بنیادی سوال یہ ہے ''عظمتِ رفتہ کے دام اب اور کتنے گریں گے؟'' اس کے فوراً بعد نئی نسل کا ہائے کہہ کر یا جدید طرز کا سلام کر کے گزر جانا۔انہیں قدیم وجدید کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔مسلمانوں کے اوپری طبقہ کی بدلتی ہوئی تہذیب کی اس تبدیلی میں صرف فیشن کی ہوا کام نہیں کر رہی ہے بلکہ صارفیت، تجارت وترقی کے ساتھ ساتھ حفاظت اور فرقہ پرستی کے حملے سے بچنے کی کوشش بھی کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔یہ بات صرف ایک دو گھر میں نہیں بلکہ پورے طبقہ، ملک ومعاشرہ میں سمائی ہوئی ہے۔بی بی کی نیاز ان کا ایک اور اثر انگیز افسانہ ہے جس میں مصنفہ نے اپنا پورا مشاہدہ، مجاہدہ اور نسوانی جذبہ انڈیل دیا ہے۔خیر النساء سیدانی کی کہانی۔شرافت اور سیادت کی کہانی۔ایک عورت کی کہانی اور انتہا پر پہنچی۔۔۔ایثار بھرے ایک ماں کے کردار کی کہانی جو دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ افسانہ اپنے اسلوب، ماحول اور فضا کو دیکھتے ہوئے آج کا افسانہ کم کل کا زیادہ لگتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج کے اکثر کمزور افسانوں کے مقابلے کل کے مضبوط افسانے ہم بار بار پڑھتے ہیں۔اچھے اور برے افسانوں کا کبھی کل نہیں ہوتا وہ ہمیشہ آج کے ہی افسانے ہوتے ہیں۔ذکیہ مشہدی نے تو نہایت فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ زیادہ تر افسانوں کو آج ہی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ افسانہ اس کا مرکزی کردار اور کہانی کے تمام آثار وآزار کل کے زیادہ لگتے ہیں لیکن ان میں سے پھوٹتا ہوا جو انسانی درد ہے وہ اپاہج بیٹے کے ذریعہ کسی بھی دور کے درد وغم کو چھو لے گا اس لیے کہ بیچارگی، حالات کی ستم ظریفی اور اپاہج ہونا کسی مخصوص دور کی پیداوار نہیں ہوتے اور اب جبکہ پورا معاشرہ اپاہج ہو چکا ہے ایسے میں یہ افسانہ اور اس کی معنویت اور تاثیریت نظر انداز نہیں ہو سکتی۔

''شانو کا سوال'' الیاس کی بے روزگاری سے شروع ہوتا ہے لیکن ختم ہوتا ہے دنیا کی خرابی اور بدحالی پر۔پھر بھی ایک راکشس انسان بننے کی خواہش کیوں رکھتا ہے اس لیے کہ اس سے انسانوں کے دکھ درد دیکھے نہیں جاتے۔وہ انسان بن کر انسانوں کے دکھ درد بانٹنا چاہتا ہے لیکن رشی مہاتما اس سے یہی کہتے ہیں:

''ارے یہ کیا بننا چاہتا ہے اس سے تو اچھا ہے کہ کتا، بلی بن جا تو گیانی دھیانی دھرماتما انسان کو سمجھا ہی نہیں۔''

لیکن وہ راکشس انسان بن کر ہی مرتا ہے لیکن اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ کاش کچھ دن اور جی لیتا۔زندگی کا یہ کڑا رنگ:

''جھگیوں میں، چالوں میں، جھونپڑیوں میں انتہائی درجے کی غربت اور غلاظت کے درمیان رہتے انسان۔ٹرکوں سے کچلے جاتے، بارش میں بھیگتے، دھوپ میں جلنے کے باوجود فٹ پاتھوں پر رہتے انسان۔دوسروں کے لیے غلہ اُگا کر خود بھوکے مرتے انسان، قحط میں بھوک سے بلبلا کر بچوں کو دو مٹھی اناج کے بدلے بیچتے انسان۔اپنے ایسے پیاروں کو جن کے بغیر زندگی کا تصور محال تھا۔اپنے ہاتھوں سے جلا کر اور دفنا کر زندہ رہتے انسان۔کوڑے کے ڈھیر پر جوٹھے پتوں کے لیے کتوں سے لڑتے انسان۔بقا کی جدوجہد فنا کے گھاٹ اترتے انسان۔''

لیکن لوگ پھر بھی جینا چاہتے ہیں۔انسان تو راکشس بن گیا ہے لیکن راکشس انسان بننا چاہتا ہے۔کیوں؟ یہ ایک سنجیدہ اور گہرا سوال ہے جو افسانے کے درون سے پھوٹتا ہے۔یہی سوال ہے جو صرف اس افسانے کا ہی نہیں آج کی زندگی کا عنوان بن جاتا ہے۔یہ جملے اس قلمکار کے قلم سے نکلے ہیں جو اشتراکی ہے نہ کمیونسٹ اور جو ترقی پسند ہے نہ جنوادی پسند۔محض ایک قلمکار اور فنکار ہے۔اس کا ذہن انسان، انسانی زندگی کے پیچ وخم، کیف وکم اور اس کے مسائل ومصائب سے پُر ہے۔وہ اقدار انسانی اور اخلاق معاشرتی کے تصادمات اور تضادات کے درمیان اس کائنات کی سب سے عظیم وافضل شے یعنی کہ حضرت انسان کی بے قدری اور بے

حزمتی پر متفکر اور پریشان ہے۔ یہ محض اس کی انسان دوستی ہے اور یہی سب سے بڑی ترقی پسندی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام افسانے (نفعی حصار وغیرہ) طاقت و جبر، تہذیب و ثقافت، فرقہ واریت، گاؤں، دیہات، گھر باہر اسکول، پنچایت، لڑکے لڑکیاں، جوان بوڑھے سبھی کو سمیٹے ہوئے ہیں سبھی اپنا اپنا رول ادا کر رہے ہیں لیکن ان سب کے پیچھے زندگی کا مقصد، انسان کی قدر و قیمت، حقیقت، سوال در سوال اور اچھے وعمدہ افسانے سوالات کو ہی جنم دیتے ہیں۔ ہاں سے اضطراب و اجتہاد کے سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں قائم یہ سوال ذکیہ مشہدی کے ذہن میں جذب و پیوست فکر و خیال، حیات و کائنات کے تئیں ان کے وژن اور مشق کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے وسیع مشاہدات و تجربات کا کھلا اعلان کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں کی ایک بڑی انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک خاتون کے قلم سے نکلے ہیں پھر بھی ان میں روایتی اور محدود نسائیت کم کم ہی ہے۔ نسوانی کردار بھی زیادہ نہیں ہیں۔ انجو، رضیہ جیسے کردار تو بس نام کے ہیں البتہ خیر النساء جیسے نسوانی کردار پر سیکڑوں مرد کردار قربان کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی مکمل افسانوی فضا میں مرد کردار ہی چھائے ہوئے ہیں اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اکثر افسانے کردار کے نام اور نقل و حرکت سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ اجّن ماموں۔ تجّو۔ فدا علی۔ جانکی رمن پانڈے جیسے کردار ان کے افسانوں کے کینوس میں اس طرح رواں دواں ہیں جیسے انسانی جسم میں سانس کی رفتار۔ محض عورت کو مظلوم و مجبور دیکھنا انہیں پسند نہیں جبکہ پوری زندگی پوری انسانیت مظلوم اور بیمار ہو چکی ہے۔ بڑا ذہن، بڑا وژن چھوٹی موٹی تفریق سے بالاتر ہوتا ہے وہاں زندگی کے اسرار و رموز ''نشیب و فراز'' ایک سوال اور ایک فلسفہ کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اور اچھے اور بڑے افسانے صرف ایک واقعہ یا صرف ایک طبقہ نہیں ہوتے بلکہ ایک جذبہ اور ایک فلسفہ ہوتے ہیں۔ اور یہ فلسفہ اپنے مختلف روپ میں ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں بڑے خلاقانہ انداز میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ مثلاً:

''آندھیاں ہمیشہ چراغوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔''

''اتنے دکھ اٹھا کر بھی خدا سے اس کا ایمان نہیں اٹھا تھا۔''

''دراصل ان کے سکڑے ہوئے ہونے کی وجہ ہی دنیا میں اتنی جگہ نکلتی ہے کہ باقی لوگ آرام سے رہ سکیں۔''

''پڑھ لکھ نہیں سکتا تو کم از کم دنیا کا علم ہونے تو دو آنچل تلے چھپا کر رکھو گی تو اور باؤلا ہو جائے گا۔''

''لائق اور نالائق کا اسے علم نہیں تھا اس لیے یہ علم دنیا بہت دھیرے دھیرے آگے چل کر سکھاتی ہے۔''

ایسے تراشے اور ڈھلے ہوئے جملے صرف زبان و بیان کی مشاقی سے نہیں نکلتے بلکہ زندگی کی برہنہ سچائیوں اور اس کے بے رحم سرد کاروں سے راست طور پر ٹکرانے اور ڈوبنے ابھرنے کے بعد جنم لیتے ہیں اور انہیں سے لکھنے والے کے مشاہدہ و تجربہ کا ہی نہیں اندازہ ہوتا بلکہ حیات و معاشرہ کے تئیں اس کا نظریہ بھی کھلتا چلا جاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عمدہ افسانے صرف افسانے نہیں ہوتے بلکہ فکر و نظر اور دانش و بینش کا مظہر بھی ہوتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگار کے یہاں مرد، عورت، شہر، دیہات، قدیم و جدید کی تفریق مٹ جاتی ہے اور یہ سب کے سب ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں اس لیے ان افسانوں کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے موضوعات اور اسلوب پرانے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک خاص گھریلو اور قصباتی تہذیب میں ذکیہ مشہدی کا ذہن اور قلم زیادہ کھلتا ہے اور یہ افسانے آج کی تہذیب کے مقابلے کل کی تہذیب میں سانس لیتے نظر آتے ہیں لیکن ان میں جبر و قدر، موت و زیست کی جو صورتیں اور ہلاکتیں ہیں وہ کل بھی تھیں اور آج مزید غضبناکی کے ساتھ سر اٹھاتی ہیں۔ یہ وہ قدریں ہیں جو ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کوئی کچھ کہے کیا آج کے افسانوں میں یہ جملے نظر آتے ہیں:

''خیر النساء گھر میں یوں رچ بس گئی تھیں جیسے بطخ پانی میں''

''جب تک گھر نہ آ جاتا جلے پیر کی بلّی کی طرح گھومتی رہتیں۔''

''گیہوں کٹ چکا تھا۔ کھیتوں کی ننگی بھوکی زمین آنکھوں کے آگے سر سر کر رہی تھی۔''

''اجن میاں کے بیٹھکے کے دسیوں طاق قہقہوں سے بھر جاتے اور ان میں رکھے کاغذی پھولوں کے گلدان الٹ پلٹ جاتے۔ موکھوں میں بیٹھی گوریاں پھڑ پھڑ کر کے اڑ جاتیں۔''

ایسے تخلیقی و فنکارانہ جملوں سے یہ افسانے بھرے پڑے ہیں۔ اس سے دو باتیں نکلتی ہیں کہ ایسے جملے افسانے کی دلکشی ہی نہیں کیفیت اور معنویت میں اضافے کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ بطخ، بلّی، گوریا، طاق، گلدان، کھیت، باغ وغیرہ ہماری روزمرہ کی ثقافت اور ارضیت کا اٹوٹ حصہ ہیں، اس سے افسانے کی اجنبیت ختم ہوتی اور مانوسیت بڑھتی ہے اور ایسے افسانے ہمارے اپنے اور آپ بیتی جیسے لگنے لگتے ہیں اور افسانے کا یہ فن پڑھالے جانے کا مزاج بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ مزاج، یہ انداز نئے افسانوں میں کم کم ہی نظر آتا ہے۔ تصور ارضیت سے محرومی اور روزمرہ کی سچی اور زمینی ثقافت سے عدم وابستگی یا دوری یا مشاہدے کی کمی اس کی وجہیں ہو سکتی ہیں جبکہ ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں یہ سب کچھ بڑے طمطراق کے ساتھ موجود ہے۔

ذکیہ کے یہاں نسوانی کردار بھی ہیں، نسوانی لب و لہجہ بھی ہے لیکن وہ صرف ضرورت کے تحت ورنہ سچ یہ ہے کہ ان کی کہانیوں کا مرکزی خیال، فلسفہ ان تمام خانہ بندیوں سے بالاتر کر کے انہیں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو جیسی بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔

یہ مجموعہ نام سے ''صدائے بازگشت'' ضرور ہے ورنہ اس میں حال کے مسائل اور آج کے معاملات ہیں اور وہ صدائیں اور بُکائیں ہیں جو ازل سے حضرت انسان کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔ بہر حال نسبتاً پرانے افسانہ نگار کا یہ مجموعہ نئے مجموعوں کی بھیڑ میں نہایت اہم، معنی خیز اور فکر انگیز مجموعہ ہے اسے افسانے کے تمام شائقین و ناقدین کو پڑھنا ہی چاہیے۔ خواتین افسانہ نگاروں کو بطور خاص تا کہ ان کے دائرہ فکر و عمل میں وسعت آ سکے۔

''کہانی سے ملاقات''

آصف فرخی
(کراچی)

اس راہ پر چلتے چلاتے کہانی سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ خدا بہتر جانے کہ اسے محض اتفاق سمجھا جائے یا قسمت کا لکھا (کہ اس کے علاوہ ہم میں سے کون پڑھ سکتا ہے؟ کم از کم میں تو نہیں!) مگر پچھلے دنوں ایک عجیب ماجرا پیش آیا۔ ہوا یہ کہ کتاب ہاتھ آئی لیکن اس طرح کہ ہاتھ لگائے نہ بنے۔ میں اتنی احتیاط سے پڑھتا رہا کہ کہیں جلدی ختم نہ ہو جائے۔ ایک دن اور ایک کہانی۔ ایک کہانی کے بعد اگلی کہانی۔ لیکن جیسے الف لیلہ کی داستان در داستان بھی آخرکار انجام رسیدہ ہو جاتی ہیں، یہ کتاب بھی پوری ہوگئی مگر میں اس کی کیفیت کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کیا دیکھا اور کیسا پایا۔

ان کے نام سے مجھے گمان تھا کہ ان صفحوں میں ان دیکھی حیرت ہوگی اور ان جانی منزلوں کا پتہ۔ وہ پہلے سے لکھ رہی ہوں گی مگر میری واقفیت پرانی نہیں ہے۔ چند برس پہلے میں نے ان کو بالاستعجاب پڑھنا شروع کیا جب ''شب خون'' میں ان کی ایک کہانی نے جیسے راستہ روک لیا۔ ''شب خون'' میں ان کی کہانیوں کا انتظار رہنے لگا اور ایک کہانی کے بعد سیری نہیں حاصل ہوتی تھی، جی چاہتا تھا کہ ایسی کہانیاں ابھی اور ہوں۔ پھر ''آج'' میں ایک تواتر کے ساتھ ان کو پڑھا تو جیسے بات بنی۔ ''آج کل'' میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھیں، دو ایک کہانیاں مجھے بھی ''دنیا زاد'' میں شائع کرنے کا موقع ملا جب ان سے رابطہ ممکن ہوا۔ بہرحال تعجب کم نہیں ہوا اور اب بھی یہ حال ہے کہ جس رسالے کی فہرست میں ان کا نام نظر آ جائے، باقی چیزیں چھوڑ کر نظر اسی طرف لپک جاتی ہے اور جب تک کہانی پڑھ نہ لوں، چین نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے کہ کہانی پڑھ کر بھی چین نہیں آیا۔ میرے لیے بہت سی کہانیوں کا پیش خیمہ ہے یہ نام ــــ ذکیہ مشہدی۔

ان کی کتاب ''منتخب افسانے'' موصول ہوئی تو میں نے اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر دیکھنا شروع کیا۔ کتاب کے فلیپ سے ان کی چند ایک سوانحی تفصیلات معلوم ہوئیں لیکن جو کام کی باتیں تھیں، وہ اپنی کہانیوں کی بُنت میں شامل کر چکی ہیں، باقی محض تھوڑے سے اور روکھے پھیکے حقائق ہیں۔ کہانیوں کے آخر میں سن تحریر دیا گیا ہے اور نہ ترتیب میں یہ خیال ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ چناں چہ ان کے فنی سفر اور ذہنی ارتقا کا اندازہ لگانا میرے لیے اساطیر کی تفتیش یا یوں سمجھیے کہ خرافات کی تلاش ہے۔ کہانی اور اس کی کیفیت اصل چیز ہیں اور میرے لیے یہی اہم ہیں۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ مواصلات کے سبب دنیا میں ایسا انقلاب آ گیا ہے کہ نہ دیکھا نہ سُنا۔ پلک جھپکتے میں کرّہ ارض کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیغامات کی ترسیل ممکن ہے اور فاصلے برائے نام رہ گئے ہیں۔ انقلاب کی یہ نوید ہماری ہنسی اڑاتی ہے کہ اس دور میں بھی ہندوستان پاکستان کے درمیان اردو رسالوں، کتابوں کی ترسیل کو بے انتہا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ دو ایک نسلیں ایک دوسرے سے بڑی حد تک بے خبری میں پروان چڑھی ہیں اور نامہ و پیام موقوف ہونے کے سبب ان کو اندازہ نہیں کہ سرحد کے اس طرف جو داستان بکھری ہوئی ہے اس میں اپنے اجزا بھی شامل ہیں۔ اس لیے چنداں تعجب کی بات نہیں کہ ذکیہ مشہدی کا نام میں نے اتنی دیر سے سُنا، اس سے بڑھ کر حیرت کا سبب یہ ہے کہ اس تمام صورت حال کے باوجود ان کے تھوڑے بہت افسانے پڑھنے کو مل گئے۔ اور میں ان کے بارے میں دریافت کی مسرّت کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ ان کو دریافت ہوئے بہت وقت ہو چکا۔ فلیپ پر درج تعارف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تقسیم کے پندرہ، بیس سال بعد لکھنے کا آغاز کیا ہوگا۔ یوں وہ حسن منظر، خالدہ حسین، اسد محمد خاں، مسعود اشعر، نکہت حسن اور اکرام اللہ سے کچھ عرصے کے بعد اور آج ادبی افق پر نمایاں لکھنے والوں جیسے سیّد محمد اشرف، خالد جاوید اور صدیق عالم سے پہلے اپنے ادبی سفر کا آغاز کر چکی ہوں گی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس ادبی سفر کی خبر اتنی دیر سے کیوں ہم تک پہنچی۔ ادبی رسالوں اور تنقیدی تجزیوں کے ذریعے سے ایسی غیر معمولی افسانہ نگار کے ورود کی نوید سننے میں نہیں آئی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، مہدی جعفر کے تنقیدی مقالے میں بڑے اشتیاق سے پڑھا کرتا تھا کہ ان کے ذریعے سے ہندوستان کے ان لکھنے والوں کی اطلاع بھی مل جایا کرتی تھی جن کی کہانیوں کے نام میرے لیے نامعلوم کی خبر بن جایا کرتے تھے اور پھر میں انھیں ڈھونڈا کرتا تھا۔ مہدی جعفر کی کتاب ''نئی افسانوی تقلیب'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی اور اس میں نئے پرانے ۱۹۲ افسانہ نگاروں کا ذکر ہے۔ اس دور میں ذکیہ مشہدی کیا لکھ رہی تھیں اور کیا کسی رجحان سے متاثر تھیں؟ ان چند کہانیوں کی بنیاد پر میرے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کہ انھوں نے کن لکھنے والوں کا اثر قبول کیا اور کن کے زیر سایہ فنّی ریاضت کے مرحلے طے کیے، بلکہ ایسی ساری باتیں غیر ضروری بھی ہیں۔ ان کے افسانے اپنے آپ میں مکمل ہیں، ایک بھرپور اور انوکھا گیشٹالٹ قائم کرتے ہیں اور اسی حیثیت میں پڑھے جانے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ذکیہ مشہدی کو پڑھنا آج کے بیک وقت حیرت انگیز اور اندوہ ناک تجربے سے گزرنا اور زندگی کی ناپائیداری کا درد سہنا ہے اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ذکیہ مشہدی کے منتخب افسانوں کا آغاز ''ماں'' جیسی تندوتیز اور اپنے آپ میں مکمل کہانی سے ہوتا ہے۔ غربت کی لکیر سے بہت نیچے رہ کر اپنی زندگی کی کشمکش سے گزرنے والی عورت اور اس کا سامنا ایک ایسے مرد سے برہم چاری ہونے کے باوجود تقدّس کے حصول سے دو چار ہاتھ دور ہی رہتا ہے۔ بے خانماں اور آزاد منش ہے مگر اسے کسی کے سہارے کی ایسی آرزو ہے کہ اس کے وجود کی گہرائیوں سے اچانک ابھر آتی ہے مگر اس نازک مرحلے سے چابک دست مصنّفہ

اس سہج انداز میں گزری ہیں کہ نہ وہ ان دونوں کرداروں کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں اور نہ اس آنچ کی لو کو کم کرتی ہیں۔ وہ پاکیزگی کی شکست پر فتح مند ہوتی ہیں اور نہ جسم کی بے محابا طلب پر خورسند۔ بال سے باریک اور تلوار سے تیز پُل صراط کا راستہ طے کرتا ہوا افسانہ اپنے منطقی انجام کو پہنچتا ہے کہ اخلاقی نظریے یا طبقاتی شعور کا واویلا ہوتا ہے اور نہ مجبوری و بے کسی کا ماتم، دونوں کردار اپنی اپنی صورت حال سے نمایاں ہوتے ہیں اور آخری فقرہ ''وہ ٹھنڈ سے سکڑی، نم دھواں دیتی تاریک صبح میں تیزی سے گم ہوگئے'' بڑے کاٹ دار اور precise انداز میں اپنا نقش قائم کر دیتا ہے۔

حیران پریشان کر دینے کے لیے یہ افسانہ بہت ہے۔ یقیناً یہ ان کے پختگی کے دور کی تحریر ہے۔ اس کے بعد چند افسانے ہیں جو فنی مہارت کے حامل ہیں مگر شاید ابتدائی کتابوں سے چنے گئے ہوں گے۔ مشرقی یوپی اور جون پور کا تاریخی اہمیت کا حامل شہر ان کہانیوں میں براہِ راست بیان کے مرحلے سے گزرے بغیر اس خوبی سے اجاگر ہوتا ہے کہ جیتے جاگتے کرداروں کے شانہ بشانہ ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ زوال آمادگی اور اس کے باوجود بوئے سلطانی ان مفلوک الحال اور بے حال کرداروں کی واردات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ان کی ناآسودگی اور جذباتی گھٹن بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مگر مصنّفہ کا لہجہ بلند بانگ ہوتا ہے اور نہ وہ جذباتیت کا شکار۔ وہ رقت خیزی پیدا کرنے کے لیے مصنوعی ذرائع کام میں لاتی ہیں اور نہ ادھ کچرے سماجی، سیاسی تجربے کے بوجھوں مارتی ہیں۔

ذکیہ مشہدی کا مشاہدہ کس قدر گہرا اور سماجی تبدیلیوں سے واقفیت کتنی تہہ دار ہے اس کا اندازہ ایک کے بعد دوسرے افسانے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''بھیڑیے سیکولر تھے'' اور ''ایک مکوڑے کی موت'' اس اعتبار سے مکمل افسانے ہیں جن کی ماہرانہ بُنت سیاسی تجزیے سے بہت آگے نکل کر گہرے طنز اور صرف ایک طبقے کی نہیں بلکہ انسانی وجود کے ایک منفرد مگر bleak vision میں ڈھل جاتی ہے کہ معاصر اردو افسانے میں ایسی کوئی اور مثال یاد نہیں آتی۔

ذکیہ مشہدی کے فن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی فن کاری عمدہ کہانیوں ہی میں نہیں، بظاہر سادہ کہانیوں میں بھی عیاں ہے۔ ''ماں'' اور ''بھیڑیے سیکولر تھے'' میں موضوع اور ''ایک مکوڑے کی موت'' میں برتاؤ (ٹریٹ منٹ) کی وجہ سے کہانی کے اندر ایک غیر معمولی سطح کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ احساس بھی اس بات کا مرہونِ منّت ہے کہ وہ اتنے غیر معمولی موضوعات کو سنسنی خیز نہیں بناتیں اور نہ کسی بات کو sensationalize کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کی طرح مجھے ان کی وہ کہانیاں بھی ایک عجیب سے صدمے سے دوچار کر دیتی ہیں جہاں سماجی تبدیلی، غربت کی لکیر کے نیچے، بہت نیچے زندگی بسر کر دینے والے کرداروں کے بجائے اشرافیہ طبقے کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ''بوئے سلطانی'' کا تو نام ہی خطرناک ہے اور بھید کھول کر رکھ دیتا ہے۔ ''گڑ روٹی'' بھی اپنے مضمرات میں ایسی ہی دہلا دینے والی کہانی ہے۔ اماں جان کا کردار سماجی تجزیے پر مبنی بیان کے ذریعے سامنے نہیں آتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی واقعاتی تفصیلات سے ابھرا ہے۔ اسی طرح گاؤں والوں کے ہاتھوں ان کے جاگیرداری ٹھسّے کی شکست کا حال بھی مکالموں اور تفصیلات کے حوالے سے معنی خلق کرتا ہے۔ زمین سے رشتہ بدلتا ہے تو کرداروں کی اپنی وجودی صورت حال بھی اتھل پتھل کا شکار ہو جاتی ہے۔ کہانی اپنے scope میں ایک طویل قصّے کے پھیلاؤ کی حامل ہے اور معمولی تفصیلات کے ذریعے کہانی کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بیانیہ اپنی سطح سے بلند ہو کر اونچے سُروں میں نہیں ڈھلتا تو اس میں کہیں ڈھیلا پن بھی نہیں آنے پاتا۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک کہانی سیدھے سبھاؤ حرکت کرتی جاتی ہے اور ثانوی کردار، جیسے گاؤں کے لوگ، اپنی اپنی جگہ چند مکالموں کے ذریعے اپنے کردار نبھائے جاتے ہیں۔ اس کہانی کی تحسین کے لیے اسے عناصر و اجزاء میں توڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمام عناصر ہم آہنگ ہو کر ایک ڈھلی ڈھلائی کہانی کی تشکیل کرتے ہیں جو اپنے آپ میں تسلّی بخش ہے اور زندگی کے اظہار (depiction) میں مکمل۔ اتنی سلاست و روانی کے ساتھ اس عمل کی تکمیل ذکیہ مشہدی کا فن ہے جو ان کہانیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان سے قدرے ہلکا مگر پھر بھی بہت تکلیف دہ افسانہ ''افعی'' ہے جس سے موجود طالب علموں کے ہاتھوں نوآموز اور نو وارد لڑکوں کی چھیڑ خانی اتنی تیزی کے ساتھ مذاق کی حدوں سے نکل کر ظلم و بربریت بن جاتی ہے کہ احساس بھی تب ہوتا ہے جب پانی سر سے اوپر گزر جاتا ہے:

''شٹ ہو گا سالا۔ لڑکی نے کہا...... یہ لوگ آج کل سر نیم نہیں لگا رہے ہیں۔''

''ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے یہاں شیڈیول کاسٹ ہوتی ہی نہیں ہے۔''

''کیا کہا؟ ذرا پھر سے بول۔ سالا مُلّا ہے۔'' ایک لڑکا بولا۔

''ابے یہ مُلّا سجے نام کب سے رکھنے لگے؟'' دوسرے نے لقمہ دیا۔

''۹۲ء میں اتنی پٹائی ہوئی کہ یہ دھوکا باز نام تک بدلنے لگے۔''

''کیا پتہ جھوٹ بول رہا ہو۔ پاجامہ کھلواؤ۔ پاجامہ......

''اور جو کٹوانا بھی بند کر دیا ہو تو؟ ہاہاہا......'' ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''ہمارا نام سید سنجر علی ہے۔ یہ نام ہمیشہ سے ہمارے یہاں ہوتا چلا آیا ہے۔ سجے نہیں سنجر......'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ کوشش کی کہ غصہ اور جھنجھلاہٹ آواز سے عیاں نہ ہوں۔ ہم اپنی شناخت چھپاتے نہیں ہیں۔''

''بڑا ڈھیٹ ہے یار۔ اب کیا اپنی شناخت بھی دکھا دے گا۔''

''اس کی پوری قوم ڈھیٹ ہے۔''

اپنی جگہ توجہ طلب سہی، ایسے اقتباسات میں بہر حال قباحت یہ ہے کہ ان سے بہر طور یہ اندازہ نہیں ہونے پاتا کہ یہ سطریں افسانے کی مجموعی فضا سے ہم آہنگ ہیں، الگ نہیں اور پورے افسانے کا تار و پود اسی طرح قائم کیا گیا ہے۔ افسانے کی ساخت اتنی بھرپور ہے کہ اس میں سے گوشت پوست کے ٹکڑے

کاٹ کر نکالے نہیں جاسکتے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس افسانے سے زیادہ کاری وار بعض دوسرے افسانے کرتے ہیں جو پوری کتاب میں رلے ملے ہیں اور انگریزی محاورے کے مطابق، زخمی انگوٹھے کی طرح الگ تھلگ نہیں۔ اس اعتبار سے میں یہاں پر ''تھوڑا سا کاغذ'' اور ''منظوروا'' کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔

''تھوڑا سا کاغذ'' میں واقعی تھوڑا سا کاغذ بھی بہت ہو جاتا ہے۔ ریشم پھوپی بڑے سلیقے کی خاتون تھیں، پوری زندگی اپنے خیالات اور مطمحِ نظر کے حساب سے گزاری۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد ان کے ورثاء وہ سارے رسالے، کتابیں ردی میں تول دیتے ہیں جو پھوپی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے اور جن کو وہ اپنی میراث گردانتی تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ تمام کتابیں اردو میں ہیں جو اس گھرانے کے بچوں کے لیے محض کیڑے مکوڑے ہیں، دیمک کے لیے خام مواد۔ پھوپی پرانی کتابوں کے ذخیرے پر ''خوبصورت چمڑے کی جلدیں'' چڑھوانا چاہتی ہیں تو بڑا سخت جملہ سننے کو ملتا ہے۔

''پھپھو کی جو بات ہے وہ نرالی۔'' اعظم نے مُنہ پھلا لیا۔ ''بھلا ان کتابوں پر مزید پیسہ پھینکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے کہتے ہیں گوبر میں گھی سکھانا۔''

پھپھو کو اس گوبر میں گھی سکھانے والے محاورے سے قلبی اذیت پہنچی۔ اس بیش قیمت اثاثے کو یہ آج کے نوجوان گوبر سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ انھوں نے گلے میں پھنستے ہوئے گولے کو نگلا۔۔۔''

اس مقام سے گزر کر افسانے کا انجام نوشتۂ دیوار بن کر سامنے آتا ہے جب ریشم پھوپی کا سارا اردو اثاثہ رڈی کے بھاؤ بک جاتا ہے اور وہ قبریں کروٹ لے کر رہ جاتی ہیں:

''ہاں انھیں، ری سائیکل کیا جائے گا۔ ان پر لکھے سارے حروف مٹ جائیں گے۔ لگدی بن کر ان کا کاغذ بنے گا۔ گورا کاغذ، لیکن کیا کوئی تھوڑا سا کاغذ اردو لکھنے کے لیے بھی مانگے گا، کوئی میر، کوئی غالب، کوئی فیض، کوئی عصمت، کوئی قرۃالعین؟''

ان کی بے چین روح چکراتی پھر رہی تھی۔۔۔''

کہانی کا انجام دل خراش سہی لیکن یہاں کہانی کے پردے میں سے مصنفہ خود اپنے آپ کو نمایاں کر دیتی ہے۔ ''منظوروا'' میں تلخ حقیقت کا بیان فنّی مہارت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا جب دور دراز ایودھیا میں بابری مسجد کا انہدام ایک محلے میں رسے بسے اور گھر کی عورتوں کے کام دوڑ دوڑ کرنے کے شائق منظوروا کو شناخت کے ایسے بحران میں مبتلا کر دیتا ہے جو اس کی جسمانی ساخت نے بھی نہیں کیا تھا۔ محلے کا ایک گروہ اس سے کہتا ہے کہ نعرہ لگاؤ، بابر کی اولاد، ہندوستان چھوڑ دو! دوسرا گروہ اس کو سکھاتا ہے کہ بابر کے نام کے ساتھ رحمت اللہ لگایا کر ادب کے ساتھ نام لیا جائے۔

کہنے سننے سے منظوروا نے بابر سے ناتہ جوڑ لیا، مگر یہ تعلق ادھورا ہی رہا:

''غریبوں کا خیال بھی کرتے ہوں گے تب تو۔۔۔۔'' منظوروا نے لقمہ دیا۔ ''کیا اچھا ہوتا جو ہم ان کے وقت میں پیدا ہوئے ہوتے۔ پھر تو ہماری شادی بھی ہو گئی ہوتی۔''

''ابے تُو جب بھی ویسا ہی رہتا۔ چمڑے کی مشک میں پانی بھر کر دلی کی تنگ گلیوں میں کٹورے بجاتا یا کسی گاؤں میں کھیت میں ہل چلاتا، یا پیٹھ پر بوجھ ڈھو رہا ہوتا۔ یہ کچھ نہیں تو پھر پیدل فوج میں سب سے آگے توپوں کا چبینا بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوتا۔''

''منظوروا از حد اداس ہو گیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر سارے دن کڑھتا رہا کہ وہ اگر بابر بادشاہ کے وقت میں ہوتا تو بادشاہ سلامت بھی اس کی قسمت کا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔ پھر بھی بادشاہ تو بادشاہ ٹھہرے ان کا نام ادب سے لینا ضروری ہے۔ وہ جا کر ترپاٹھی جی کے پوتوں کو سکھا آیا بابر علیہ الرحم اور خبردار جو بابر بادشاہ کا نام مٹانے کی بات کی ہے۔ پاپ چڑھے گا جہنم میں جاؤ گے۔ وہاں منظوروا نہیں ہوگا۔ ہاں! منظوروا تو جنت میں ہوگا بابر بادشاہ کے ساتھ۔ کندھے پر چڑھا کے تب کون لے جائے گا رام لیلا دکھانے۔''

منظوروا جنّت میں چلا گیا تو رام لیلا کون دکھائے گا؟ منظوروا جائے تو جائے کہاں؟ یہی ڈھلمل ہے یقینی اس کے لیے ایک بحران بن کر آتی ہے اور اس کی جان لے کر ٹلتی ہے۔ جس کا بیان مصنفہ نے بڑی دردمندی سے کیا ہے، جذباتیت یا جانب داری سے نہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر زیادہ پُر اثر ہے۔

اردو اور مسلمان، ایسے ڈھلے ڈھلائے افسانوں میں ان کے موضوعات بنتے ہیں لیکن ان کی حدود کا تعین نہیں کرتے نہ ان کی دل چسپیوں کا دائرہ قائم کر دیتے ہیں۔ ان کی واقعیت نگاری اور بصیرت کا احساس ان افسانوں میں ہوتا ہے جب وہ چند ہی لکیروں سے پورا خاکہ اجاگر کر دینے والے مصوّر کی طرح شدید غربت اور محرومی کا نقش قائم کر دیتی ہیں۔ خاص طور پر جب اس طرح محروم الارث ہونے والی اور افتادگانِ خاک میں دھکیل دی جانے والی ہستی ایک عورت کی ہو۔ زندگی سے دور کر کے حاشیے کی طرف ہنکا دی جانے والی عورتیں جو پھر بھی زندگی سے بھرپور ہیں___ ایسی عورتوں کا پورا ہجوم ذکیہ مشہدی کے صفحات سے اُمڈا پڑتا ہے، ہر ایک اپنی جگہ ناقابل فراموش، ہر ایک بے حد دکھ بھرے قصّوں کی پوٹلی اپنے سر پر اٹھائے ہوئے!

ان میں سے بہت سارے تو ضمنی کردار ہیں۔ ان کو سر چھپانے کے لیے زندگی کی چادر کی طرح اپنی کہانی بھی میسر نہیں آئی۔ لیکن یہ جب بھی اور جہاں بھی سامنے آتی ہیں، ایک ان مٹ اور ناقابل فراموش نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ پوری زندگی اور اپنی کہانی مل جائے تو ان کا کیا رنگ ہوتا ہے، ''کالے میگھا پانی دے'' جیسے کہانی میں دیکھیے جس کو اردو افسانے کا قاری بھلا کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

''سات دن سے بوڑھی کیتکی بخار میں ہلہلا رہی ہے۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف لگی ہوئی ہیں لیکن ایک لڑکی کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی

ہے جو گا رہی ہے۔۔۔ کالے میگھا پانی دے۔ پانی دے گُڑ دھانی دے۔
سب کے بیچ میں وہ لڑکی بھی تھی۔ نیچا سا بلاؤز اور کم گھیر والا چھینٹ کا گھا گھرا پہنے، لمبی سی چوٹی جُھلاتی تالیاں بجا بجا کر گاتی ہوئی۔۔۔ ''بھر دے تال تلّیا رے پیاسی میری گیّا رے۔ پیاسی میری گیّا رے۔''
یہ لڑکی اکثر کیتکی کے خوابوں میں آتی تھی۔ پہلے اس کی شکل بہت صاف ہوتی تھی۔ بالکل واضح۔ اس کی آواز بھی بڑی تیز اور صاف ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے کیتکی کی عمر بڑھ رہی تھی اس لڑکی کے نقوش غیر واضح ہوتے جا رہے تھے اور آواز جیسے، بہت دور سے آتی تھی مگر اس کی ایک چیز ہمیشہ بہت واضح ہوا کرتی تھی اور وہ تھی اس کے چہرے پر بھرپور مسرّت کی حکمرانی۔ مسرّت اس کی آواز سے بھی چھلکی پڑتی تھی اور کیتکی سوچتی تھی کہ کیا کبھی کوئی اتنا خوش رہ سکتا ہے؟''
خوابوں میں جھلک دکھلا جانے والی اس لڑکی کا روپ ہی کیتکی کی زندگی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے آخری بات یہی نکلتی ہے۔۔۔ کالے میگھا پانی دے۔ اس کا بیٹا رام ناتھ سمجھتا ہے کہ ''آخری وقت میں امّاں کا دماغ اُلٹ گیا ہے'' کیونکہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ بوڑھی کیتکی نے آخری دم میں اس لڑکی کو جا چھوا ہے۔ شاید وہ اس کی آنکھیں میچ لے تو وہ لڑکی بول اٹھے: کیا اختر الایمان تمہی ہو؟
یوں ذات کے ادھورے پن اور زندگی کے دکھ جھیلتی مسافت سے گزر کر تکمیل، نجات اور آگہی کے نزدیک پہنچ جاتی ہے۔
لیکن یہ تو گاڑھی علمی باتیں ہو گئیں۔ اس کہانی میں زبان کے انداز دیکھیے:
''کالے میگھا پانی دے۔ پانی دے گُڑ دھانی دے
بھر دے تال تلیا رے۔ پیاسی میری گیّا رے۔''
اور پھر اس سے آگے:
''کوّے کوّے ڈھول بجا، پیسے کی سیاہی لا ــــ سیاہی بیٹا رانی کی، جے ہو بڑھیا نانی کی''
لیکن اس کہانی میں گاتی، مسکراتی لڑکی کی طرح بوڑھی عورت کی جھلک بھی اپنی جگہ نا قابلِ فراموش ہے:
''کہیں مجھ جیسے بوڑھے لوگوں کی ماں ہوا کرتی ہے۔ میں جو پہلے ماں بنی اور پھر نانی اور دادی۔۔۔ مگر وہ جو تھی کھچڑی بالوں والی، لال پھولوں والی کُرتی اور لال کناری کی دھوتی پہنے، بڑا سا ٹیکہ لگائے۔ پیتل کی تھالی میں پھول اور سندور رکھ کر مندر جاتی اور اس کی بھی جو ماں تھی وہ بوڑھی۔۔۔ بغیر بلاؤز کے خالی ساڑی لپیٹے رہتی اور مہین کپڑے کے نیچے اس کی لمبی سوکھی چھاتیاں ایسی لگتی تھیں جیسے چھپّر کی بیل سے لٹکے وہ سوکھے کدّو جنھیں ماں بیجوں کے لیے چھوڑ دیا کرتی تھی۔''
دیہاتی بولی ٹھولی اور مختلف آہنگ تو کہانیوں میں جا بجا نظر آتے ہیں اور خوب بہار دکھاتے ہیں۔ مگر ''فضلو بابا تخ تخ'' جیسی کہانی کی تہ میں موجود کہانی کی طرف دیکھیے۔ افسانہ بڑے واضح سُر سے یوں شروع ہوتا ہے:
''صدیوں پہلے کی بات ہے یا کم از کم ایسا لگتا ہے کہ بچپن گزرے صدیاں بیت گئیں۔ تب میں اپنے بزرگوں کی گود میں گھس کر کہانیاں سُنا کرتی تھی۔۔۔'' اور ایک ایسی ہی گود میں کہانی کی فرمائش پوری ہوتی ہے۔
''سنو! ایک پہلوان تھا۔ نام تھا امیر و خان طمیر و خان، لنگڑ چمر چاخا خاں، چی وئی وئی۔ اب اگر تم اس نام کو دوہرا دو۔ تب تو کہانی سناؤں گا ورنہ تم فیل اور کہانی ختم۔۔۔''
بزرگ شرط ہار جاتے ہیں اور کہانی آگے چل پڑتی ہے۔ تب دوسرے پہلوان سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام تھا آلتو خاں فالتو خاں چراتے خاں مارتے خاں دونالیخاں بے دھڑک بچّے کو سنائی جانے والی کہانی میں زبان خود مکتفی ہو کر کرداروں کو جنم دیتی ہے جو اپنی زندگی حاصل کر لیتے ہیں اور دوسروں کی زندگی بھی اختیار کرنے لگتے ہیں۔ کہانی کا یہ رُخ بالکل ہی انوکھا ہے۔
ظاہر ہے کہ ذکیہ مشہدی کی اہمیت یہ نہیں ہے کہ انھوں نے کسی مشاق ایتھوگرافر کی طرح لوک گیت، لوک ریت کو محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن وہ اس اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ ان کو ایسے عناصر کی موجودگی کا احساس ہے اور ان میں موجود اجتماعی زندگی کے عکس کو آج کی واردات سے جوڑ سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی وہ اپنے بہت سے دوسرے معاصرین سے الگ نظر آتی ہیں۔
لیکن یہ کہانی تو راستہ روک لیتی ہے۔ گود میں بیٹھنے والی بچّی کی فرمائش پوری نہیں ہوتی، کہانی ادھوری رہ جاتی ہے۔ ''اس وقت کہانی میں ایسا اڑنگا لگا کہ کہانی ادھوری رہی تو وہ ہی گئی۔۔۔'' وہ خط لکھتی ہے کہ کہانی پوری کر دیں تو شمسی چچا کا جواب آتا ہے:
''کہانی کہیں خط میں لکھی جاتی ہے بے وقوف۔ کہانی تو آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ اسے پکڑو اور سناؤ۔۔۔''
بیان کار کے پردے میں سے مصنّفہ ایک بار پھر خود بول اٹھتی ہے:
''بعض واقعات کہیں گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں جیسے اس کہانی کا ادھورا پن جو آج بھی پھانس بن کر دماغ میں گڑا ہوا ہے۔ اور اب... ایک جبکہ میں خود آس پاس گھومتی کہانیوں کو پکڑ پکڑ دوسروں کو سناتی رہتی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس کہانی کو بھی خود ہی مکمل کر کے اپنے آپ کو سنا دوں تا کہ میرے اندر جو ننھی بچّی چھپی بیٹھی ہے وہ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔''
پھر یہ ادھوری کہانی ایک اور راستے پر چل پڑتی ہے۔ اب یہ فضلو اور تائی اماں کی کہانی ہے جن کے درمیان اکّے کی سواری پر مخاصمت جاری ہے جو خاموش جنگ نہیں رہتی، فریقین کے درمیان زبان درازی کا خوب مقابلہ ہوتا ہے۔ مگر تائی اماں، مر کر فضلو کو نیچا دکھا گئیں اور کہانی پھر اپنے فریم سے باہر نکل کر بیان کار کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے جہاں وہ کردار لمحۂ حال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ وقت ایک سا نہیں رہتا، حال کے اندر سے ماضی برآمد ہوتا ہے اور مستقبل کے کاندھوں پر گزرے ہوئے کل کا سر دھرا ہوا ہے، وقت کے اس طلسم کونے میں اگر کوئی چیز یقینی ہے تو کہانی جو ادھوری رہ گئی۔

کہانی کہنے سنانے کی یہ ادھوری، پوری کہانی اپنے طور پر وقت کی کہانی ہے، گزرا ہوا وقت جو کہانی کی صورت اختیار کر کے محفوظ رہتا ہے اور اس کی زبان اپنی جگہ دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ اس پیرایۂ بیان کے لیے بڑی مناسب ہے۔ یعنی وہ امرِ واقعہ اور کرداری ماجرے کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ ان کے اوپر چسپاں کی گئی ہے اور نہ ان سے نوچ کاٹ کر الگ کی جاسکتی ہے۔ ذکیہ مشہدی کی نثر اتنی بھرپور ہے کہ پہلی نظر میں خوب صورت نہیں معلوم ہوتی۔ کہانی کے باقی سارے عناصر سے قطعِ نظر کرتے ہوئے زبان اپنی طرف توجّہ منعطف نہیں کراتی۔ ان کے ہاں ایسے دل کش ٹکڑے یا purple patches نہیں ہیں جو دل آویز اقتباسات کے طور پر پیش کیے جاسکیں اور ہم مناظرِ فطرت کی تصویر کشی یا کرداروں کے سراپا پر عش عش کرتے رہ جائیں۔ بات کہتے کہتے ذکیہ مشہدی یوں پلٹتی ہیں کہ ایک کہانی کے حاشیے پر ایک اور کہانی لکھ دیتی ہیں۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ان صفحات سے جھلکی پڑ رہی ہیں:

''آنے والے کی صورت دیکھی تو پارہ اور چڑھ گیا۔ وہی تھا نیچے رہنے والا مُن مُسیا درزی۔ دو سال سے میں اسے جانتی ہوں لیکن آج تک نام نہیں پوچھا۔ اس کو دیکھ کر بس یہی ایک لفظ ذہن میں آتا ہے من مسیا بعض الفاظ کے معنی کچھ نہیں ہوتے پھر بھی وہ اس قدر پُراثر کیسے بن جاتے ہیں کہ جو تصوّر آپ کے ذہن میں ہو اس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیں جیسے جیسے بس یوں سمجھیے کہ من مسیا۔ ہے کوئی ماہرِ لسانیات جو اس کی جڑوں کی چھان بین کرے؟''

(افسانہ: لاٹھیوں والے)

''دیوی کو کسی کا انتظار نہیں تھا۔ شوہر، جانور، بچے، کسی کا بھی نہیں۔ کسی کا انتظار نہ ہو تو شام کیسی ڈراؤنی ہو جاتی ہے۔ کسی دیوانی عورت جیسی، بال کھولے، پل پل کاٹ کھانے کی دھمکی دیتی، اُوسر بنجر دھرتی جیسے بے مصرف، کسی بیوہ جیسی اداس۔''

(افسانہ: ٹوٹا ہوا خط)

میں نے ان اقتباسات کو یوں تو نشان زد کر دیا۔ لیکن ان کی پوری معنویت کہانی کے سیاق و سباق میں ظاہر ہوتی ہے، اس سے کٹ کر نہیں۔ یہ ذکیہ مشہدی کی پُرکاری کا ایک اور پہلو ہے۔ سماجی شعور ہو یا زبان کا غیر معمولی تخلیقی وفور، وہ کسی ایک عنصر کو کہانی کے اوپر حاوی نہیں آنے دیتیں۔ ان کی کہانی کی تکنیک ان مختلف النوع عناصر کی ہم آہنگی سے بنتی ہے، اور اس طرح کہ اپنے آپ نمایاں نہیں ہوتی۔ خود کو ان عناصر میں پنہاں اور پوشیدہ رکھتی ہے۔ یوں ذکیہ مشہدی اپنی ظاہری بے تکلفی اور ایک انداز کی artlessness کے باوجود فن کے لوازم کا شعور رکھنے والے (conscious-craft) فن کار ہیں۔

ان کی اس خوبی کی مثال کے طور پر پیش کرنے کے لیے ''بکسا'' بہت سیدھی کہانی ہے۔ جو دل کو چھو لینے والی نزاکت سے شروع ہوتی ہے مگر آخر میں آتے آتے قرینِ قیاس (predictable) اور واضح (obvious) ہو جاتی ہے۔ یہ تکنیک کی خامی سہی لیکن تکنیک کی کامیابی مرکزی کردار ''امّی'' کی بے زبانی اور چیزوں کو سینت سینت کر رکھنے، پھر ان میں اپنے وہ خواب پرانے پھولوں کی طرح رکھ دینے میں ہے، جس کا اندازہ بھی ان کے بچّوں کو ان کی موت سے پہلے نہیں ہو پاتا۔ بہت دھیمے پن کے ساتھ زندگی بھر جاری رہنے والی کہانی وقت کی گرد میں ختم ہو جاتی ہے، تب احساس ہوتا ہے بوکس کو بکسا کہنے والی اور گنوار معلوم ہونے والی امّی کے دل میں کسک باقی تھی۔ ایک ان کہی کہانی اور زندگی کی بظاہر معمولی تفصیلات میں ان کی پوری زندگی کو سمیٹ لینے میں ذکیہ مشہدی کا اصل فن ہے۔ چند صفحات میں وہ ایک پوری زندگی کو کشید کر لیتی ہیں، ایسی زندگی کو جو افلاس، محرومی، بے سہارا پن سے عبارت ہے ''بی بی کی نیاز'' کی اماں صاحب، ''ہر ہر گنگے'' کی لکھّی ایسے کرداروں کو پوری ہم دردی (empathy) سے اور جذباتیت یا احساسِ برتری کے بغیر چند صفحات میں سمیٹ لینے کے اس ہنر کی وجہ سے ذکیہ مشہدی میرے نزدیک چیخوف کے سے انداز کی حامل معلوم ہوتی ہیں۔ میں ان کو ولیم بڑیور اور ایلس منرو جیسے وقیع اور باکمال معاصر افسانہ نگاروں کے جھرمٹ میں دیکھتا ہوں جنھوں نے انگریزی ادب کے رواں منظر میں ناول جیسی مضبوط و مقبول صنف کے سامنے افسانے کا چراغ جلایا ہے۔ واقعیت نگاری سے مترادفات اور الگ وضع قطع کے تجربات کی پوری صدی کے بعد بھی چیخوف کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اگر چیخوف کو اردو غزل کے پرانے اساتذہ کی روایت میں ایک سلسلے کا بانی یا دبستان کا بنیاد گزار کہہ سکتے ہیں تو ذکیہ مشہدی کا ادبی سلسلۂ نسب بھی وہی ہے۔ اب سے ذرا پہلے کے افسانہ نگاروں میں ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین اپنے اپنے طور پر چیخوف کے معتقد رہے ہیں اور کیا عجب کہ ذکیہ مشہدی بھی ان کے جلو میں بقائے دوام کے دربار میں پہنچ جائیں جہاں افسانہ نگاری کے لیے مسند بہرحال موجود ہے، اور ذکیہ مشہدی جیسے افسانہ نگاروں کی وجہ سے قائم رہے گی۔

بین الاقوامی ادب کے ان دوسر برآوردہ افسانہ نگاروں میں سے آئرستان کا ولیم ٹریور عمر کے اور ادبی کیریئر کے حساب سے زیادہ سینئر ہیں۔ ان کی بین الاقوامی اثر پذیری کو بہت منفرد انداز میں ایک معاصر افسانہ نگار نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ چینی نژاد امریکی ادیبہ ژی یُن لی (Li Yiyun) نے اپنے دوسرے مجموعے کے ساتھ شامل ایک گفتگو میں کہا ہے کہ ''میں یہ سوچنا پسند کرتی ہوں کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں تاکہ وہ باہر نکل سکیں اور دوسری کہانیوں کے ساتھ بات کریں۔'' اس نے لکھا کہ ولیم ٹریور نے میری کہانیوں کے لیے وہ گنجائش بنائی کہ وہ بھی دنیا میں باہر آسکیں، اپنے طور پر قائم رہ سکیں، اس لیے میری کہانیاں مستقل طور پر ٹریور کی کہانیوں سے باتیں کرتی ہیں۔'' اس نے حوالہ دیا ہے کہ اس نے اپنی کہانی Gold Boy, Emerald Girl، جس پر اس کے اس مجموعے کا نام رکھا گیا ہے، خاص طور پر اس لیے لکھی گئی کہ ٹریور کی کہانی ''تین لوگ'' سے باتیں کر سکے۔

لی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کہانیاں بھی لوگوں کی طرح بہت

الگ تھلگ رہنا پسند نہیں کرتیں۔ان کو اچھا لگتا ہے کہ دوسری کہانیوں سے مکالمہ، گفتگو اور بعض دفعہ بحث مباحثہ بھی کرسکیں۔ چناں چہ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذکیہ مشہدی کی کہانیاں، اردو افسانے کی روایت سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ان کہانیوں کی بنیاد میں اس روایات کا خمیر شامل ہے اور اس کے نئے امکانات بھی۔

عالمی ادب کے محض دو ناموں پر اکتفا کرنے میں ظاہر ہے کہ میں ایک طرح کی سادہ بیانی کا مرتکب ہو رہا ہوں، مگر محض اپنی دلیل قائم کرنے کی خاطر کئی نام اور ذہن میں آسکتے ہیں۔ روس کی Ludmilla Petrushevskaya بہت باکمال افسانہ نگار ہے مگر مختلف وضع کی۔انگریزی زبان و ادب میں ٹریور اور منرو کے نام برابر آتے ہیں۔ ولیم ٹریور اپنی وضع کا کامیاب ناول نگار ہے مگر ایلس منرو نے افسانوں پر اکتفا کیا ہے۔ ناول کے بجائے اس کے ہاں سلسلہ وار کہانیاں ملتی ہیں۔ جن میں کردار ایک افسانے سے دوسرے تک مسافت طے کرتے ہیں، مگر زمانی تسلسل کو توڑ کر۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ دورِ جدید میں کوئی شاعر نظم لکھنے کے بجائے غزلِ مسلسل لکھ ڈالے۔مگر یہ بھی ایلس مُنرو کا انداز ہے۔ میری رائے میں یہ عین ممکن ہے کہ آنے والا زمانہ اس کے افسانے The Mountain the Over Came Bear کو فنّی شاہکار کا درجہ دے دے جس طرح آج ہم چیخوف کے the with Lady Lapdog یا جیمز جوئس کے ''ڈبلنرز'' کو قرار دیتے ہیں۔ دورِ حاضر کے صاحبِ کمال قلم کار جوناتھن فرینزن نے اسی لیے لکھا ہے کہ ایلس منرو بشارت یا دریافت کے لمحے (epiphany) پر ارتکاز نہیں کرتی بلکہ اسے ڈرامائی عمل کی جستجو ہے اور اسی لیے کہانی کے معنی اس وقت تک دریافت نہیں کیے جاسکتے۔ تاوقتیکہ آپ اس کے ہر موڑ کا ساتھ دیں۔فرینزن کے بقول، منرو آخری دو چار صفحوں میں جا کر کمرے کی ساری بتّیاں کھول دیتی ہے۔ بات بہت خوبصورت ہے لیکن گھپ اندھیروں میں چلتے چلتے اچانک روشنی میں نہا جائیں، منرو کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ بہت کچھ پھر بھی اندھیرے میں رہ جاتا ہے جو دوبارہ پڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس سے مختلف سطح پر ذکیہ مشہدی کے افسانے بھی کئی بار پڑھے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اپنی معنویت کا نقش مکمل کرتے ہیں۔

ایلس منرو سے دوبارہ واپس اپنے مآخذ کی طرف جاتے ہوئے چیخوف کے بارے میں پھر کہنا چاہوں گا کہ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔ افسانہ نگاری میں اس کی حیثیت دبستان کے بنیاد گزار کی سی ہے اور اس بات کا بین الاقوامی سطح پر برملا اعتراف کیا جاتا رہا ہے لیکن اس سے مختلف اور اپنی جگہ بہت مستحکم اسلوب گوگول کا ہے جسے افسانے میں ایک اور اسلوب کا بنیاد گزار سمجھنا چاہیے۔ گوگول کے استادِ فن کا اعتراف و تجزیہ اس قدر نہیں ہوتا جس کا وہ مستحق ہے اور نہ اس کے اسلوب کو افسانے کے ایک علیحدہ دبستان کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔لیکن یہ داستان طولانی ہے، یار زندہ صحبت باقی۔

کامیاب تر افسانوں کا نام لینے کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ذکیہ مشہدی کی کوئی ایک چھاپ نہیں ہے، یہ ان کی کامیابی کی ایک اور دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کئی رنگوں میں رنگ لیتی ہیں۔اگر ''لپا گو'' اور ''مرغ کی ایک ٹانگ'' جیسے افسانے فوراً ان خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں جن کا میں ذکر کرتا آیا ہوں تو ''چُرایا ہوا سُکھ'' ملاحظہ کیجیے جس کا انداز مختلف ہے۔موضوع بھی تیکھا ہے اور انداز بیان میں جھجک نہیں ہے۔ پوری کہانی تیز رنگوں سے تیار کرنے کے باوجود وہ عریاں نگاری کی طرف مائل نہیں ہوتیں۔اسے وضع احتیاط کہیے یا اپنی حدود کی پابندی۔اس کے باوجود افسانے میں ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔چھوٹی ہی سہی، یہ ایک الگ وضع کی کامیابی ہے۔

اس افسانے کا ذکر نکلا ہے تو میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اس مجموعے میں بعض افسانے کم زور معلوم ہوئے۔ظاہر ہے کہ یہ انتخاب ہے، اس لیے یہاں انھوں نے بہترین تحریروں کو جگہ دی ہے۔یا پھر کم از کم وہ تحریریں جو خود ان کی نظر میں یہ مقام رکھتی ہیں۔مجموعے کے آخر میں دو طویل تحریریں مجھے شک میں مبتلا کر دیتی ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ناول بننے کو تھیں اور رہ گئیں، پھر اس وجہ سے ان میں نقص آ گیا۔''قصّہ جانکی رمن پانڈے'' ان کی نمائندہ کہانی ہے اور کئی جگہ شائع ہوئی ہے۔لیکن جس زور سے اٹھتی ہے، آخر آخر میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ابھی تو اور گنجائش باقی تھی، مصنّفہ نے جلدی ہاتھ روک لیا۔اس سے بھی بڑھ کر یہ ماجرا 'محمود و ایاز' کا بھی ہے۔ پوری کہانی ایسا لگتا ہے کہ ہلکے ہاتھ سے لکھی گئی ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح ان کے سارے مجموعے فراہم ہو جائیں تو میں باقی ماندہ کہانیوں کو بھی پڑھ کر دیکھوں کہ ان کی کاری گری بلکہ بخیہ گری الٹی طرف سے کیسی نظر آتی ہے اور مہارت کے کون سے راز افشا ہوتے ہیں۔لیکن اس خواہش کا بنیادی سبب افسانے میں خوب سے خوب تر کی تلاش نہیں بلکہ ایک طرف کی ناقدانہ سفلگی سے بڑھ کر کچھ اور نہیں۔ذکیہ مشہدی کی کامیابی کے نقش کو مستحکم رکھنے کے لیے یہ افسانے تھوڑے نہیں، بہت ہیں۔

کہانی سے ملاقات بس ایک بار کی نہیں ہوتی۔

یہ ملاقات دیر تک، دور تک ساتھ چل سکتی ہے، اور اچھی کہانی تو زندگی میں ڈھل کر زندگی بن جاتی ہے۔ذکیہ مشہدی کی کہانیوں کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ ایک بار حیران کر دینے کے بعد وہ کہانیاں بار بار اپنی جانب بُلا رہی ہیں۔ بڑے التزام اور بہت شوق کے ساتھ میں نے یہ کہانیاں سہج سہج پڑھیں، پھر ان پر لکھنے کے ارادے سے قلم اٹھایا تو کہانیوں کی سرشاری کے ساتھ شاید یہ جذبہ بھی موجود تھا کہ یہاں کم ہی لوگ ان کہانیوں کو جانتے ہیں، اچھی کہانیوں کی خبر ملے گی اور ہم بھی اس بہانے سُرخ رو ٹھہریں گے۔خیر، اس کی نوبت تو کیا آتی۔ میں نے کتنے ہی دن اس کتاب کے ساتھ گزارنے اور اپنے طور پر اسے متاعِ کم یاب سمجھ کر کلیجے سے لگائے رہا۔لیکن کہانی بہر حال دو قدم آگے ہی رہتی ہے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ادھر میں نے مضمون کا ڈول ڈالا اور یہ دفتر سمیٹا ادھر ان کہانیوں سے ایک بار پھر ملاقات ہوگئی۔ ''پارسا بی بی کا بگھار'' کے نام سے ''آج'' کی کتابوں کی طرف سے ان کی منتخب

کہانیوں کا مجموعہ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ قارئین کے ایک نئے حلقے کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ رہے گا کہ میں نے دریافت کے سے جوش میں جو لکھا، یہ کہانیاں اس سے زیادہ کی حق دار ہیں۔ اس لیے چند اور باتیں اس کہانی کے تعلق سے۔

نام کے علاوہ دونوں کتابوں میں برائے نام فرق ہے۔ ''منتخب افسانے'' اور ''پارسا بی بی کا بگھار''، دونوں مجموعوں میں سے کسی پر درج نہیں کہ انتخاب کس نے کیا ہے۔ انتخاب جس کا بھی ہو، تھوڑی بہت داد فریاد کا تو وہ شخص بھی مستحق ہے۔ جیسے کہانی میں اگر کسی کردار کا نام نہ ہو تو اسے راوی سمجھ لیا جاتا ہے، اسی طرح ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ شاید انتخاب خود افسانہ نگار نے کیا ہوگا۔ حالاں کہ ہم جانتے ہیں افسانہ نگار لامحالہ اپنے فن پاروں کا بہترین پارکھ خود نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ کئی افسانہ نگاروں کے اپنے پسندیدہ افسانے ہوتے ہیں جو لازمی طور ان کے بہترین یا نمائندہ افسانے نہیں ہوتے۔ پھر اگر یہ انتخاب خود مصنّفہ نے کیا ہے تو دونوں کتابوں میں تھوڑا بہت فرق کیسے آ گیا؟ کیا ایک بار نظر چوک گئی تھی۔ اگر اس بات کا بھی کچھ اتہ پتہ مل جاتا تو تجسّس کو اطمینان حاصل ہو جاتا مگر تجسّس بہر حال تنقیدی اوزار نہیں ہے اور یوں بھی ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میرا غالب احساس سرخوشی اور سرشاری کا ہے، اس لیے شکایت کی گنجائش نہیں۔

دونوں مجموعوں میں یہ ہوا ہے کہ کہیں کوئی کہانی گھٹ گئی ہے اور کہیں دوسری کہانی بڑھ گئی ہے۔ ''پارسا بی بی کا بگھار'' اس نام کی کہانی پر کراچی والے مجموعے کا نام رکھا گیا ہے مگر ہندوستانی انتخاب میں یہ کہانی شامل نہیں۔ حالاں کہ یہ کئی اعتبار سے اہم معلوم ہوتی ہے۔ یہ ان کی شاید طویل ترین کہانیوں میں سے ایک ہے اور محض صفحات کی تعداد کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل تک کامیابی سے سفر طے کرنے کی وجہ سے اس کا دائرۂ عمل یا Scope بھی ان کہانیوں سے زیادہ وسیع ہے جو ایک واقعے (incident) یا کردار کے پیچ و خم کے گرد گھومتی ہیں۔ کہانی اپنے اندر کسی طرح کی تشنگی نہیں رکھتی، یا پھر اس کی ماہرانہ بُنت کی وجہ سے خیال آتا ہے کہ مصنّفہ کو ناول کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اس کہانی میں نہیں تو کسی اور موقع پر سہی۔ مختلف جزئیات کو جوڑ کر ایک نقش قائم کرنے کا ہنر جیسی کامیابی کے ساتھ ذکیہ مشہدی نے یہاں برتا ہے، خود اپنی دوسری کہانیوں میں اس تسلسل اور ارتباط کے ساتھ نہیں کیا۔ شاید اس لیے نہیں کیا کہ ان کہانیوں کو پھیلاؤ دینا ان کا مقصد نہیں تھا اور نہ وہ اس ہنر میں بھی یکتا ہیں۔

بعض کہانیوں کی غیر موجودگی کراچی والے انتخاب میں کھٹکتی ہے لیکن اس کی تلافی یوں ہو جاتی ہے کہ ایک آدھ کہانی یہاں ایسی مل جاتی ہے جو ہندوستان والے انتخاب میں شامل نہیں تھی۔ ''راکھ'' اپنی جگہ دل کو چھو لینے والی کہانی ہے اور اس کو پڑھ کر عصمت چغتائی کے افسانے ''گھونگھٹ'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں گوری بی، کالے میاں کے سامنے گھونگھٹ نہیں کھولتیں لیکن ان کے مرنے پر چوڑیاں توڑ ڈالتی ہیں۔ یہاں صورت حال آہستہ آہستہ build-up ہوتی ہے۔ عابد پھوپھا پاکستان چلے جاتے ہیں اور آخری وقت میں اس طرح واپس آتے ہیں کہ کہانی دھیمے سُر میں بڑھ کر اپنے انجام تک پہنچتی ہے، وہ انجام جس کا اندازہ پڑھنے والے کو ہے۔ اس کے باوجود صدمے سے دوچار کر دیتا ہے۔ ''گئے وقت کا ملبہ'' پڑھ کر جیلانی بانو کے افسانے یاد آتے ہیں، خاص طور پر نازک احساسات اور دھیمے ارتعاشات والے افسانے جو ان کے مجموعے ''پرایا گھر'' میں شامل ہیں اور شاید ایک کیفیت کے حامل۔ ''چاندی کے ہاتھ'' کی وہ ''قدرے ٹھگنی، گٹھے ہوئے بدن اور روکھے چہرے والی ادھیڑ عمر عورت''، قرۃ العین حیدر کے ''حسب نسب'' اور ''دل ربا'' جیسے واقعات میں ڈھل سکتی ہے۔ ان ناموں کو دہرانے سے میرا مقصد یہ دعویٰ کرنا نہیں ہے کہ ذکیہ مشہدی نے ان سے اثر قبول کیا ہے اگر چہ ایسا کرنا عین فطری بھی ہے اور صحت مند ادبی رویّے کی دلیل بھی۔ مگر میں جس خوبی کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہا ہوں وہ اس طرح ہے کہ ذکیہ مشہدی ان ممتاز افسانہ نگاروں سے مختلف اسلوب کی حامل ہونے کے باوجود اتنی انفرادیت کی حامل ہیں کہ اپنے طور پر ایسے مقامات پر بھی پہنچ جاتی ہیں۔ اپنے موضوع پر مکمل گرفت اور فن کی باریکیوں سے واقفیت کے بغیر ایسا کہاں ممکن تھا۔ اسی بات سے ذکیہ مشہدی کے ادبی مقام کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

پہلے میں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں جو لوگ افسانے لکھ دیے ہیں ان میں ذکیہ مشہدی ایک معزّز مقام کی حامل ہیں۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میری رائے ادھوری تھی۔ عصریت اور مقامیت کے دائرے سے نکل کر ذکیہ مشہدی کو اردو افسانے کی روایت کے اہم تر اور معتبر ناموں کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ ان کی کہانی میں پارسا بی بی جب دال بگھارنے بیٹھتی ہیں تو خوشبو اڑ کر سات آسمانوں تک پہنچتی ہے اور فرشتوں کو خبر مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ذکیہ مشہدی کہانی لکھنے بیٹھتی ہوں گی تو اس کی خوشبو سرحد کے دونوں طرف پھیل جاتی ہے کہ کہانی دیکھنے سننے کے لائق ہے اور پڑھنے میں اپنی جگہ منفرد۔

''اُدھورا گلاس''

مشہور ادیب "ہنری مِلر" نے ایک مرتبہ پیرس میں کسی دکان پر سیب کا رس پیا گلاس لوٹاتے ہوئے اس نے دکاندار سے پوچھا_

"تم دن بھر کتنے سیبوں کا رس بیچ لیتے ہو؟_"

"تقریباً ایک من سیبوں کا_" دکاندار نے بتایا_

"میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں جس پر عمل کر کے تم تقریباً دو من سیبوں کا رس بیچ سکتے ہو_" ہنری نے کہا_

"کیسے؟_" دکاندار بے قرار ہو گیا_

"گلاس پورا بھر دیا کرو"

''نقشِ ناتمام''

محمد سلیم الرحمٰن
(کراچی)

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کی بہت قریب سے تحقیق کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اُن کے افسانے قابلیت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب انہیں اُردو میں افسانہ نگاری کا قابل ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

اُن کے افسانوں میں نمایاں موضوعات بہت سارے نہیں ہیں لیکن اُن کی واضح طور پر نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ کچھ عالمگیر نوعیت کے ہیں اور کچھ بہت عام ہیں لیکن مقامی لوگوں کے موضوعات سے جڑے ہوئے ہیں اور کچھ مقامی لوگوں کی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں جو آج کل بھارت میں غالب ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات آسان نہیں ہیں بلکہ یہ مذہبی، ثقافتی اور سیاسی اثرات میں اتنے پیچیدہ ہیں کہ واضح نقطۂ نظر دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے چیلنج کمزور نہیں ہوتے بلکہ طاقتور اور صلاحیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ آج کل ایک ناخوشگوار فقرہ روزمرہ استعمال میں آ رہا ہے یہ ہے نسل کا فرق۔ یہ ہماری جدید زندگی کے پہلوؤں میں سے ایک ہے جسے ذکیہ مشہدی بہت عقلمندی سے سنبھال لیتی ہیں۔ درحقیقت موجودہ حالات میں اس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ایسی کوئی چیز ماضی میں نہیں تھی ہر نسل کسی نہ کسی طرح گزشتہ نسل سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ معمولی فسادات یا عجیب قسم کے انحراف معمولی ہلچل سے ختم کر دیے جاتے تھے۔ ان مسائل کا اتنا آسانی سے حل اب ممکن نہیں رہا۔

جس تیزی سے دنیا ان پچاس سالوں میں تبدیل ہوئی ہے اتنی ہی تیزی سے نسل کے فرق کے بارے میں پچھلے کچھ عرصہ سے سننے کو ملا ہے۔ نسلی فرق ہندسی سلسلے سے بڑھ رہا ہے۔ جب یہ فرق 4 سے 8 اور 8 سے 16 تک جائے گا تو بہت ساری چیزیں شاید اگلے پچاس سالوں میں بگڑ جائیں گی۔ وہ کیسی صورت حال ہو گی یہ سوچ سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ یہ دراڑ بڑھتی جا رہی ہے اور روایتی عمارت کی بنیاد بربادی کے دہانے پر ہے۔ ساری افسوس ناک صورت حال ''پارسا بی بی کا بگھار'' میں بہت اچھی طرح بتائی گئی ہے۔ اور یہ ایک طویل کہانی ہے اور ذکیہ کی اس مسئلے کی بہت اچھی دریافت ہے۔

ایسی اور بھی کہانیاں ہیں جو کسی نہ کسی طرح اسی مسئلے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان میں بزرگوں نے خوبیوں اور خامیوں کو بہت خوبصورتی سے سنبھالا ہے اور نئی نسل نے اسے فضول چیز سمجھ کر رد کر دیا ہے۔

اس نسل میں جس چیز کو سرسری طور پر دھوکہ دیا گیا ہے وہ اردو زبان ہے۔ ایک ایسی فرسودہ میراث جواب بامقصد نہیں رہی۔ ہر جگہ جوان نسل کی اردو سے کوئی خاص دشمنی نظر آتی ہے خاص طور پر بچے اسے غیر مبہم طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ وہ اسے ہیچ سمجھتے ہیں اور انگریزی کے پرستار ہیں حالانکہ وہ اس میں زیادہ ماہر نہیں ہیں۔ کرنا کیا ہے اس کی تلخیص بہت اچھی طرح سے ''فدا علی، کریلے اور اُردو'' کی کہانی میں ہے جو ایک مزاحیہ، طنزیہ اور ہنگامہ خیز کہانی ہے۔

دوسری کہانیاں کنندہ کار مسائل سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ خون خرابے کی طرف تو نہیں لے کے جاتی لیکن ایک دشمنی کا سا ماحول بنا دیتی ہیں۔ یہ مسئلہ ہندوستانی سیاق و سباق میں کافی سیدھا نظر آتا ہے۔ ایک ہراساں اقلیت کی طرح کسی حد تک وقار کے ساتھ رہنے کے لیے جو کہ اصلی یا خیالی پرانی روایات کا سامنا کرتی ہے جبکہ وہ اقتدار میں نہیں ہے۔ یہ ذکیہ کے افسانوں کا دوبارہ استعمال شدہ تصور ہے۔ اصل میں اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ ایک بے مزہ حیاتیات ہے یا اسے بے مزہ میراث بھی کہا جا سکتا ہے۔ بداعتمادی کا حال اتنا زیادہ اور دم گھٹنے والا ہے کہ نہ تو مسلمان اور نہ ہی ہندو اس کے بارے میں کچھ کر سکتے ہیں۔

شمالی ہندوستان کے ہر اہم شہر اور قصبے میں مسلم حراستی علاقے ہیں جنہیں ''چھوٹا پاکستان'' کہا جاتا ہے اور انہیں فسادات کی پیداوار کہا جاتا ہے جس سے ہندوؤں کو ڈرایا جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا آسان افسانہ جس سے مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے۔ ذکیہ اس ناخوشگوار سنگدلی کو لاتعلقی سے دیکھتی ہیں۔ سب سے بہترین کہانی اس سیاق و سباق میں بغیر کسی بحث کے ''سدائے بازگشت'' ہے جس میں ایک اچھی مسلمان فیملی جو کہ ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر ہوتی ہے، انہیں فسادات کے الزام میں گھر بیچ کر ''چھوٹے پاکستان'' میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وہاں اُن کی آمد مزاحیہ خبر بنا دی جاتی ہے۔

یا یہ کہانی جس کا موضوع ہے ''بھیڑیے سیکولر تھے'' اس کہانی میں دیسی روزمرہ زندگی بھیڑیوں کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے جو کہ بچوں اور جوان عورتوں کا شکار کرتے ہیں اور انہیں نشانہ بناتے ہیں۔ اصل میں کسی نے ان بھیڑیوں کو دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن تصور کیا جاتا تھا کہ وہی اس تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ پھر ایک دن کچھ عقلمند لڑکوں کو پتہ چلا کہ اب تک اس تباہی کے جو بھی شکار ہوئے ہیں وہ ہندو ہیں۔ اس طرح یہ پتہ چلا کہ اس سب تباہی کے ذمہ دار بھیڑیے نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ یہ سب کر رہے ہیں۔ ایک خوفناک خون خرابے کے لیے میدان سج چکا ہے۔ خوش قسمتی سے بھیڑیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کے لیے ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان سکون کا خون خرابہ کرنا چاہتے تھے۔

ذکیہ کی کہانیوں میں جو سب سے زیادہ تنگ کرنے والا مسئلہ ہے وہ بین الامذہبی شادیوں کا ہے جس میں بیوی مسلمان ہوتی ہے۔ یہاں یہ ایک اَن سُنی چیز ہے بلکہ اسے ممنوع ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تمام فرقے اختلاف میں لگتے ہیں

باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے

پارسا بی بی کا بگھار

ڈاکٹر ارجمند آرا
(دہلی)

یہ دنیا یوں ہی چلتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کی دنیا۔۔۔ اپنی سست رفتار بیداری اور ریڈیکل فیمنسٹ تحریکوں کے باوجود پارسا بی بی کی جدوجہد باورچی خانوں اور امورِ خانہ داری تک ہی محدود رہتی ہے۔ وہ عورتیں جو تحریکیں چلاتی ہیں اور سڑکوں، فٹ پاتھوں پر مظاہرے کرتی ہیں شام کو گھر لوٹ کر اپنے پیارے شوہروں اور جگر گوشوں کے لیے پارسا بی بی بن جاتی ہیں۔ جا کر اُرہر کی سنہری سنہری دال، بگھارتی ہیں جس کی سوندھی خوشبو سے دور قریب کے حلقے معطر ہو جاتے ہیں۔ کہیں ان کی خوبیوں اور سگھڑ پن کا گن گان کیا جاتا ہے، کہیں دیوی بنا کر پوجی جاتی ہیں یا پھر اس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ اگر بگھار جل جائے تو؟ اس پھوہڑ پن پر وہ گالیاں کھاتی ہیں۔ لات گھونسے بھی۔

گھر کے اندر نام نہاد گوشۂ عافیت میں دیوی اور ڈائن کے فریموں میں جڑی ہوئی یہ عورتیں آخر ایسا کیا کریں کہ ان دو باہم متضاد فریموں سے نکل کر جیتی جاگتی ہستی بن جائیں؟ ایسا کیا کریں کہ مرد اساس اخلاقیات کے احتساب اور توقعات کے پیمانوں کو بدل ڈالیں تاکہ صرف انسان بنی رہ سکیں؟ اپنی تمام تر کمزوریوں اور قوتوں کے ساتھ معاشرے میں وہ بھی اسی طرح قبول کی جائیں جیسے ان کی ''جنسِ مخالف'' کو قبول کیا جاتا ہے؟ اس سے جنمی گھٹن میں جو صرف انہی کے لیے مختص ہے وہ کون سا طریقہ اختیار کریں کہ ان کی زندگی میں بھی تھوڑے سکون اور تھوڑی فراغت کی کچھ ایسی گھڑیاں میسر آ جائیں جن میں وہ بھی اپنی پسند کے کام کر سکیں؟ خواہ سیر و تفریح، خواہ کتاب، قلم یا برش پکڑنا۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ جو جی میں آئے۔ احساسِ آزادی کے ساتھ، سکون اور یکسوئی کی چند ساعتوں میں۔

بیداری کے مختلف ادوار میں باغی عورتوں کی ساری جدوجہد شاید اپنے حصے کی انہی چند ساعتوں کے لیے رہی ہوگی تاکہ وہ اپنے لیے معاشرے میں کوئی مقام، کچھ وقار کما سکیں!

ہمارے ملک میں ''بیٹی بچاؤ'' کا نعرہ آج ایک مقبولِ عام نعرہ ہے جسے سرکار وسیع پیمانے پر عورتوں کے امپاورمنٹ کے لیے استعمال کر رہی لیکن ظاہر ہے اس نعرے کی لفظیات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کو پڑھاؤ۔ پڑھ لکھ کر زیادہ بولے تو گولی سے اڑاؤ۔ تو یہ ہے ہمارا معاشرہ جس نے بہت ترقی کر لی ہے اور عورتوں کو اپنی پسند کی زندگی چننے کی بہت سی آزادیاں دے دی ہیں۔ لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ معاشرہ ابھی صرف انہی عورتوں کو قبول کر رہا ہے جو جدید معیشت کی آگ میں جھونکنے کے لیے زیادہ جدید قسم کا ایندھن بن سکیں؟ ایسے معاشرے میں عام عورتوں کی تقویت کی بات کون کر سکتا ہے جب کہ مقتدر طبقے تک میں لوگوں کا رویہ یہ ہو کہ بیوروکریٹ، ٹیکنوکریٹ، ڈاکٹر، انجینئر، سافٹ ویئر ڈیولپر عورتیں یقیناً قابلِ قبول (تاکہ یہ نظام انہیں کنزیوم کر سکے) لیکن بیدار ذہنی؟ نہ بابا نہ۔ بیدار ذہن عورتوں کے علاج کے لیے ہمارے پاس زیادہ بری بری گالیاں اور زیادہ مہلک گولیاں موجود ہیں۔ کبھی یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا سارا ماڈرنزم ہمیں ایک کہیں زیادہ شدید استحصالی نظام کی طرف نہیں دھکیل رہا ہے؟

ظاہر ہے کہ عدل اور مساوات کے مسائل صرف عورتوں تک محدود دنیا پر مرکوز نہیں، بلکہ سماج کا ہر کمزور طبقہ ان سے دوچار ہے۔ لیکن عورتوں کا سوال زیادہ گہرا اس لیے ہے کہ سماجی تفریق کے موجودہ نظام میں ان پر دوہری مار پڑتی ہے۔ نسلی، طبقاتی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی تعصّبات سے گزرنے کے ساتھ ساتھ عورت ہونے کا زیاں انہیں الگ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عمودی اور افقی دونوں طرح کی نابرابری میں جینا کوئی آسان کام تو نہیں!

تصادمات کی اس دنیا کا ایک عجب پہلو یہ ہے کہ بیداری اور جدوجہد جتنی بڑھتی ہے سماجی پریشرز کا جال اتنا ہی پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، کستا جاتا ہے۔ خصوصاً ذی شعور اور بیدار ذہن عورتیں خود کو ایسی دلدل کے وسط میں پاتی ہیں جس میں سے نکلنے کی ہر کوشش انہیں مزید مشکلوں سے دوچار کرتی ہیں۔ ان کے گرد یہ دلدل کس نے تعمیر کی؟ کیوں تعمیر کی؟ ظاہر ہے اس لیے کہ ایک استحصالی نظام میں ان کی بیدار مغزی اسی طرح کا بڑا خطرہ ہے جیسا کہ دوسرے محکوموں کی بیداری ان کے حاکموں کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ ایسے میں جدوجہد۔۔۔ بقا کی جنگ۔۔۔ تو جاری رہے گی ہی۔

یہ اور ایسے ہی سوال شاید ان سب کو ستاتے ہیں جو آنکھیں کھول کے دنیا کی لیلا کو دیکھ سکتا ہو۔ ذکیہ مشہدی کا ناولٹ ''پارسا بی بی کا بگھار'' میں نے اسی ذہنی تحفظ کے ساتھ پڑھنا شروع کیا کہ دیکھوں عورت کی بقا اور آزادی کے بنیادی سوالوں کو وہ کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ہم سب مشرقی عورتوں کی طرح ذکیہ مشہدی نے بھی سماج کی سخت روایات اور پابندیوں میں رہ کر ہی اپنی پسند سے جینے کا گوشہ تراشا ہے۔ اپنا گوشہ تعمیر کرنے میں بعض اوقات کیا قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں، اپنی شناخت بنانے میں کتنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، بلکہ ضائع کرنا پڑتا ہے، اس کی بھی ایک الگ کہانی ہوتی ہے جو زیادہ تر اَن کہی رہ جاتی ہے۔ شاید اس کی منضبط تاریخ کو سامنے آنے میں وقت لگے گا لیکن یہی کیا کم ہے کہ عورتیں اپنے اپنے گوشے تراش رہی ہیں! اپنے حصے کا ایک آسمان جس میں وہ آزادی سے اڑان بھرتی ہیں!

معاشرے کے جلتے ہوئے سوالوں کو ذہن میں رکھے بغیر ادب کو پڑھنا میرے نزدیک وقت گزاری کے عمل سے زیادہ کچھ تحریریں ہمارے لیے ایسا ہی آبِ حیات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ذکیہ مشہدی اردو فکشن کی بہت معتبر آواز ہیں۔ اس احساس کے باوجود کہ یہ ایک گھسا پٹا جملہ ہے (کہ اردو میں اب بے بصیرت، ناخالق لکھاری بھی معتبر ادیب کہلاتے ہیں) میں ان کے فکشن سے جھلکتی حساسیت

اور کثیر رخی بصیرت کی وجہ سے اس کے استعمال پر مجبور ہوں۔ ذکیہ مشہدی کی کوئی کہانی جب بھی پڑھی تو اس نے بے چین بھی کیا، مسرور بھی کیوں کہ وہ محض کہانی نہیں لکھتیں بلکہ ہماری معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو پر ایک بیدار ذہن اور حساس ادیب کا ردِ عمل پیش کرتی ہیں۔ وہ سوچنا سکھاتی ہیں، سوال قائم کرنا سکھاتی ہیں اور اتنی ہمت اور حوصلہ رکھتی ہیں کہ ''ماں'' جیسی پیچیدہ اور روایت شکن کہانیاں لکھ سکیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور تہہ دار ہے اور نقطۂ نظر ایسے جدید ذہن کا غماز کہ جو ایک بے ریا انسان دوستی اور شعورِ عدل کے سایے پر پروان چڑھتا ہے۔ ان کی تحریر کی یہ خوبیاں ایک زندہ فکشن میں زندہ معاشرے کے نشان بن جاتی ہیں۔

''پارسا بی بی کا بگھار'' ناولٹ کا میں یہاں تجزیہ کرنا نہیں چاہتی، اس پر تبصرہ کر کے قارئین کے تجسس کی لَو دھیمی نہیں کرنا چاہتی، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ بنیادی طور پر یہ کئی پیڑھیوں کی نمائندہ عورتوں کی بدلتی ہوئی زندگی کی کہانی ہے۔ دم بہ دم تبدیل ہوتے معاشرے میں الگ الگ نسل کی عورتوں کا معاشرتی اور ذہنی سفر۔ ان کی مختلف النوع جدوجہد اور بدلتے ہوئے خیالات اور رویے۔ اس لیے اس ناولٹ کو محض چند افراد کی زندگی اور مسائل تک محدود نہیں سمجھا جانا چاہیے بلکہ وسیع تر معاشرتی اور بین التہذیبی رشتوں کو ذکیہ مشہدی نے ناولٹ میں جس ماہرانہ توازن اور سان کے ساتھ سمیٹا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ ہندوستان کے کثیر تہذیبی پس منظر میں ان موضوعات کا نبھاؤ ہمیں احساس کراتا ہے کہ اپنے سماج کا ذکیہ مشہدی کا مشاہدہ کتنا گہرا اور تفہیم کتنی کثیر رخی ہے۔ یوں اس ناولٹ کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ ایک وسیع کینوس پر لطیف ترین جزئیات کے ساتھ، تصویریں ابھارنے کا کام کوئی مشاق اور حساس فنکار ہی کر سکتا ہے جن میں ایسے رنگ اور خطوط کہیں کھو نہ جائیں جنھیں زیادہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ تین نسلوں کی اس کہانی میں مختلف رنگوں اور خطوط کو ممیّز کرنے میں ذکیہ مشہدی کس طرح اور کتنی کامیاب ہیں اس کی تفہیم قارئین کی ژرف بینی پر ہے۔ لیکن اس میں کیا کلام کہ یہ ایک موثر بیانیہ ہے۔۔۔ بظاہر متوسط طبقے کے ایک خاندان کی اپنے روزمرہ کے معاملات سے نبرد آزمائی لیکن جو ذکیہ مشہدی کی سحر طراز انگلیوں میں برصغیر کے متوسط طبقے کی جہدِ زندگانی کا مہا بیانیہ بن گئی ہے۔ اس میں گزرے زمانے کی اقدار کا نسٹلجیا بھی ہے اور بدلتی ہوئی اقدار اور جدید طرزِ فکر میں عورت کی بقا اور رجا کا پیغام بھی۔ ایسا پیغام جو ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں آہستگی سے مستقبل کی کشتی میں سوار کرا دیتا ہے اور یوں ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

بقیہ : ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری

دیتے ہیں۔ کئی افسانہ نگاروں کا بھلا ہو جاتا ہے اور دو چار صفحوں میں چار چھے سے زیادہ افسانے بھی نپٹ جاتے ہیں۔ بہت سے افسانہ نگار اس سہولت کا فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ اور منی افسانہ یا افسانچہ اس لیے بھی سستا نسخہ ہے کہ اس میں بیانیہ کے کسی بھی عنصر کی اہمیت نہیں اور بیانیہ نگاری کے کسی اصول سے واقفیت ضروری نہیں۔ ابھی ہمارے ایک برطانوی دوست نے Pop Story کو ''پوپ کہانی'' کا نام دے کر منی افسانے یا افسانچے کا ایک اور رنگ پیش کیا ہے۔ افسانچے تو منٹو نے بھی لکھے تھے لیکن وہ چھوٹے سے چاقو کے نکیلے اور زہر میں بجھے ہوئے پھل کی طرح ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ کچھ چھوٹی سی بلکہ سطحی سی بات لکھ دی اور اس کا عنوان ''افسانچہ'' یا ''منی افسانہ'' مقرر کر دیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ذکیہ مشہدی نے زمانے کی ہوا کے ساتھ بہتے یا اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ ان کی فنکارانہ سا لمیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ہارڈی کے ناول The Woodlanders کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس ناول کا پلاٹ اور اس کے کردار سب ذہن سے محو ہو جائیں تو اس وقت بھی اس کی فضا اور ماحول ہمارے تخیل میں زندہ رہیں گے۔ ہارڈی کا ذکر آ گیا تو ایک بات اور کہوں کہ اس کے آخری زمانے میں ایک نوآمدہ انگریز شاعر اور نقاد R.S Thomas نے اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ایسی شاعری ہے جو express تو بہت کرتی ہے لیکن explain نہیں کرتی۔ ذکیہ مشہدی کے یہاں تھوڑا بہت explain کرنے کا شوق باقی ہے۔ لیکن ان کے گزشتہ دس سال کے افسانوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری کی انتہائی منزل تک آ گئی ہیں جہاں ان کا افسانہ محسوس کرنے سے زیادہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

بقیہ: نقشِ ناتمام

لیکن پیار کبھی کبھار اپنا مختلف راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ''قصہ جانکی رمن پانڈے'' میں ایک آدمی کی دو بیویاں ہوتی ہیں۔ ایک ہندو جو خاندان والوں کی مجبوری کی وجہ سے اس پر مسلط کی گئی اور ایک مسلمان بیوہ جس سے اُسے محبت ہو گئی تھی اُسے خوش کرنے کے لیے وہ اسلام بھی قبول کر لیتا ہے۔ اور اس میں کوئی فریب نہیں تھا وہ اپنے حال سے خوش تھا۔ نہ متعصب ہندو تھا اور نہ ہی نازک طبع مسلم۔ ذکیہ مشہدی اپنے افسانوں میں ایک بہت مستند اور حقیقت پسند مصنفہ ہیں انہیں بجا طور پر غریبوں، ضرورت مندوں اور معصوموں کے لیے حقیقت پسند مصنف کہا جا سکتا ہے۔

آج کے دور کی نمائندہ افسانہ نگار

ڈاکٹر محمد کاظم
(دہلی)

اردو زبان وادب کی خدمات میں خواتین کی خدمات سے چشم پوشی زیادتی ہوگی جوان کی سیاسی اور سماجی بصیرت، علمی شغف اور شعور کی پختگی کا بین ثبوت ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے عورت کے جذبات، احساسات اور جذبۂ ایثار کو ہمیشہ بڑی چابکدستی اور فن کاری سے پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی ہی نہیں بلکہ عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہے۔ اگر ہم پچھلی صدی میں ان کے لکھے رسالے اور مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان میں کتنی سیاسی اور سماجی بصیرت تھی۔ رشید النساء، سیدۃ النساء، صغریٰ ہمایوں، سردار محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی، فاطمہ بیگم وغیرہ کی تحریروں میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ ان تمام فنکاروں نے مختلف صورتوں میں اردو ادب کے سرمایے میں ناقابل فراموش اضافہ کیا۔

افسانے کے فن پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ پہلی بار مکمل طور پر افسانے کے پورے اجزائے ترکیبی رشید جہاں کے افسانے میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار خاتون ہے جنھوں نے 'انگارے' میں لکھا اور اس وقت لکھا جب عورت کو آج کی طرح اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں تھی گویا رشید جہاں نے عورتوں کو سماج سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے پر آمادہ کیا۔ رشید جہاں کا اثر عصمت چغتائی پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

نصف صدی پہلے جس انگارہ کو رشید جہاں نے روشن کیا، اسے شعلہ میں تبدیل کرنے میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں نے اہم کارنامہ انجام دیا اور موجودہ دور میں اس شعلہ کو نہ بجھنے والی آگ میں تبدیل کرنے کا کام جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، واجدہ تبسم، زاہدہ حنا اور ذکیہ مشہدی نے کیا۔ ان میں بھی پاکستان میں زاہدہ حنا اور ہندستان میں ذکیہ مشہدی زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہیں جس کی پیروی ترنم ریاض، غزال ضیغم وغیرہ کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ یہ تمام افسانہ نگار ادب عالیہ میں اپنا مقام متعین کر چکی ہیں اس لیے انھیں صرف خواتین افسانہ نگاروں کے زمرے میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہونا چاہیے۔ یہاں چونکہ مجھے ذکیہ مشہدی کے افسانے کے حوالے سے گفتگو کرنا ہے اس لیے خواتین افسان نگاروں کے حوالے سے ان کا نام بار بار آئے گا۔

اگر اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر نظر ڈالتے ہیں تو رشید جہاں کے بعد قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں میں وہ عورت دکھائی دیتی ہے جو جذباتی اور ذہنی طور پر طاقتور ہے۔ جو مرد اور مرد کی دنیا، دونوں کے ساتھ بلا جھجک قدم بڑھا رہی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے افسانے کو عورت کے ایسے کردار دیے جو دنیا کی تہذیب کو اور ان کی تبدیلیوں کو سمجھتی ہے۔ وہ باشعور صاحب رائے اور عالمی ادب اور تاریخ پر نظر رکھتی ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ممتاز شیریں کے افسانوں میں ایسی عورت آئی جو گھر سے نکل کر فرسودہ روایتوں سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے 'آتش رفتہ' اور 'بن باس' لکھ کر ادب کے قارئین اور ناقدین کو چونکا دیا۔ اسی طرح خالدہ اصغر، صالحہ عابد حسین، نذر سجاد حیدر یلدرم کے کام کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے کی سب سے مضبوط کڑی عصمت چغتائی ہے۔ عصمت نے اردو افسانے کو کئی سطحوں پر معیار بخشا۔ موضوع اور اس کی پیش کش پر ان کو جو کمال حاصل ہے اس دور میں وہ کمال صرف منٹو کو حاصل تھا۔ اکثر منٹو اور عصمت کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں نے ملک اور سماج کے تاریک پہلو کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نے اردو افسانے کو جتنے یادگار کردار اور افسانے دئے ہیں اب تک کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ عصمت کے یہاں عورتوں کے مسائل اور زبان کو برتنے کا جو عمل دکھائی دیتا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کا بے باکانہ رویہ نہ صرف ان کے معاصرین بلکہ اب تک افسانہ نگاروں کے لیے رہنمائی کا کام انجام دے رہا ہے۔ عصمت کی روح اور اس کے فن کو اگر موجودہ دور میں دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیں تو وہ زاہدہ حنا اور ذکیہ مشہدی کی شکل اور اس کے فن میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان تمام افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے نہ صرف اپنی شناخت رکھتی ہیں بلکہ اپنے دور کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند، بے باک اور باغی افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے فنِ افسانہ نگاری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ نہایت ہی دھیمے لہجے والی بے باک عورت دکھائی دیتی ہے۔ ان کی بے باکی اور باغیانہ پن کی وجہ یہ سماج ہے، جہاں عورتوں کا اس لے میں بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے سماج میں ذکیہ نے نہ صرف بے باکی سے اپنے خیالات کو مختلف شکل میں پیش کیا بلکہ افسانے کے فن کو نئے نئے موضوعات بھی عطا کیے ہیں۔ انھوں نے جو افسانے تحریر کیے وہ ہمارے سماج کا عکس ہیں نہ کہ تخیلاتی دنیا کی سیر۔

ذکیہ نے 1980 کے بعد افسانے لکھنا شروع کیے اور جلد ہی ان کے افسانے نے نہ صرف ادب کے سنجیدہ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی بلکہ افسانے کے اہم ناقدین نے بھی اسے سراہا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ذاتی گفتگو میں تو اکثر قارئین اور ناقدین نے ذکیہ پر گفتگو کی لیکن تحریری شکل میں کسی نے بھی خاطر خواہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں بھی نہ جانے کس کس پر تحقیقی مقالے لکھوائے گئے مگر میری دانست میں اب تک نہ تو کوئی مقالہ لکھا گیا اور نہ ہیں کسی مقالے میں ان کو خاطر خواہ جگہ دی گئی۔

ذکیہ مشہدی ایک ذمہ دار شہری ہیں اور انھوں نے جو بھی لکھا حقیقت پسندی کی انتہا تک لکھا۔ انھوں نے سماج کے مظلوم اور پسماندہ لوگوں کو انسان ہونے کا احساس دلایا۔ ان کے افسانوں میں انسان اور وقت کے مابین جدوجہد نظر آتی ہے۔ اکثر وہ ایسے موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں جس پر لکھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ وہ اس طرح کے اچھوتے موضوعات کہیں اور سے نہیں بلکہ اپنے سماج اور آس پاس سے لاتی ہیں۔ موضوع کے مل جانے پر اسے کہانی کے پیرایے میں ڈھالنے کا سلیقہ ہمارے بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی معمولی (Uncommon) موضوع کو افسانے میں ڈھالنا آسان کام نہیں ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے کے بعد ایک بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ جدید دور کی افسانہ نگار ہونے کے باوجود کلاسیکی اور جدید دونوں ہی انداز سے کہانیاں بیان کرتی ہیں۔ اور نہ صرف موضوعات بلکہ ہئیت اور اسلوب کے کامیاب تجربے کرتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذکیہ کے ہم عصروں نے کوئی منفرد کام نہیں کیا بلکہ ان کا دور اردو افسانے کا اہم دور کہلانے کا حامل ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں ایک طرف قرۃ العین حیدر، نیر مسعود، جوگندر پال، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، اقبال مجید، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار وغیرہ جیسے بزرگ قلم کار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری جانب جیلانی بانو، صغرا مہدی، زاہدہ حنا، دیوندر اسر، انور سجاد، انیس رفیع، صدیق عالم، شموئل احمد، سلام بن رزاق، خالد سہیل، ہرچرن چاؤلہ، حسین الحق، سید محمد اشرف، شوکت حیات، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، پیغام آفاقی، شفق، غضنفر، ترنم ریاض، اظہار الاسلام، لالی چودھری، شہیرہ مسرور، خورشید اکرم، احمد صغیر، مشتاق انجم، وغیرہ ان کے ساتھ ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو ایک خاص مقام تک پہنچانے کے ساتھ نئے اور کامیاب تجربے بھی کیے۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے کئی افسانہ نگار علامتوں کے کثرت استعمال کی وجہ سے کم پڑھے اور سمجھے گیے۔ یہی وہ دور ہے جس میں افسانے سے کہانی پن دور ہوتا چلا گیا۔ ذکیہ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تجربے بھی کیے اور افسانے میں کہانی پن کو بھی بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذکیہ مشہدی کے افسانے زیادہ تر افسانہ نگاروں سے نہ صرف بہتر ہیں بلکہ معیاری اور زیادہ پڑھے جانے والی بھی ہیں۔ اب تک ذکیہ مشہدی کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں کم وبیش ستر کہانیاں شامل ہیں جو نہ صرف اردو کے افسانوی ادب بلکہ اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں اضافہ ہے۔

ذکیہ مشہدی کی تمام کتابوں میں شامل افسانوں میں مظلوم اور مفلس انسان، پسماندہ طبقات اور استحصال کیے جانے والے لوگوں کے ساتھ ساتھ ایک عورت کے جذبات واحساسات، ان کی ذہنی کشمکش اور سماج میں پھیلی اتھل پتھل وغیرہ کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ذکیہ زندگی اور سماج سے آنکھیں نہیں چراتی بلکہ ان کا مقابلہ کرتی ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہے کہ جس نے زندگی سے آنکھیں چرائی وہ زندگی اور سماج کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان کی کہانیوں کے عنوان پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے افسانے کا عنوان اتنا متاثر کن رکھا ہے جو پہلی نظر میں اپنی جانب کھینچتا ہے۔ افسانوں کے عنوان اپنے اندر معنویت رکھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ کہانی تو ہم بعد میں پڑھتے ہیں پہلے افسانے کا عنوان ہمیں متاثر کرتا اور پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ افسانے کا عنوان جتنا جاذب ہوتا ہے۔ قاری افسانہ اتنی ہی دلچسپی سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔ ذکیہ کی کہانیاں اپنے عنوان کے ساتھ کہانی پن کے اعتبار سے بھی اپنی جانب ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکیہ مشہدی کہانی کے فن اور اس کے اسرار ورموز سے نہ صرف بخوبی واقف ہیں بلکہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ افسانہ نگاری کے اصول اور ایک افسانہ نگار کو کن نکات کا خیال رکھنا چاہئے اس پر ذکیہ مشہدی ان الفاظ میں روشنی ڈالتی ہیں:

''آج کا ادیب نہ زندگی سے آنکھیں چرا رہا ہے اور نہ چرا سکتا ہے۔ جس ادیب نے زندگی کو نظر انداز کیا اس کی تخلیقات اپنی طرف توجہ مبذول کرانے میں کامیاب نہیں ہوں گی۔''

''افسانہ نگار ہونے کے لیے صرف تین چیزیں ضروری ہیں۔ ایک حساس دل، زبان پر دسترس اور گرد وپیش سے آگاہی۔ اور ان خواص کے لیے ادیب کا اسکالر ہونا ضروری نہیں ہے۔ زندگی بذات خود ایک بہت بڑی درس گاہ ہے۔ اگر آپ کا دل حساس ہے اور نگاہ باریک بین تو بہت کچھ سیکھ لیجئے گا۔''

(تاریک راہوں کے مسافر: قارئین سے...)

اس روشنی میں ذکیہ مشہدی کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں کہانی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی دکھائی دیتی ہے۔ جس درد کا احساس افسانہ نگار خود اور اس کا کردار محسوس کرتا ہے وہ اپنے قاری کو بھی اسی درد میں مبتلا کر دیتی ہے اور قاری ان افسانوں کو پڑھ کر بے ساختہ ''آہ'' کے احساس سے گزرتا ہے اور یہ احساس اس لیے ہوتا ہے کہ پہلے افسانہ نگار خود ایک سے زیادہ بار اس نوعیت کے مختلف احساس سے گزرتی ہیں، باریک بیں نگاہ سے اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالتی ہیں اور زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی کتاب کی مانند اس میں ایک اہم ورق کا اضافہ کرتی ہیں۔ گویا اس کام میں ذکیہ مشہدی کو مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی زبان کی چاشنی کا لطف ان افسانوں کی لذت اور شدت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ اسلوب بیان قاری کو اپنی گرفت میں پوری طرح لے لیتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانوی مجموعے پر سلسلہ وار نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں تجریدی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کا ہر مجموعہ پہلے سے بہتر اور پختہ افسانے سے معمور ہے۔ ابتک پہلے سے چوتھے مجموعے تک کے سفر میں افسانہ نگار کہیں بھی تھکی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ فنکار ایک خاص مقام پر آ کر خود کو دہرانا شروع کر دیتا ہے، جس سے اس کی ذہنی اور فنی تھکان کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ذکیہ مشہدی ہمیشہ نیا اور پہلے سے مزید پختہ افسانہ نہایت تازگی کے ساتھ لے کر آتی ہیں۔ انھیں اس بات کی بالکل فکر نہیں کہ ناقد اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں انھیں اگر فکر ہوتی ہے تو صرف یہ کہ

قاری ان کے افسانوں کو اچھا اور سچا محسوس کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شہرت اور مقبولیت کے لیے کبھی نہیں لکھا اور نہ ہی اس کے لیے کبھی فکر مند ہوئی، ورنہ ہم جانتے ہیں کہ اس دور میں ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے اور کیسے کیسے کہاں رہ گئے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تاریخی شعور، مذہبی نظریات کی توسیع، سماجی سروکار کی وسعت، مشترکہ تہذیب کی عکاسی، زبان و بیان کی پختگی اور افسانے کے فن کو برتنے کا سلیقہ افسانہ نگار ذکیہ مشہدی میں بدرجہ اتم موجود ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے تمام افسانوں میں انسانیت کا فروغ، زندگی کی جدوجہد، مظلوم کی حمایت، ظالم کی مخالفت، سماجی استحصال اور پامال شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے ثابت قدمی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

ذکیہ مشہدی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے تہذیبی اور ثقافتی روایت اور انداز کو اپنے افسانے کا حصہ خاص بنایا اور اپنے افسانے کا تانا بانا تیار کرتے وقت ان موضوعات کو بطور خاص اہمیت دی۔ ان کی افسانہ نگاری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے کردار روایت سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ذکیہ مشہدی کے کردار سماج میں موجود لوگوں میں سے ہوتے ہیں لیکن یہ ان کا کمال ہے کہ اسے جس طرح پیش کرتی ہیں اس طرح عام لوگوں کی نظر ان کرداروں پر نہیں جاتی۔ ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد ہمیں بخوبی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار تو ہمارا جانا پہچانا ہے۔ اکثر ہم میں سے زیادہ تر لوگ ان کے ساتھ وقت گزارے ہوتے ہیں لیکن یہ فنکار کا ہی کمال ہے کہ اسے ہمارے سامنے جب پیش کرتا ہے تب ہمیں احساس ہوتا ہے ورنہ ہم ان سے یوں ہی سرسری گزر جاتے ہیں۔ گویا کردار نگاری میں ذکیہ کو وہ مہارت حاصل ہے کہ ان کا ہر کردار کسی نہ کسی صورت میں زندگی سے جوجھتا ہے۔ کہیں وقت سے پناہ چاہتا ہے تو کہیں وقت پر غالب آجاتا ہے۔ جب ہم ذکیہ مشہدی کے کرداروں پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ان کا کم و بیش ہر کردار ایک عجیب طرح کی ذہنی کشمکش اور تڑپ محسوس کرتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی زندگی اپنی مرضی سے موت کے حوالے تک کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا اور اگر انسانی عشق کی بات ہو تو اس میں کامیاب ضرور ہوتا ہے۔ ذکیہ نے عشق و عاشقی کے موضوع پر بھی خوب لکھا ہے لیکن اس بیان میں حد کو کبھی پار نہیں کیا بلکہ تہذیب کا پاس ہمیشہ رکھتی ہیں۔ ایک بے باک افسانہ نگار جو ہر بات کھل کر کہنے پر یقین رکھتی ہیں، اس طرح کے موضوع پر بالکل سادگی سے اپنی بات کہہ جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کے افسانے پڑھتے جایئے نئی نئی جہتیں سامنے آتی جائیں گی۔ کہیں ان کا کردار مجبور و بے بس نظر آتا ہے تو کہیں اپنی پوری توانائی سے احتجاج کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں اپنے وجود کے لیے لڑتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں قربانی کا مکمل جذبہ رکھتا ہے اور اپنی زندگی تک کی قربانی دینے میں عار محسوس نہیں کرتا۔

ذکیہ کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے ان کے یہاں منظر نگاری زیادہ نمایاں اور پر اثر ہے۔ ان کے افسانے جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں وہ اپنے سحر سے اپنے قاری کو اسی دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں ان کا افسانہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ ان کے افسانے کا جادو ہمارے ذہن کو ہی نہیں بلکہ ہماری روح کو بھی جھنجھوڑ دیتا ہے۔ جہاں وہ عورت پر ہونے والے مظالم اور نابرابری کو پیش کرتی ہیں وہاں ہمیں خود پر یا ہمارے آس پاس یہ ساری وارداتیں ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔

اگر موضوع کے اعتبار سے ذکیہ کے افسانے پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ یہاں بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ان کا موضوع آج کا انسان اپنے وجود کی تلاش میں ہے، زندگی اور آزادی کے انتخاب میں موت کی جیت، وقت کا جبر اور انسان کی مظلومیت، عورت پر عائد ہونے والی پابندیاں اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے ساتھ سماجی نا برابری انکا اہم موضوع ہے۔ ان موضوعات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے اپنے مختلف مجموعوں میں مختلف افسانوں کی مدد سے مختلف اور نئے موضوعات کو نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ان روزمرہ کے مسائل اور موضوعات کو برتنے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے۔

ذکیہ مشہدی نے اردو افسانے کے باب میں نہ صرف ایک نام جوڑا بلکہ انھوں نے اردو افسانے میں ہر طبقہ کے درمیانی فاصلے، ان کی بے بسی، ان کی کمیاں، ان کا استحصال، ان کی ذہنیت، ان کی موقع پرستی، ان کے مفاد اور اس کے حصول کی غرض سے کیے گئے کارنامے، ان کی سماجی حیثیت اور انسانی کمزوریوں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر ظالم اور مظلوم کو اس میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ذکیہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں ظالم کی کمزوریاں اور مظلوم کی طاقت کو پیش کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مظلوم اپنے مسائل کا حل خود نکالے گا، کوئی باہر سے آکر نہ تو اس کے مسائل کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی مناسب حل نکال سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ مظلوم کی خاموشی اس کی کمزوری نہیں بلکہ تہذیب کا پاس ہے، جس دن یہ باندھ ٹوٹ گیا پھر سماج چرمرا جائے گا اور اب ہم سب اسے محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ دن آگیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر عورت کو ہی لے لیں تو انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو اس سماج میں الگ تھلگ کر دی گئی ہیں۔ یہ صرف ہندستانی سماج ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مرد اساس معاشرہ انھیں الگ ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کبھی عورت کو پاؤں کی جوتی کہا گیا تو کبھی اسے دنیا کی سب سے حسین ترین شئے۔ کبھی اس کی عقل اس کے پاؤں میں بتائی گئی تو کبھی اسے ناگن کہا گیا۔ ذکیہ مشہدی کا ماننا ہے کہ عورت خود اپنی مجرم ہے، جب وہ خود ان مظالم کے خلاف آواز اٹھانا نہیں چاہتی تو دوسرا کون ہے جو زندگی کے اس دوزخ سے اسے آزاد کرائے۔ ایک طرف مرد اس کی حفاظت کرتا ہے تو دوسری طرف اسی مرد سے وہ خائف بھی ہے۔

ذکیہ کے افسانوں میں سے چند اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ ان اقتباسات کو دیکھیں اور محسوس کریں کہ ذکیہ کا کینوس کتنا وسیع ہے اور وہ کس بے باکی اور سلیقے سے اپنی بات کو افسانے میں بیان کر دیتی ہیں:

چرایا ہوا سکھ: ہم سب یہ محسوس کرتے ہیں کہ مرد کی ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جسمانی بھوک مٹانے کے لیے دوسرے گھر کی عورتوں پر نظر رکھتا ہے۔ اس

کہانی میں ایسے ہی ایک کردار کے ذریعے یہ پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح ایسے کردار کو باہر سے گھر کی جانب لوٹنے کی تلقین کرتی ہیں۔ مرد کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ گھر میں زیادہ سکون ملتا ہے خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی۔

"یہ بال تو پیچھے کرو۔ ناک میں گھسے آتے ہیں۔ اجیت کچھ جھنجھلا کر بولا۔ آخر تم بال باندھ کر کیوں نہیں سوتی ہو؟"

"یہ عورت کی ذات اگر شک میں مبتلا ہو جائے تو اس کی سانسوں تک میں زہر گھل جائے گا۔ کالے ناگ کی طرح زہر اگلتی ہے۔ فوں فوں کرتی، ناچتی پھرے گی۔ کب کس کو ڈس لے۔"

"کھنہ صاحب تو اسمارٹ تھے ہی، ان کی بیوی کا بھی جواب نہ تھا۔ واہ! واہ! واہ! گوری بھی، بہت سی عورتیں ہوتی ہے مگر ان تمام چیزوں کا صحیح امتزاج اور اس امتزاج کا صحیح استعمال شاید سب میں نہیں ہوتا۔ جیسے قورے کی بنیادی ترکیب تو ایک ہی ہوتی ہے، کچھ مرچیں، کچھ گرم مصالہ، کچھ دہی، کچھ پیاز، نرم ملائم گوشت، لیکن ان کا صحیح امتزاج کچھ ہی لوگوں کو آتا ہے ورنہ ہر باورچی کے پکائے ہوئے سالن کے ذائقے میں فرق کیوں ہوتا۔ اجیت کا دل چاہتا ذرا اس ہانڈی کو بھی سونگھ کر دیکھے۔"

پارٹی سے لوٹ کر رات کو جب اینتا میک اپ اتارنے کے بعد اپنے بالوں کو کس کر چوٹی میں گوندھ رہی تھی تو اجیت نے اپنا چہرہ اس کے شانوں میں ڈبوتے ہوئے کہا: اینتا! ان بالوں کو کھلا رہنے دو۔ یہ ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں ہے؟"

ایک تھکی ہوئی عورت: شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی زندگی۔ محبت اور شادی کے فرق کو افسانہ نگار نے اس کہانی میں فنکاری سے پیش کیا ہے۔ آپ بھی دیکھیں:

"وہ چاہتی ہے کہ آج اسے پکارے تو اس کی آواز میں وہی شہد ہو جو اظہار محبت کے پہلے کنوارے بولوں میں تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے تو آنکھوں میں دیپ جل اٹھیں، وقت بے وقت وہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دے، جسم کی طلب نہ ہو تو بھی اسے پیار کرے، تو پتہ نہیں فیصلہ وسندھرا کے حق میں ہوگا یا نہیں۔"

بھیڑیے: ایک گاؤں کی عورت کی کہانی۔ بڑے لوگ اپنے مفاد کے لیے انسان کا قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ انجو بڑے گھر میں بیاہ کر آتی ہے۔ شوہر باہر رہتا ہے۔ اس کا جیٹھ اس پر بری نظر رکھتا ہے۔ کرلی آنگن باڑی کا کام دیکھتی ہے اور گھر گھر جا کر لڑکیوں کو پڑھاتی ہے لیکن اسے نہ صرف بے عزتی جھیلنی پڑتی ہے بلکہ مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ انجو کو بھی سزا ملتی ہے۔ کہانی کے چند اقتباسات دیکھیں کہ کس طرح اور کس سطح پر گاؤں میں کام ہوتا ہے:

"نند کشور نے ایک دن کرلی کو کھیا کے کھیتوں کی منڈیر پر پکڑا۔ 'کیوں رے بڑھی۔ گاؤں چھوڑ کے جاتی ہے یا زندہ جلوا دوں تجھے۔'

ایک لمبے تڑنگے لٹھیت نے اس کی کمر میں لاٹھی چبھوئی۔ 'کہو تو نند کشور بابو گردن داب کے کھیتوں میں توپ دیا جائے۔ پورے گاؤں میں کوئی مائی کا لال پوچھنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ بڑھی کہاں گئی۔'

'ہاہاہا... اس کے جسم کی کھاد بنی تو فصل لہلہا اٹھے گی۔'

کرلی تھر تھر کانپنے لگی۔ 'بابو لوگ ہمارا قصور تو بتائیں۔ دوا چھپر پڑھا دینا تو پن کا کام ہے۔'

'ارے بڑھی، پن کمانا ہے تو رام کا نام جپ۔ زیادہ پن کمانا چاہتی ہے تو چلی جا کر سیوا کے لیے اجودھیا۔ موسہر چماروں کو ورغلا کے ہی پن کمائے گی کیا؟'

کرلی گھگھیانے لگی۔ 'ہم راج نیتی کیا جانے بابو۔ ہم تو سیوا بھاؤ سے پڑھانے آئے ہیں۔'

'ارے او پنڈتانی۔ ہمارے کھیت مجور توڑ رہی ہے۔ موسہر چمار پڑھیں گے تو کھیت مجوری کون کرے گا۔ تیرا باپ کہ ہم؟ ویسے بھی نیچ کمین سب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے ہیں۔ اوپر سے انھیں پڑھایا بھی جائے گا؟'

'اور میاں لوگوں کو بھی؟ اور جنانیوں کو بھی؟ یہ تو حد ہے۔'

برج کے عورت کی چٹھی لے جا کے ڈال دیتی ہے۔ کس کے نام لکھتی ہے وہ، سو تو یہی جانے۔ اب گاؤں کی کنواریوں کو بھی لکھنا سکھائے گی۔ پھر خود ہی لے جا کے ان کے یاروں کو چٹھیاں پہنچائے گی۔'

'رام کا نام لو بابو۔ اپنی بہو پر بھی دوش لگا رہے ہو' کرلی کے ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ دھپ سے وہیں گیلی مٹی پر بیٹھ گئی۔"

بی بی کی نیاز: خیر النساء اپنے بیٹے چھدو میاں کو اپنا دودھ نہ پلا کر مرزا نصرت بیگ کے بیٹے سعید اور حمید کو اپنا دودھ پلاتی ہے۔ سعید ولایت چلا جاتا ہے۔ حمید کی بیوی ظلم کرتی ہے۔ چھدو ذہنی طور پر کمزور ہوتا ہے۔ اسے حمید کے بیٹے ذلیل کرتے ہیں۔ خیر النساء شرط رکھتی ہے۔ چھدو پہلے مر جاتا ہے۔ ایک عورت کی قربانی اور اس کے حوصلے کی مثال دیکھیں:

"اوپر پہنچ کر خیر النساء بیگم گود کے بچے اور بیٹی کو مع گٹھری بازوؤں کے گھیرے میں سنبھالے زمین پر بیٹھنے لگی تو خاتون خانہ یعنی مرزا نصرت بیگ کی بیوی نے انہیں ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھا لیا اور بولیں... بی بی آل رسول ہو کر زمین پر بیٹھو گی تو ہمارے گناہ کیسے بخشے جائیں گے۔ یہاں بیٹھو۔۔۔

دیکھو بی بی۔۔۔ دو بچوں کو دودھ پلا سکو گی۔

جی۔ اسلم چچا نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جڑواں بچے ہیں۔ سوچ سمجھ کر آئی ہوں۔ چھدو میاں کو اوپر کے دودھ پر ڈالنا ہوگا۔"

"بچے ڈھائی سال کے ہوئے تو دودھ بڑھائی کی رسم بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دن بلاقن نے آنکھیں مٹکا کر کہا 'اب کھیر النساء کہاں جمیّن؟ نہ ہو تو کونو گھر میں جھاڑو برتن کے لیے رکھوا دیا جائے۔"

"بی بی۔ ہمارے خاندان کے چراغوں کو آپ نے نئی زندگی دی۔ سعید اور وحید نے آپ کا دودھ پیا ہے۔ بڑھاپے کی فکر تو آپ کریں نہیں۔ ہاں عزیزی

چھدو کی اس ذہنی حالت کا رنج ہونا فطری ہے۔''

''گھونگھٹ الٹا تو پھول دلہن کو معلوم ہوا کہ اماں صاحب دولہا میاں کی کھلائی رہ چکی ہیں، کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہیں۔ انہوں نے ان کو اماں صاحب کہنے سے انکار کر دیا۔ کہا اماں صاحب تو ہم اپنی نانی محترمہ کو کہتے ہیں کہاں وہ اور کہاں یہ کھلائی۔''

حصار: فرح اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے شوکت کی پرورش کے لیے اپنی خوشی کو قربان کر دیتی ہے۔ شوکت کے جوان ہونے کے بعد وہ احسن سے شادی کرنا چاہتی ہے تو شوکت بہت برہم ہوتا ہے۔ شوکت اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ فرح بیٹے کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی کر پاتی ہے گویا بیٹے کی مرضی ہی چلتی ہے یعنی مرد ہی کا پلڑا بھاری رہتا ہے:

''فرح احسن سے کنارہ کش ہوتی چلی گئیں۔ ٹوٹے ہوئے دل کا رفو کرتے کرتے پانچ برس گزر گئے۔ وقت جواب تک ان سے ہارتا چلا آیا تھا۔ یکا یک دفاع کو کمزور پا کر ٹوٹ پڑا۔ ان کے شانے جھکنے لگے اور آنکھوں کے گوشوں میں لکیریں نمایاں ہو چلیں۔''

''انھوں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ بوڑھی اب بھی نہیں تھیں۔ اور ہوتی بھی تو کیا۔ رفاقت اور محبت حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

دوسرے دن انتہائی اعتماد کے ساتھ وہ احسن فیاض کے کیبن میں داخل ہوئیں اور ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولیں۔ 'احسن ہم شادی کر رہے ہیں۔''

نیا سال مبارک ہو: جہیز کی لعنت کے خلاف ایک بہترین کہانی۔ جہیز نے ہمارے سماج کو کس طرح کھوکھلا اور انسان کو وحشی بنا دیا ہے دیکھیں:

''وہ پیاری سی، نازک، ہری دوب سی سائنس گریجویٹ جلا کر مار دی گئی۔'
ثروت کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔

منظورروا: فرقہ پرستی پر بہترین افسانہ، بابری مسجد سانحے کو پس منظر میں رکھ کر عورتوں کے کردار کی مدد سے اسے سمجھنے کا نیا زاویہ دیا ہے ذکیہ نے۔ کس طرح معصوم اور انجان لوگ فرقہ پرستی کے شکار ہوتے ہیں اس کا ایک کامیاب اور فنکارانہ تجربہ ذکیہ نے کیا ہے۔ افسانہ کیسے ایک عہد کا نمائندہ بن جاتا ہے اس کی بہترین مثال یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ بھی دیکھیں:

''منجورروا۔ یہ تیرے بابر نے مندر نہیں توڑا بلکہ ہمارا مندر توڑ کر وہاں اپنی مسجد بھی بنوائی۔'

'ہائے اللہ! بھوجی کہاں؟'

'اجودھیا جی میں۔ خیر ہم اپنا مندر تو واپس لے ہی لیں گے مگر تو کان کھول کر سن لے۔ یہاں کام کرنا ہے تو خبردار جو اس چنڈال کا نام لیا۔ لٹیرا کہیں کا۔'

'بابر کا نام تو آپ ہی کے گھر سنا بھوجی۔ ہم تو جانتے ہی نہیں تھے اللہ قسم۔'

'جھوٹا، لفنگا۔ ابھی کہہ رہا تھا کہ بابر صوفی پیر تھا۔ جوتے مار کر باہر کر دونگی۔ جھوٹ بولتا ہے تو!''

ان اقتباسات کو پیش کرنے کا ہرگز مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ صرف خواتین کے موضوع پر افسانے لکھتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے سماج کے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حالات سے عام قاری کو واقف کرایا، ان کے مسائل پر ہر خاص و عام کی توجہ مرکوز کرائی۔ ہمیں ذکیہ مشہدی اپنے افسانوں میں عورتوں کی باتیں، ان کی آوازیں اور ان کے دکھ درد کا درماں کرتی نظر آتی ہیں۔ سماج کے ہر طبقے کے مسائل کو پیش کرتی ہیں۔ انکے افسانوں کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی سے مایوس، ناامید نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر مقابلہ کرنے کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر برائی اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں لیکن احتجاج کا لہجہ ایسا ہوتا ہے جو نرم انداز میں ہونے کے باوجود سخت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے میں شور نہیں دکھتا لیکن زور کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔ اور ہمارے بیشتر ناقدین افسانہ کو شور جلد سنائی دیتا ہے۔ اس لیے اب تک بہت سے افسانہ نگاروں کے فن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ ذکیہ مشہدی سے کم تر درجے کے اور کئی افسانے نگاروں کے لیے تو جبراً بھی جگہ بنائی گئی اور ان کے افسانوں پر ایمانداری سے بھی توجہ نہیں دی گئی۔ ان کی تقلید میں لکھنے والوں کو تو سر پر بٹھا لیا گیا اور انھیں ان کا مقام بھی نہیں دیا جا سکا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانے میں مخفی مفاہیم کی پیش کش، باطنی تجسس اور داخلی اوصاف کی تلاش ان کے اسلوب بیان کو مزید عطا کرتی ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا سمندر ہے۔ الفاظ کا برمحل استعمال ذکیہ مشہدی کو خوب آتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی افسانے میں مختلف موقعوں پر وہ مختلف اسالیب بیان کو ایسی چابک دستی سے استعمال کرتی ہیں کہ کلاسکیت اور جدیدیت کا فرق مٹتا نظر آتا ہے۔ ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک اہم نکتہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک خاتون افسانے نگار نے صرف خواتین کے مسائل پر توجہ نہیں دی بلکہ یہ انھوں نے صرف اور صرف افسانے لکھے ہیں، موضوع کا انتخاب کرتے وقت جنس یا طبقہ کا خیال نہیں رکھا ہے۔ ہاں افسانے کے موضوع کی مناسبت سے مسائل خود بخود اجاگر ہو گئے ہیں۔ اس طرح ان کی افسانہ نگاری پر کسی ازم کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا بلکہ سچا اور کھرا افسانہ نگار کی صف میں اہم مقام پر انھیں رکھا جانا چاہیے۔ مختصر الفاظ میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے افسانوں میں ایک جانب پریم چند کا دیہات اور زمین سے جڑا کردار ہے تو دوسری جانب عصمت چغتائی کی فکر، ایک جانب کرشن چندر کا اسلوب ہے تو دوسری جانب منٹو کا فن، تو شاید بے جا نہ ہو۔ ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری پر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اگر مختصر طور پر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اردو کو نہ صرف ناقابل فراموش افسانے سے نوازا ہے بلکہ سعادت حسن منٹو اور عصمت کی طرح کئی اہم کردار بھی خلق کیے ہیں۔ ایسے ایسے موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جس جانب بہت کم لوگوں کا ذہن جاتا ہے، تو شاید بے جا نہ ہو۔ اگر کہانی کا تانا بانا بننے کی بات کی جائے تو ان کے دور میں شاذ و نادر ہی کوئی افسانہ نگار ہوگا جس نے کہانیوں میں جدید تجربہ کرنے کے ساتھ ساتھ افسانے میں کہانی پن کو بھی اہم جگہ دی ہو۔ یہ ذکیہ کا ہی کمال فن ہے کہ ایک ساتھ مذکورہ دونوں جانب برابر توجہ دیتی ہیں۔

پارسابی بی کا بگھار

(ناولٹ کا باب)

ذکیہ مشہدی

"تو جب وہ بی بی دال بگھارتی تو زیرے، لہسن اور اصلی گھی کی سوندھی خوشبو اڑ کر سات آسمانوں تک پہنچتی اور فرشتے کہتے: لو آج پھر پارسابی بی کے گھر ارہر کی سنہری دال پکی ہے۔ پارسابی بی بیٹی تو تھی بادشاہ کی، لیکن بیاہ کے آ گئی تھی غریب منشی کے گھر۔"

دادی تو یہ کہانی صدیوں سے سناتی آ رہی تھیں، لیکن کبھی کسی بہو نے ان سے یوں منہ لگ کر سوال نہیں کئے تھے۔ رہی بات قمر کی تو وہ بہو نہیں، پوتی تھی اور طرہ یہ کہ اسکول پڑھنے جاتی تھی۔ اوپر سے ککڑی کی بیل کی طرح دھڑا دھڑ بڑھ رہی تھی۔ اس نے پٹ سے سوال کیا:

"بھلا بادشاہ زادی بیاہ کے غریب منشی کے گھر آئی کیسے؟" دادی اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"بتایئے نا دادی! ایسا ہوتا ہے کہیں؟ اب بادشاہ زادی بیاہ کے بادشاہ کے گھر جائے نہ جائے، نواب کے گھر تو جائے ورنہ سپہ سالار، وزیر، کچھ تو ہو۔"

"کہانی سنے گی یا بال کی کھال نکالے گی؟ کٹھ حجت کہیں کی! اور پڑھاؤ اسکول بھیج کے اور وہ موئی کرنٹان استانیاں....."

دادی بگڑ گئیں۔

ماتھے سے سرکتا آنچل پھر سے اچھی طرح جما کے اماں نے بھی تنبیہ کی: "کتنی بار سمجھایا، بڑوں سے حجت نہیں کرتے ہیں۔"

"اور اگر بڑے ایسی باتیں کریں جو سمجھ میں نہ آئیں تو؟"

قمر نے نصیحت یکسر نظر انداز کر دی۔ اس کی محبوب ٹیچر مسز نارٹن نے، جنہیں دادی "نانٹگ" بلکہ "نوٹنکی" کہا کرتی تھیں، سمجھایا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لینا چاہئے، گفتگو سے ذہن کے دروازے کھلتے ہیں۔

"اچھا چل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو سمجھ ہی لے، کیونکہ اس میں نصیحت بھی ہے۔ بادشاہ زادی کوتوال کے بیٹے سے....." دادی کی زبان ذرا رکی، ذرا لڑکھڑائی لیکن پھر سنبھالا لے لیا۔

"بادشاہ زادی کوتوال کے بیٹے سے آنکھ مٹکا کر کے بیٹھی تھی، اس لئے سزا دینے کے لئے بادشاہ نے اسے، جو پہلا لڑکا نظر آیا، اس سے بیاہ دیا۔ اب وہ نکلا منشی کا بیٹا اور منشی کی مجال جو بادشاہ کے حکم سے سرتابی کرے۔"

"دادی، منشی کے بیٹے سے کوتوال کا بیٹا تو اچھا رہتا نا!"

"اوئی بی بی! یہ لڑکیاں اپنا بر کب سے خود چننے لگیں؟ ایسی بیٹیوں کو تو گلا دبا کے مار دینا چاہئے۔ اللہ آمین کی بیٹی رہی ہوگی، سو بادشاہ نرم پڑ گیا۔ زندہ رہنے دیا ایسی بیٹی کو۔"

"اچھا تو دادی، اگر کیا کہتے ہیں کہ اس نے اپنا بر خود چننے کا گناہ کیا تھا تو وہ پارسابی بی کیسے کہلائی؟"

"پارسابی بی اس لئے کہلائی کہ اس نے سر جھکا کر باپ کی مرضی کو قبول کر لیا، پھر شوہر کے علاوہ کسی کو آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ جس کے چاروں طرف لونڈی غلام ہاتھ باندھے گھومتے تھے وہ جھاڑو بہارو کرتی، گائے کی سانی پانی کرتی، کھانا پکاتی اور جب دال بگھارتی تو....."

کہانی کے اس موڑ پر دادی نے ڈرامائی انداز میں گھوم کر فاطمہ بی بی یعنی قمر کی اماں یعنی اپنی بہو کی طرف دیکھا اور آواز قدرے تیز کر دی:

"اور جب وہ دال بگھارتی تو ایک بڑے پیالے میں شوہر، سسر اور بیٹے کے لئے دال نکال کر بگھار کر پورا کرچھل اس پیالے میں انڈیل دیتی اور اپنے لئے پتیلی کے پیندے میں چھوڑی ہوئی تھوڑی سی دال میں خالی کرچھل ڈبو دیتی۔ گرم کرچھل چھن سے کرتا اور دراصل یہی چھنا کا اس کے گھر کے روشندان سے ہو کر آسمانوں تک پہنچتا اور فرشتے کہتے کہ لو، آج پھر پارسابی بی نے ارہر کی سنہری سنہری دال پکائی ہے۔"

"اچھا تو دادی" قمر نے پھر لقمہ دیا، "اگر وہ لوگ اتنے غریب تھے تو خالص گھی میں دال کیسے بگھاری جاتی تھی؟"

دادی نے ناک بھوں چڑھائی۔ "یہ مٹ گیا ڈالڈا تو ابھی حال میں نکلا ہے۔ پہلے معمولی گھروں میں بھی دال گھی سے ہی بگھاری جاتی تھی۔ گھی کم ہونے کی وجہ سے ہی تو پہلے مردوں کے پیالے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ پہلا حق تو ان کا ہی ہوا نا!"

"ان کے گھر کبھی گوشت پکتا تھا دادی؟" قمر کو گوشت بہت پسند تھا اس لئے اس نے بڑے تاسف سے پوچھا۔

"ہاں، ہفتے کے ہفتے پکتا تھا۔"

دادی نے یوں کہا جیسے وہ پارسابی بی، بادشاہ زادی، ان کی بھانجی بھتیجی کچھ تھی اور وہ اس کی گرہستی میں رہ آئی تھیں۔

"پارسابی بی، گوشت پکا کر پورا سالن بڑے چینی کے پیالے میں انڈیل کر گھر کے مردوں کے سامنے رکھ دیتی اور خود روٹی سے پتیلی پونچھ لیتی۔ کبھی آلو یا اروی گوشت میں ڈالتی تو ہاں اس کا ایک آدھ ٹکڑا اپنے لئے روک لیا کرتی۔"

"ہا، دکھیا!"

قمر نے ناک پر انگلی رکھ کر بالکل دادی کے انداز میں کہا۔

"ارے دکھیا کیوں؟ کھڑی جنت میں گئی۔ جب مری تو سارا گھر خوشبو سے مہک رہا تھا۔"

''آپ نے خوشبو سونگھی تھی، دادی؟''

اماں اس درمیان اٹھ کر، کہ وہ یہ کہانی دسیوں بار سن چکی تھیں، باورچی خانے میں مردوں کے پیالے میں پورا بگھارا انڈیلنے جا چکی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے کرچھل بہک گیا۔ خیریت تھی کہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ قمر ضرور کسی دن مار کھائے گی۔ ان کا آنچل پھر سرکنے لگا۔ کرچھل اور آنچل دونوں سنبھال کر وہ تاسف کے ساتھ قمر کے مستقبل پر غور کرنے لگیں جو خاصا تاریک نظر آ رہا تھا۔ اس قدر بک بک، اتنی حجت۔ باسی کھانا اکثر اماں ہی سوارت لگاتی تھیں۔ گھر میں کوئی خاص چیز پکتی تو بچا کر مردوں کے لئے رکھ دیتیں کہ دوسرے وقت بھی کھا لیں گے۔ خود کبھی پہلے کے بچے کھچے کے لئے برتن ٹٹولتیں۔ نہیں تو اچار ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ اکثر انہیں باسی کھاتے دیکھ کر قمر ہاتھ سے رکابی چھین لیتی اور تازہ کھانا ان کی پلیٹ میں ڈالتی۔

''کھانا پھینکنا کبھی نہیں چاہیے بیٹا، گناہ ہوتا ہے۔''

وہ کہتیں۔

''تو سب مل کے کھائیں۔ ابا کو اور بھیا کو اور دادی کو، سب کو دیا کرو تھوڑا تھوڑا۔''

اماں مسکراتیں۔ ''دادی اپنے وقت میں بہت باسی کھا چکی ہوں گی۔ اب وہ گھر کی بزرگ ہیں۔''

''جھوٹن کھانا رہ گیا ہے، وہ بھی تم کھا لیا کرو۔''

ایک دن قمر نے جل بلا کر کہا تھا۔ اس دن ابا نے اپنے کچھ دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ باہر سے برتن آئے تو کچھ پلیٹوں میں بہت کھانا بچا ہوا تھا۔ اماں نے اسے سمیٹ کر اکٹھا کیا اور بھیا سے کہا کہ باہر ڈال دے، کتا کھا لے گا۔

''کوڑے میں مت ملانا، صاف جگہ پہ رکھنا۔''

انہوں نے بیٹے کو ہدایت دی۔

''کتا کیوں کھائے گا؟ تم کھا لو۔ مرغ کی دو دو بوٹیاں ہیں، اچھا خاصا پلاؤ ہے۔ یہ ابا کے پیٹ بھرے دوست نیاز خاں، گھر میں حرام کا بہت آتا ہے، اس لئے برباد کرتے جی نہیں دکھتا۔''

اماں نے سر پہ ہاتھ مار لیا: ''ارے کم بخت لڑکی! باہر آواز جائے گی۔ ذرا دھیرے بول، جو منہ میں آتا ہے، بک جاتی ہے۔''

اماں کو یہ خدشہ ہر وقت لگا رہتا تھا کہ آواز باہر جائے گی۔ ایک دن دادی نے ابا سے جانے کیا لگائی بجھائی کی کہ وہ خوب چلائے۔ اماں کو یہ رنج کم تھا کہ ابا بغیر معاملے کی تحقیق کیے ان پر چلائے تھا، یہ فکر زیادہ لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں آواز باہر نہ گئی ہو اور پاس پڑوس والوں یا کسی راہ چلتے کو پتا نہ چل گیا ہو کہ اس گھر میں کوئی چپقلش ہوئی ہے، لیکن یہ قمر سن کے ہی نہیں دیتی تھی۔ پرائی امانت، کہاں جائے گی تیکھا مرچ؟

''ہاں تو دادی، تم گئی تھیں جب پارسا بی بی مری تھی؟''

دادی بڑے زور سے بھڑکیں:

''ہر بات خود دیکھی جاتی ہے کیا؟ ارے خدا کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے! یہ کہانی ہمیں ہماری جنت مکانی والدہ نے سنائی تھی۔ ہو سکتا ہے کسی نے پارسا بی بی کو دیکھا بھی ہو۔''

''نہ دیکھا ہو تو ہماری اماں کو دیکھ لے۔ یہ کون سا پارسا بی بی سے کم ہیں۔'' قمر کا انداز چڑانے والا تھا۔

''تیری اماں'' انہوں نے گھور کر پوتی کو دیکھا، پھر ایک خشمگیں نظر سر جھکائے باورچی خانے میں کام کرتی بہو پر ڈالی۔ (باورچی خانہ آنگن پار کر کے برآمدے کی سیدھ میں تھا جہاں دادی کا تخت پڑا رہتا تھا۔ قمر اسے 'راج سنگھاسن' کہتی تھی۔ وہاں سے کوئی آیا گیا، بہو، نوکر، سب دادی کی نظر میں رہتے تھے۔)

''تیری ماں ذرا تجھ پارسا بی بی کو تو سنبھال لے۔ چل، ادھر آ۔ یہ مٹ گئے عیسائیوں کی سی وضع بنا رکھی ہے۔''

انہوں نے قمر کی دو چوٹیوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''یہ تیری عالم فاضل ممانی آ کر تجھے سکھا گئی ہے۔''

اماں سے ملنے آئی ممانی قمر کے گھنے بال سلجھانے میں مدد کر رہی تھیں تو قمر نے ٹھنک کر کہا تھا کہ اسکول میں زیادہ تر لڑکیاں دو چوٹیاں بنا کر آتی تھیں۔ بس، مارے لاڈ کے ممانی نے دو چوٹیاں بنا کر سرخ ربن سے پھول بھی بنا دیا۔ تھاپی جیسی ایک چوٹی سے وہ دو چوٹیاں کیسی اچھی تھیں۔ اماں سارے طعنے، سارے کہانیاں شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی تھیں، بس میکے کے بارے میں بڑی حساس تھیں۔

''ہمارے وقت میں لڑکیوں کو مانگ نہیں نکالنے دیتے تھے۔ بغیر مانگ نکالے ایک چوٹی بندھا کرتی تھی، اب وہ تھاپی لگے یا نیولے کی دم۔ (قمر اپنی موٹی چوٹی کو 'نیولے کی دم' کہا کرتی تھی) تو بیٹا، تمہیں تو مانگ نکالنے کی اجازت ہے، کیوں دو چوٹیوں کی ضد کر کے دادی سے ڈانٹ سنتی اور ممانی کو برا کہلواتی ہو؟''

اماں کے لہجے میں تاسف تھا۔

''دو چوٹیاں باندھنے سے کسی کے مذہب کا کیا لینا دینا؟ مجھے بڑا غصہ آتا ہے جب دادی کہتی ہیں کہ عیسائیوں کی سی وضع بنا رکھی ہے۔'' (دادی کے 'مٹ گئے' عیسائی اس وقت بھی ساری دنیا پر دندنا رہے تھے، جیسے آج دندنا رہے ہیں اور جس کو چاہتے تھے اسے مٹانے کا مقدور رکھتے تھے، جیسے آج رکھتے ہیں۔ نہ جانے کتنی تہذیبوں کو کتنی حکومتوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا، لیکن قمر کا شعور اس وقت اتنا بالیدہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں، یہ سمجھتی تھی کہ اس کی دو چوٹیوں سے عیسائیوں کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔)

قمر نے امتیازی نمبروں سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد بی۔ایڈ میں داخلہ لیا تو اس نے اپنے بال کٹوا دیے۔ وجہ یہ تھی کہ پریکٹس ٹیچنگ کے لئے

جوڑا بنا کر جانا لازمی تھا۔ جن لڑکیوں کے بال تراشے ہوئے تھے ان پر یہ ضابطہ لاگو نہیں تھا۔ کم عمر قمر کے لئے جوڑا بنانا، وہ بھی گھنے روکھے بالوں سے ٹیڑھی کھیر تھا۔ ویسے تو یہ بی۔ایڈ نہایت ٹیڑھی کھیر تھا۔ بچے بڑے شاطر تھے۔ انہیں معلوم تھا یہ لڑکیاں ان کی اصلی ٹیچر نہیں ہیں، یہ تو موسمی پرندے ہیں جو چند ماہ کے لئے ایک مخصوص مدت میں آتے اور پھر اڑ جاتے ہیں، اس لئے قطعی بات نہ سنتے۔ اگر سپر وائزر سے شکایت کرو تو وہ جواب دیتے کہ بچوں کو ڈسپلن کرنا آپ کی تربیت کا حصہ ہے۔ آپ سمجھئے، آپ کیا کریں گی۔ ایسے میں بال اور لباس درست رہنا بہت ضروری تھا۔ چھٹیوں میں قمر گھر آئی تو اماں نے سر پیٹ لیا۔ خیریت تھی کہ اس وقت دادی جنت مکانی خلد آشیانی ہو چکی تھیں، اس لئے سر اماں نے اکیلے ہی پیٹا۔ بی۔اے کے بعد، بلکہ اور پہلے سے، دادی نے تو قمر کی شادی کی ضد باندھ رکھی تھی۔ اس وقت انہیں صرف ایک منطق نے چپ کرایا تھا۔ قمر پڑھ لکھ کر پیروں پر کھڑی ہو جائے گی تو بغیر جہیز کے آسانی سے 'اچھا' لڑکا مل جائے گا، پھر استانی بننا تو عزت کی بات ہے۔ وہ کرنتان مسز نارنگ کی بٹیا سلومی کی طرح آفس میں ٹپ ٹپ ٹائپ کرنے تھوڑی ہی جا رہی ہے۔ دادی قمر کے استانی بننے سے پہلے چل بسیں، لیکن کچھ معاملوں میں اماں کون سی کم تھیں، وراثت سنبھالے بیٹھی ہوئی تھیں۔ جبھی تو قمر کے بال دیکھ کر اس قدر ہول گئیں کہ انہوں نے پہلی بار شوہر کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی ہمت کی جو ان کے لئے مجازی خدا کا درجہ رکھتے تھے اور جن پر یہ الزام تراشی کفر تھی۔ ویسے بھی اماں نیک اور فطرتاً ڈرپوک انسان تھیں، اپنے وقت کی زیادہ تر شریف بیبیوں کی طرح، جن کا بیاؤ عموماً اسی وقت کھلتا جب وہ ادھیڑ عمر ہو کر ساس کے مرتبے پر فائز ہو جاتیں اور ایک انہی کی طرح کی کمزور لڑکی بہو بن کر گھر میں آ جاتی، لیکن اس دن انہوں نے بڑی ہمت کی، شوہر کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں:

''قمر کو آپ نے بگاڑا ہے۔ بی۔اے کر لیا تھا، بہت کافی تھا۔ سلمان چچا اتنا اچھا رشتہ لائے تھے، آپ نے میرے اصرار کے باوجود انکار کر دیا اور لڑکی کو بھیج دیا بی۔ایڈ کرنے، پھر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کیا کرتی گھوم رہی ہے۔''

''کیا کرتی گھوم رہی ہے؟'' ابا نے چونک کر آخری جملہ پکڑا۔ باقی باتیں صفا ٹال گئے۔

''بال کٹوا لیے ہیں اس نے۔'' اماں کا لہجہ ایسا مضطرب تھا جیسے کانے دجال کے نکل آنے کی اطلاع دے رہی ہوں۔

''اوہ!'' ابا کی رکی ہوئی سانس سینے سے باہر آ گئی۔ وہ بڑی زور سے کھٹکے تھے۔ انہیں لگا تھا بیوی خبر دیں گی کہ بیٹی کسی لونڈے کے ساتھ گھومتی دیکھی گئی ہے، اس لئے 'میموں' جیسے بال کٹوا لینے کی خبر خاصی دلدوز ہونے کے باوجود اپنا اثر کھو بیٹھی تھی۔ زور کا جھٹکا دھیرے سے لگا۔

''اچھا! لیکن میں نے تو نہیں دیکھا۔'' ابا کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید قمر کی اماں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا وہ کچھ مبالغے سے کام لے رہی ہیں، لیکن ان کی آواز کمزور ضرور تھی۔

''آپ کے سامنے آپ کی چالاک بیٹی سر ڈھکے رہتی ہے۔ سر کھلا رکھتی ہے تو پیچھے کلپ لگا کر بال سمیٹ لیتی ہے۔''

ابا کے اجلاس میں قمر کی طلبی ہوئی تو اس نے بغیر کسی گھبراہٹ کے وضاحت پیش کی۔ ابا کو یہ اطمینان ضرور ہوا کہ قمر نے بال محض فیشن ایبل لگنے اور 'میموں کی وضع' اختیار کرنے کے لئے نہیں کٹوائے ہیں۔

''بی۔ایڈ کا کورس ختم ہونے میں بس دو مہینے باقی ہیں۔ امتحان ہو جائیں تو پھر بڑھا لینا۔''

ابا نے تحکمانہ، لیکن نرم لہجے میں اتنا ہی کہا۔

''جی ابا، ضرور'' قمر نے منمنا کر جواب دیا، لیکن ان کے باہر چلے جانے کے بعد اماں پر الٹ پڑی:

''چغلی لگا کے کیا ملا تمہیں؟ لڈو؟''

''خوب تعلیم ہے بھائی تمہاری۔ خاندان میں اور لڑکیاں نہیں ہیں کیا؟ اور کسی نے نہ کٹوایا چونڈا!''

ابا نے قمر کی خاطر خواہ سرزنش نہیں کی تھی، اس لئے اماں آزردہ خاطر تھیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی جا رہی تھیں ''......اسکولوں کالجوں میں یہی سکھایا جا رہا ہے کہ بڑوں سے بدتمیزی کرو؟ اب یہی تم اپنے شاگردوں کو سکھانا۔ رہ گئے تمہارے ابا، تو بسنت کی خبر نہیں۔ کون کرے گا پرکٹی سے بیاہ؟''

ایک تو 'چونڈا کٹوانے' جیسا غیر فصیح، اہانت انگیز جملہ، اوپر سے جلے پر نمک، 'پرکٹی' پھر خاندان کی دوسری غبی، کند ذہن، گھر بیٹھ کر پرائیوٹ اردو فارسی کے امتحان پاس کرنے والی لڑکیوں سے موازنہ۔۔۔ قمر کی ایڑی میں لگی اور چوٹی میں بجھی۔ جلبلا کر بولی:

''اور اسے بھول گئیں، وہ تمہارے چچا زاد بھائی کی بیٹی ثریا۔ اس نے بال کٹوائے ہی نہیں بلکہ لکھنؤ جا کر ان میں گھونگھر و بھی ڈلوائے۔ یہ نہ کہنا کہ تمہیں معلوم نہیں۔ ابھی تو ملی تھی فرزانہ خالہ کے یہاں میلاد میں۔''

''ثریا کی شادی ہو گئی ہے۔ اب وہ جانے اور اس کا شوہر اور سسرال والے اور ہاں، میرے چچا زاد بھائی تمہارے ماموں ہوئے۔ خبردار جو یوں ذکر کیا ہے کہ تمہارے چچا زاد بھائی۔''

''ہاں ہاں، چلو نا! بڑے آئے ماموں۔ ایک نمبر کے نکھٹو باز، معمولی صورت کی بارہویں پاس بیٹی کے لئے سرکاری نوکری والا لڑکا لے آئے۔ تم نے بھی کر دی ہوتی ہماری شادی، پھر بلا سے ہم سر ہی مونڈ کر رکھ دیتے۔ شادی نہ ہوئی، ہر آزادی کا پروانہ ہو گئی۔''

قمر پیر پٹختی وہاں سے چل دی۔

اماں، ٹک ٹک دیدم نہ کشیدم، بت بنی بیٹھی دیکھتی رہ گئیں۔ ایسی خاموش ہوئیں کہ سارا دن گزر گیا اور وہ ہوں ہاں کے علاوہ کچھ نہ بولیں۔ کتنی بڑی

بات بول گئی یہ بدزبان لڑکی! 'تم نے بھی کر دی ہوتی ہماری شادی، اگر قمر کے ابو نے سلمان چچا کا لایا ہوا رشتہ منظور کر لیا ہوتا تو آج یہ سننے کی نوبت نہ آتی۔ اچھے بھلے لوگ تھے، اچھا خاصا رہن سہن، معقول لڑکا۔ یہی نا کہ خاندان بڑا لانبا چوڑا تھا' میری بیٹی قمر اس چڑیا خانے میں پندرہ بیس لوگوں کی روٹی ٹھوکنے نہیں جائے گی۔''

ابا نے ایک حتمی جواب دیا تھا پھر کیا مجال جو کوئی ان سے ہامی بھر والے۔

''خاصہ پیسہ ہے، لیکن گھر میں نوکر چاکر نہیں۔ بس جھاڑو برتن کے لئے ایک عورت آتی ہے، باقی کام خواتین خود کرتی ہیں۔ گاڑی بھر تو برتن نکلتے ہیں۔ اگر ملازمہ نے ناغہ کیا تو وہ بھی خود ہی دھوتی ہیں، پھر یہ کہ لڑکے کی عمر بھی زیادہ ہے۔''

امیرن خالہ نے بتایا تو پھر دادی خاموش ہو گئیں، گرچہ قمر کا اٹھارہواں سال لگتے ہی انہوں نے اس کی شادی کے لئے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔

اماں اس دن چپ چاپ بیٹھی خلا میں کچھ دیکھتی رہیں۔

پندرہ بیس تو نہیں لیکن دس بارہ لوگ گھر میں ضرور تھے۔ جب سترہ برس کی کامنی سی اماں بیاہ کر آئی تھیں۔ ابا کے والد حیات تھے۔ تین بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ ایک ایرپورٹ میں نوکر تھے۔ ان کی بس علی الصباح آتی تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں ان کا ناشتہ بنتا تھا اور ساتھ لے جانے کے لئے ٹفن بھی۔ اماں کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا۔ دادی اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹتی پڑی سناتی رہتیں، گرچہ اس وقت بڑی مضبوط قد کاٹھی کی محض ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔

اس وقت کوئی نہ گیس چولہا جانتا تھا، نہ فرج، نہ پریشر کوکر۔ رات کا کھانا سب ساتھ کھاتے تو اماں کوئی تیس پینتیس چپاتیاں بنا کر اٹھتیں۔ چولہے کی آنچ سے چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔ سب کو کھلا کر خود کھانے کے بعد باورچی خانہ بند کر کے وہ دادی کے پیر دبا کر سونے کے لئے اپنے کمرے میں آتیں تو رات کے گیارہ بج رہے ہوتے تھے۔ اکثر تو ابا انہیں سوتے ہوئے ملتے۔ وہ خاموشی سے، کہ کہیں شوہر کی نیند نہ کھل جائے، ایک کونے میں سکڑ سمٹ کر لیٹ جاتیں۔

قمر کے ابا، کیا تم نے کبھی سوچا کہ میں بھی کسی کی بیٹی تھی؟

دربیر کی بی بی صبح لوہے کا کرچھل لے کر آگ مانگنے کو آئیں (اور کچھ آگ لگا بھی گئیں)

''اے ہے، ابھی تک چولہا نہیں سلگا، دربیر کی بی بی؟'' اماں نے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

''کل سانجھ کے یہ دیر سے لوٹے۔ سودا سلف کچھ نہیں آیا تھا۔ ابھی جا کے آلو لے کے آئے، تیل لے کے آئے۔ سویرے سویرے کو نو دکان نہیں کھلی رہی۔''

انہوں نے وضاحت پیش کی۔ اماں سمجھ گئیں۔ رات ڈرائیور نے پھر پی ہوگی۔ گھر میں دانتا کل کل بھی ہوئی ہوگی۔ کیا پتہ دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دیے ہوں۔ رمضانی بوا نے چولہے میں لکڑیاں جھاڑ کر کچھ انگارے گرائے، ساتھ ہی پوچھا:

''چائے پیوگی، دربیر کی بی بی؟''

دربیر کی بی بی کے میاں نے کبھی کسی زمانے میں ایک انگریز کی جیپ چلائی تھی۔ انہیں فوری بھرتی کے تحت ٹریننگ دی گئی تھی۔ بہت مہارت حاصل نہیں ہو پائی تھی۔ کچھ اول جلول تھے بھی۔ ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا تو نکالے گئے اور اپنے خاندانی پیشے یعنی چوڑی بیچنے پر واپس آ گئے۔ وہ ذات کے منہیار تھے، لیکن ان کے نام سے ''دربیر'' چپکا تو بس چپکا ہی رہ گیا۔ انہیں بڑا فخر بھی تھا، انہوں نے گورے صاحب کی گاڑی چلائی تھی۔ ان کی اہلیہ 'دربیر کی بی بی' کہلانے لگی تھیں، سو کہلاتی رہیں۔ شوہر جب گاڑی چلاتے تھے اس وقت بھی وہ خاص خاص گھروں میں جا کر چوڑی پہنا آیا کرتی تھیں۔ ان کی چھوٹی سی ناک عموماً چڑھی ہی رہا کرتی تھی۔ خاصی خوبصورت خاتون تھیں اور اپنی خوبصورتی (اور میاں کی بدصورتی) کا انہیں پورا احساس تھا، گرچہ ان کی خوبصورتی بھول کر اکثر دربیر صاحب نشے میں انہیں اچھی طرح دُھن دیا کرتے تھے۔

رمضانی بوا کی چائے کی پیشکش خاصی قابل اعتنا تھی۔ ''پی لیں گے'' انہوں نے بڑے فخر سے جواب دیا، جیسے چائے پی کر بوا پر احسان کریں گے۔

بوا نے اپنا تام چینی کا تاملوٹ اسی وقت چائے سے بھرا تھا۔ اس میں سے کچھ چائے ایک چھوٹی پیالی میں ڈال کر پیالی پرچ میں رکھ کر دربیر کی بی بی کو بڑھا دی۔ انہوں نے چائے پرچ میں نکال کر سڑپ سڑپ کر کے پی لی۔

رمضانی بوا نے دہکتے انگارے کرچھل میں ڈالے اور کرچھل انہیں تھما دیا۔ وہ کرچھل پر پھونکیں مارتی، اٹنگی ساری کا پلو سر پر سنبھالتی، سٹر پٹر دروازے کی طرف بڑھیں، لیکن پھر یکا یک پلٹیں۔ ''چلتے ہیں باجی'' انہوں نے اماں کو مخاطب کیا۔

''اب جلدی بیٹا کے ہاتھ پیلے کرو تو ہم چوڑی کا ٹوکرا لے کے آئیں۔ اب کسی کے یہاں نہیں جاتے، مگر آپ کی بات دوسری ہے۔ کب سے آسرا لکھ رہے ہیں۔ (انہوں نے 'کب سے' پر خاصا زور دیا تھا) کب ختم ہوگی بٹیا کی پڑھائی؟ اچھا سلامالیکم''

وہ سلامالیکم تک پہنچتے پہنچتے دروازے سے باہر ہو چکی تھیں اس لئے سلام بھی ذرا زور سے ادا کیا، جیسے پتھر کھینچ مارا ہو۔

''بڑی آئیں خیر خواہ!'' رمضانی بوا نے چائے تو پلا دی تھی، لیکن دربیر کی بی بی کی دریدہ دہنی انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

''دیکھئے نا باجی، جتا رہی تھیں، بٹیا اتنا پڑھ لکھ گئیں اور اب تک شادی بیاہ کی سن گن نہیں ہے۔ 'کب سے آسرا لکھ رہے ہیں۔' ارے آسرا تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں، مگر ہم کچھ بولتے ہیں کیا؟ وہ بھی ایسے!''

اماں کے جلے پر نمک پڑ گیا۔ اندر ہی اندر تلملا گئیں۔ محلے میں لوگ دو دو تین تین بیٹیاں بیاہ چکے تھے، یہاں ایک کا نصیب کھلنے میں اتنی دیر......اور پڑھاؤ جتنا پڑھیں گی اتنا ہی لڑکا ملنا مشکل ہوتا جائے گا۔

پگلی مہترانی آنگن بہار رہی تھی۔ وہ دربیر کی بی بی کے نکلنے کے بعد داخل ہوئی تھی۔ بات بدلنے کو اماں نے اسے بلا وجہ پکارا، ''بہو، دیکھو ذرا ٹھیک سے جھاڑو لگانا۔ پت جھڑ آ گیا ہے، چاروں طرف پتے اڑتے پھر رہے ہیں۔ قمر......'' انہوں نے قمر کو بھی آواز دی:

''دیکھو، ذرا نالی دھلوا دینا۔''

خاصے بڑے آنگن میں امرود کے دو نوجوان درخت تھے اور نیم کا پرانا جغادری پیڑ۔ اس کے علاوہ لسوڑہ اور انجیر بھی لگے ہوئے تھے۔ لسوڑے کا کوئی مصرف نہیں تھا، سوائے اس کے کہ محلے والے اچار کے لئے مانگ لے جائیں، لیکن اماں اسے کٹوانے کو تیار نہیں تھیں۔ انجیر گھر میں کوئی نہیں کھاتا تھا، سوائے اماں کے۔ نیم کی ہوا بیماریاں دور کرتی ہے اور انجیر صحت کے لئے مفید ہے، خشک لسوڑے کی چائے آنتوں کے لئے فائدہ مند تو تھی ہی، ساتھ ہی خشک کھانسی بھی دور کرتی تھی۔ اس معاملے میں اماں کسی کی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ حجت نہیں کرتی تھیں، بس خاموش ہو جاتیں۔ ان کی ناراضگی، نا رضا مندی اور دل گرفتگی سب کے اظہار کا ایک ہی ذریعہ تھا---ایک پتھرائی ہوئی خاموشی۔

قمر کی کل کی بات کے بعد بھی وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ ابھی جو انہوں نے اسے مخاطب کیا تو اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اسے اماں کی خاموشی سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ بولتی ہیں تو گھر میں ماحول نارمل اور خوشگوار لگتا ہے۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا قمر نے کہ انہیں چپ لگ گئی تھی؟ اس نے بالٹی میں پانی بھرا اور آنگن کے کنارے کنارے لمبائی میں گزرتی نالی میں ڈال کر نالی پگلی سے دھلوائی، پھر اماں کے پاس آ کر ان کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے:

''اماں، ہم کل الہ آباد واپس جا رہے ہیں۔ تم کو ناراض چھوڑ کر کیسے جائیں؟ تم ہم سے بات نہیں کر رہیں۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''بٹیا، ہم سے جو ہو رہا ہے تمہارے بیاہ کے لئے کر رہے ہیں۔ اپنی طرف سے تو اچھا ہی چاہتے ہیں، لیکن اللہ کی مرضی۔ تمہارے لائق رشتہ نہیں مل رہا ہے۔'' ان کی آواز مدھم تھی۔

قمر ایک دم سے آنسو پونچھ کر بدک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کیا اماں سوچ رہی ہیں کہ اسے اپنی شادی کی جلدی پڑی ہے؟ وہ لاکھ منہ پھٹ سہی، ایسا کیسے کہہ سکتی تھی، پھر یہ کہ وہ ایسا سوچتی بھی نہیں تھی۔ نہ اس کی ایسی عمر آئی تھی، نہ ایسی بے شرمی طاری ہوئی تھی، یہ اور بات تھی کہ جتنی بے شرمی وہ برت لیا کرتی تھی وہ اماں کے حساب سے بہت زیادہ تھی، اس لئے اکثر معنی مطلب پہنا لیتی تھیں۔ قمر تلملا کے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک پگلی آن کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ کام ختم کر کے اس نے آنگن میں لگے نلکے پر رگڑ رگڑ کر ہاتھ کہنیوں تک دھو لئے تھے۔ دوپٹے میں ہاتھ پونچھتی ہوئی بولی کہ آج وہ بہو سے لڑ کر بغیر کھائے پیے نکل کھڑی ہوئی تھی، اس لئے اماں اسے فوری طور پر کچھ کھانے کو دے دیں، ورنہ اگلی جمانی میں جاتے جاتے وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ دراصل پگلی کا ناشتہ کھانا کچھ بندھا ہوا نہیں تھا۔ بس مہینے میں دو، کہیں چار روپے تنخواہ کے ملتے تھے۔ کبھی کچھ بچا کھچا ہوا یا از خود مانگ بیٹھی تو مل جایا کرتا تھا۔ جاڑوں میں کسی کسی گھر میں الگ رکھے ٹوٹے ہوئے تسلے یا تام چینی کے چینی جھڑے پیالے میں کبھی کبھار چائے مل جاتی تھی۔

''ہا، دکھیا!''

اماں آنگن پار کر کے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

پگلی جا کے نلکے کے پاس بیٹھ گئی اور اطمینان سے آم کے اچار کے ساتھ رات کی باسی روٹیاں ہبڑ ہبڑ کھاتے ہوئے، پھولتی سانسوں کے درمیان اچار جیسی چٹ پٹی خبر بھی سنائی۔

''حاکم کی سب سے چھٹکی بٹیا الہ آباد ماں پڑھت رہی نا۔ سردارن کا بٹوا بھی وہیں چلا گوا ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ سب لڑکے لڑکیاں پڑھنے کو بڑے شہروں میں نکل رہے ہیں۔ ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے کہ بے پڑھے لڑکیوں کا بھی گزر نہیں۔''

اماں ایسی باتوں میں دلچسپی کم لیتی تھیں جن کی صداقت مشکوک ہو اور جن سے خواہ مخواہ کسی پر حرف آئے۔ ''اپنے کام سے کام رکھا کر، پگلیا۔''

اپنے کام سے کام رکھنے کو پگلی نے نظر انداز کر دیا۔

''کا ہوا؟'' پگلی کے گلے میں چاندی کی خلال پڑی رہتی تھی اور ناک میں چاندی کا بڑا سا پھول۔ اس نے خلال سے دانت کریدے اور ناک کا پھول گھمایا:

''ارے ہوئیں نام لکھایا ہے جہاں حاکم کی بٹیا پڑھت ہے۔ کچھ سمجھا کر دو دیدی!''

اماں گھبرا گئیں۔ پگلی جنہیں حاکم کہتی تھی وہ مسلمان تھے اور لڑکا سردار۔ ملک کے بٹوارے کو ابھی پندرہ سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ جنہوں نے براہ راست کچھ نہیں جھیلا تھا انہیں بھی اس کا بہت کچھ علم تھا اور پھر ایسا کون سا گھر تھا جس کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے اور بھی بہت کچھ دکھائی دیتا رہتا تھا۔ مثلاً پرتاپ گڑھ میں ریلوے ڈپو کے پاس کنکریٹ کے بہت سے چھوٹے چھوٹے چوکور بکسے جیسے لگنے والے کوارٹروں کی ایک پوری کالونی اُگ آئی تھی۔ اس میں جو لوگ رہنے آئے وہ مقامی لوگوں سے الگ تھے۔ ان کا رہن سہن، ان کی زبان، ان کی عورتیں، ان کے گھر کی تہذیب، سب مختلف تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان کے گھر کے مرد اردو اخبار خریدتے تھے۔ لوگ انہیں ''شرنارتھی'' کہتے تھے، لیکن دس سال ہوتے ہوتے وہ عام آبادی میں گھل مل گئے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے انہیں

شرنارتھی کہنا بھی بند کر دیا، ''پنجابی'' کہلاتے یا ''سردار''۔ بڑے محنتی لوگ تھے۔ زیادہ تر نے چھوٹے موٹے کاروبار کیے۔ ایک صاحب تھرمس میں رکھ کر گھر کی بنی ہوئی قلفی لوگوں کے یہاں پہنچانے لگے تھے۔ کوئی پانچ سات برس بعد انہوں نے برف بنانے کی فیکٹری کھول لی۔ فرج لوگ ابھی بالکل نہیں جانتے تھے۔ گرمی میں برف کی بڑی بڑی سلیں برادے کی موٹی تہہ سے ڈھک دی جاتی تھیں، پھر اوپر سے موٹا ٹاٹ ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ سلیں جگہ جگہ دکانوں پر رکھی ہوتیں۔ وہاں سے گاہک تلوا کر برف لے جاتے۔ کچھ لوگ اپنے تھرمس لے کر آتے تھے۔ ان میں چھوٹے ٹکڑے کرا کے بھر کے پہنچاتے۔ یہ برف قریب کے بڑے شہروں سے آتا تھا اور لانے میں کافی ضائع ہوتا تھا۔ شہر میں کارخانہ کھلا تو لوگوں کو بڑی آسانی ہوگئی۔ وہاں آئس کریم بھی جمائی جانے لگی۔ پہلے سردار جی گھر پر گھما گھما کر چلائی جانے والی چھوٹی مشینوں میں قلفی جماتے تھے۔ جن لوگوں نے ذرا ذرا سے کھوکھوں میں کپڑے اور بساط خانے کی دکانیں کھولی تھیں، ان کی اب بڑی بڑی شیشوں سے مزین دکانیں ہوگئی تھیں۔ لڑکے بالے پڑھنے جاتے تھے۔ عورتیں گھر میں ایک نوکر نہ رکھتیں؛ سارا کام خود کرتی تھیں۔ مقامی لوگوں کے یہاں تو معمولی متوسط طبقے میں بھی کل وقتی نہیں تو جز وقتی نوکرانیاں ضرور کام کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے یہاں بوائیں اور ہندو گھروں میں کہاریاں۔

''بڑے جیالے لوگ ہیں'' ایک بار ابا نے کہا تھا:

''لٹ پٹ کے آئے، لیکن دیکھو، شہر پہ چھا گئے۔ کیا مجال جو کبھی کسی نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ ان کے یہاں کا کوئی شخص بھیک مانگتا نظر نہیں آیا۔ کاروبار کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ مقامی زبان و مقامی لب و لہجے میں بولنے لگے ہیں۔ مقامی آبادی میں پوری طرح گھل مل گئے۔''

انہی جیالے، گھل مل جانے والے لوگوں کے یہاں کا ایک گورا، اونچا پورا، نہایت وجیہ لڑکا ایس۔ڈی۔ایم صاحب کے یہاں آنے جانے لگا تھا۔ افسروں کے یہاں حواری مواریوں کی جو بھیڑ رہتی ہے اسی میں وہ بھی کھپا رہتا۔ آخری پوسٹنگ میں ڈپٹی صاحب کو وطن مل گیا تھا، اس لئے ریٹائر ہو کر بھی وہ یہیں رہ پڑے تھے۔ ریٹائر ہوئے تو کچھ ہی عرصے میں خوشامد خوروں کی بھیڑ چھٹ گئی، لیکن وہ لڑکا بنا رہا۔ جب دیکھو تب موجود۔ آنٹی آنٹی کر کے ڈپٹیائن کے پیچھے آگے لگا رہتا۔ گھر کا سودا سلف تک لا دیتا۔

اماں نے گھبرا کر قمر کو دیکھا اور پھر پگلی کی طرف۔

''اچھا چپ رہا کر، بہت بکتی ہے۔''

قمر کی آنکھیں کاغذوں پر تھیں۔ آنسو پونچھ کر وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر اپنے نوٹس درست کرنے لگی تھی۔ چہرے سے ایسا نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے پگلی کی کوئی بات سنی ہے۔ اماں نے اطمینان کی سانس لی اور رمضانی بوا کو ترکاری لانے کے لئے پیسے نکال کر دینے لگیں، گویا پگلی کو بات بالکل ختم ہو جانے کا سگنل دے دیا۔

قمر نے نوٹس پر سے نظریں اوپر اٹھائیں اور جھانجھر بجاتی، پیٹھ پھیر کر باہر نکلتی پگلی کو گھور کر دیکھا۔ نظریں اگر برما ہوتیں تو پیٹھ میں چھید ہو گئے ہوتے۔

''ان لوگوں نے اماں کا دماغ اور خراب کر رکھا ہے۔ ہول گئی ہوں گی۔ الہ آباد میں تو میں بھی پڑھتی ہوں۔ کہیں میرے پیچھے تو آ کے کسی لونڈے نے وہاں نام نہیں لکھوالیا، میرے ہی ڈپارٹمنٹ میں بی۔ایڈ کرنے کے لئے۔''

''ایسی باتیں لڑکیوں بالیوں کے کان میں نہیں پڑنی چاہئیں۔''

رمضانی بوا نے باورچی خانے کی کھونٹی سے ٹنگا اور دھواں کھا کے ملگجا ہوا ترکاری لانے کا تھیلا اتارتے ہوئے کہا۔

''اب تم چپ رہو بوا!'' اماں پھسپھسائیں۔

''جو نہ سنا ہو تو اب تم سے سن لے۔ کل وہ چلی آئی تھیں سڑن، امیرن آپا، ایسی ہی کچھ ہی کچھ اول فول سناتی ہوئی۔ اللہ سے توبہ ہے۔ کیا زمانہ آن لگا ہے؟''

انہوں نے غصے میں چولہے کی جلتی آگ میں بلا وجہ پھکنی اٹھا کر پھونک ماری، پھر زور سے بولیں، جیسے قمر کو سنا رہی ہوں کہ یہاں سبزی ترکاری آٹے دال کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو رہی ہے۔

''آدھا سیر مٹر ضرور لے لینا بوا۔ سنا ہے مٹر آ گئی ہے بازار میں اور سیر بھر نئے آلو تلوا لینا۔ اللہ مارے پرانے بڑے میٹھے ہو چلے ہیں۔ ترکاری کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔''

قمر زیر لب مسکرائی۔ اماں، تم ڈال ڈال تو ہم پات پات۔ ہمیں تو یہ بھی پتا ہے کہ امیرن خالہ کیا پھسپھسا گئی ہیں۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس لوٹتے تو الہ آباد یونیورسٹی کے کئی لڑکے لڑکیاں اکثر بس میں ساتھ سفر کرتے دکھائی دیتے۔ یہ معمول تھا، اتفاق نہیں۔ کئی لڑکیاں گھر سے برقع اوڑھ کر نکلتیں اور بس میں اتار دیتیں۔ گھر والے یہ بات جانتے تھے۔ 'حاکم' کی بیٹی آمنہ سے تو قمر کی کئی بار بس میں ہی ملاقات نہیں ہوئی بلکہ یونیورسٹی میں بھی آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ آج بھی وہ بس میں تھی۔ کئی اور لڑکے بھی تھے۔ جگجیت بھی تھا جو بالکل پیچھے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ آمنہ اور قمر برابر کی سیٹوں پر تھیں۔

''ہمارے تمہارے درمیان الہ آباد کے علاوہ ایک اور لنک (Link) بھی ہے۔''

قمر نے مسکرا کر آمنہ سے کہا۔ آمنہ بے حد کم سخن تھی۔ جواب میں اس نے صرف بڑی بڑی اداس آنکھیں اٹھا کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''پگلی مہترانی!''

قمر نے آمنہ کی خاموش نگاہوں کے سوال کا جواب کچھ یوں دیا کہ وہ کم سخن لڑکی بھی بے اختیار ہنس پڑی۔ پگلی آمنہ کے یہاں بھی کام کرتی تھی، مگر

شناساؤں کے درمیان اس کا ذکر کبھی یوں نہیں آیا تھا۔

''ہنس لو'' قمر نے پھر کہا:

''وہ اماں سے کہہ رہی تھی کہ حاکم کی بٹیا جہاں پڑھتی ہے وہاں سرداروں کے لونڈوں نے بھی نام لکھوایا ہے۔''

ایک اضطرابی کیفیت کے تحت آمنہ کا سر پل بھر کو پیچھے گھوما۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر قمر سے خاموش رہنے کی گزارش کی۔ اس کی اچانک آجانے والی ہنسی یوں غائب ہوگئی تھی جیسے سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ گھاس پر پڑی اوس کی بوندیں۔

''پگلی کو ابھی یہ پتا نہیں چلا ہے کہ میری شادی تقریباً طے ہو چکی ہے، ورنہ یہ بھی الم نشرح ہو جاتا۔''

کچھ دیر کے بعد آمنہ نے رسان سے کہا، اس کے بعد پورا سفر خاموشی سے گزار دیا۔

فروری کے مہینے میں ریٹائرڈ حاکم کے یہاں سے ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا۔ یہ کارڈ دراصل آمنہ نے قمر سے یاد اللہ کی وجہ سے بھجوایا تھا۔ قمر کے امتحان مارچ میں ہونے والے تھے، اس لئے وہ گھر نہیں آسکی تھی۔ اب ڈپٹی صاحب کے گھر کا بلاوا تھا، اس لئے اماں گئیں۔ نہ جانے کیوں انہوں نے راحت کی سانس لی تھی۔ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ! کنکھیوں سے انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اونچا پورا، گورا چٹا، خوبصورت سردار لڑکا سارے انتظامات میں پیش پیش ہے اور گھر کے اندر بھی بلا تکلف آ جا رہا ہے۔

''سنتے ہیں، بٹیا کی ڈولی اٹھی تھی تو بہت رویا۔'' سارے فسانے میں جس بات کا ذکر نہیں تھا، یقیناً پگلی نے اپنی طرف سے جوڑی ہوگی، اماں نے سوچا، لیکن شہر کے کئی گھرانوں، خصوصاً سول لائنز کی آبادی میں یہ بات چرچا کا موضوع بنی کہ آمنہ کی ڈولی اٹھی تو جگجیت سنگھ بہت رویا تھا۔

''عورتوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ کون تھا وہ لڑکا؟'' ایک خاتون نے رخصتی کے فوراً بعد پوچھا تھا۔

آمنہ کی والدہ نے کہا: ''بہت زمانے سے آتا تھا، بہن کی طرح مانتا تھا مِنّا کو۔''

مقامی ڈاکٹر رام چرن داس کھتری کی دو بیٹیاں بھی الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھیں۔ ایک تو آمنہ کی کلاس فیلو بھی تھی۔ ڈپٹیائن نے جب یہ بہن کی طرح ماننے والی بات کہی تو دونوں وہیں موجود تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرائیں۔

سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کے سامنے بڑا سا لان تھا۔ اس میں پتھر کے اسٹول بنے ہوئے تھے۔ وہاں وہ دونوں اکثر چپ چاپ بیٹھے دکھائی دیتے۔ ان کے چہروں پر ایسی معصومیت، ایسی اداسی، ایسی خاموشی بکھری ہوتی تھی کہ کسی نے مذاق نہیں اڑایا، کبھی ایک بھی نازیبا جملہ نہیں کسا۔ بس ایک مرتبہ ایک لڑکی نے، جو خود جگجیت پر فدا تھی، بڑی حسرت سے کہا تھا:

''آمنہ، یہ جگجیتا بڑا خیال رکھتا ہے تمہارا!''

خفیف سی دھار رقابت کی بھی تھی۔ ''تمہارے لئے گھر کا کھانا لے کے آتا رہتا ہے۔''

''ہاں، ماں بھیجتی رہتی ہیں۔''

آمنہ نے ستھری نظریں اٹھا کر سادگی کے ساتھ سادہ سا جواب دیا۔ کس کی ماں، یہ وضاحت اس نے نہیں کی۔ جگجیت ہمیشہ سے آمنہ کے بنگلے پر آتا رہتا تھا۔ الہ آباد اور پرتاپ گڑھ میں فاصلہ اتنا کم تھا کہ اکثر وہ سنیچر کی شام کو گھر بھاگ آتا اور پیر کو علی الصباح واپس لوٹ کر کلاسز کر لیتا۔ لوٹتا تو ڈبوں میں بھرواں پراٹھے، کوئی سوکھی سبزی اور آم کا اچار لے کر آتا۔ اس کی ماں بڑے عمدہ پراٹھے بناتی تھی۔

''گرم اور زیادہ مزیدار ہوتے ہیں منا!'' وہ ہر بار کہتا۔

''لیکن میری ماں پراٹھے اتار رہی ہو اور تم پاس بیٹھ کر کھا رہی ہو، یہ سپنا تو سپنا ہی رہ جائے گا۔'' اور آمنہ کی آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو جاتی۔

یہ اور ایسے بہت سے سپنے دل میں لیے آمنہ، فرسٹ کلاس ایم۔اے سوشیالوجی، ریٹائرڈ ڈپی۔سی۔ایس افسر کی بیٹی، خاموشی سے کسی اور کی ماں کو پراٹھے تل کر کھلانے کے لئے وداع ہو گئی۔

ایسے قصے خال خال سہی، لیکن سننے میں آ رہے تھے۔ سنانے والوں کے لہجے میں معنی کی دنیا پنہاں ہوتی۔ کوئی سمجھتا، کوئی ٹال جاتا، لیکن قمر کی اماں بیٹی کے الہ آباد جانے کے بعد سے ہر وقت خوفزدہ رہا کرتی تھیں۔ امیرن خالہ بتا رہی تھیں کہ پرلے محلے کے ایک باعزت کایستھ گھرانے کی بیٹی اپنے سگے چچا زاد کے ساتھ بھاگ گئی اور شادی رچا کے واپس لوٹی۔ اب بھلے ہی دکن کے کچھ ہندو سگے ماموں بھانجی کی شادی کو افضل قرار دیں، لیکن شمالی ہندوستان کا کوئی ہندو کسی بھی زاد سے شادی کو قبول نہیں کرتا۔

''ہمارے یہاں یہ شادیاں جائز ہیں، اسی لئے ہمارے وقت میں ماموں زاد، خالہ زاد وغیرہ سے بھی زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیتے تھے۔ سامنے تو خیر جاتے تھے، تھوڑا بہت ہنس بول بھی لیتے تھے، لیکن ماں، نانی، دادی، خالہ، پھوپھی کی چیل جیسی نظروں تلے۔ اب دیکھو تو لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہیں۔ قمر کہہ رہی تھی کہ بس میں آ رہی تھی تو ساتھ کے دو لڑکے بھی تھے۔ راستے بھر ہنستے بولتے چلے آئے۔ بڑے اطمینان سے کہہ گئی، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے باپ کی مت ماری گئی تھی جو پہلے بی۔اے اور پھر بی۔ایڈ کے لئے بھی باہر بھیج دیا۔ پرتاپ گڑھ میں تو مجال نہیں کہ بغیر برقعے کے نکل جائیں، لیکن ادھر بس میں چڑھیں یا ٹرین میں بیٹھیں اور برقع جھولے میں۔''

لاکھ قمر چڑتی، لیکن اماں اس کے سیاہ رنگ کے بڑے سے اسمارٹ بیگ کو وہ ''جھولا'' ہی کہتیں اور ''بی۔ایڈ'' نہ کہہ کر ''استانیوں والی پڑھائی۔''

رزلٹ آنے سے پہلے سے ہی قمر اخباروں پر جھکی، نوکریوں کے اشتہار دیکھتی رہتی تھی۔ دو انگریزی اخبار لگا لئے تھے۔ ابا تو 'سیاست' منگایا کرتے تھے۔ ماں بولتی کچھ نہیں تھیں، بس گھبراتی رہتی تھیں۔ 'لو جی، اب یہ نوکری بھی کریں گی۔ اب تک تو یہ تھا کہ لڑکی پڑھ رہی ہے، لڑکی پڑھ رہی ہے۔ یا مولا مشکل کشا!''
رزلٹ آیا تو وہ اور شد و مد سے خالی جگہوں کے کالم پر نظریں دوڑانے لگی۔

''ابا'' ایک دن اس نے خبر سے نظریں اٹھائے بغیر باپ کو مخاطب کیا: ''یہ ملازمت بہت معقول معلوم ہو رہی ہے، لیکن درخواست منگائی ہے باکس نمبر کی معرفت۔ اللہ جانے کہاں ہے اسکول، کس شہر میں ہے۔ درخواست دیں؟''

''درخواست دینے میں حرج نہیں،'' ابا نے جواب دیا۔

''جگہ بھی مناسب ہوئی، یعنی آس پاس، تو ٹھیک، ورنہ چھوڑ دینا، مت جانا۔''

''میں کچھ کہوں تو کانوں تیل ڈال کے بیٹھ جاتے ہیں، نوکری کے لئے جھٹ سے بیٹی کی بات سننے کو تیار۔ لڑکا ڈھونڈنے میں مستعدی دکھائیں تو ہم جانیں!''

اماں منہ ہی منہ میں بدبدائیں۔ ابا کے زیادہ منہ لگنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ تو کچھ ایسا قائل کرتے رہے تھے کہ جیسے بی۔ ایڈ کرتے ہی لڑکا آسمان سے اب اترا کہ جب اترا۔ ''سلمان چچا والے رشتے کو منع نہ کیا ہوتا تو بلا سے روٹیاں پکاتی، بیس کہ پچیس کی، آج گود میں ایک دو بچے کھیلتے ہوتے اور اب کون سی روٹیاں پکانے سے فرصت ملے گی! عورت کا جنم--- ماسٹری بھی کریں گی اور روٹی بھی ٹھوکیں گی۔ ہم سے زیادہ سخت زندگی گزرے گی۔'' انہوں نے سروتا چلایا اور کھٹاک سے ڈلی کے دو ٹکڑے کیے۔

''اماں کل جبھی تھیں کیا؟''

قمر نے اپنے گالوں پر تھپڑ لگائے۔ ''میں کتنی بری بیٹی ہوں! میں یہ بھی تو سوچ سکتی تھی کہ اماں کو الہام ہوا تھا، یا ان کی زبان پر سرسوتی آن بیٹھی تھی۔'' اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پڑوس کے مکان کی کال بیل دبائی۔ دونوں بچیاں اچھلتی ہوئی باہر آئیں۔ پیچھے پیچھے نیک دل، ادھیڑ عمر، تنہا رہنے والی، مہربان پڑوسن جنہیں گویا اللہ میاں نے تعینات کر دیا تھا کہ قمر کی نوکری اور گرہستی دونوں چلتی رہیں۔ ''ہاں بھائی، سنبھالو،'' انہوں نے روز کا جملہ دہرایا اور شفقت سے مسکرا کر دروازہ بند کر لیا۔

بچیوں کا اسکول قمر کے اسکول سے پہلے چھوٹ جایا کرتا تھا، وہ کوئی دو گھنٹے بعد آتی تھی۔ اس دوران بچیاں ان خاتون کے گھر رہتی تھیں جنہیں قمر 'شانتی آنٹی' کہتی تھی اور لڑکیاں 'شانتی نانی'۔

اپنے دروازے کا تالا کھول کر قمر اندر داخل ہوئی۔ دو دن سے بوا نہیں آ رہی تھی۔ باورچی خانے کا سنک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ قمر نے جلدی سے ایپرن چڑھایا اور کچھ ضروری برتن دھو کر الگ ہٹائے، باقی یونہی رہنے دیے۔ فرج سے گندھا ہوا آٹا اور سبزی نکالی جو وہ سویرے ہی دھو کاٹ کر رکھ گئی تھی۔ جلدی سے ایک طرف سبزی چڑھا کر توا ڈالا اور پراٹھے سینکنے شروع کیے۔ بچیوں نے فرج کھول کر اپنے لئے کولڈ ڈرنک نکال لیا تھا اور میز پر رکھے کیلوں کے گچھے سے کیلے لے لئے تھے۔

''زیادہ کیلے مت کھانا!'' قمر نے پکار کر کہا۔

''کھانے کا وقت ہے۔ بس ابھی لائی، یوں!'' اس نے چٹکی بجائی، پھر اس نے جلدی سے میز پر پراٹھے، سبزی اور دہی کا سادہ سا کھانا لا کر رکھ دیا اور دل میں سوچا کہ آج یہ گیس، پریشر کوکر اور فرج ایک ہاؤس وائف کے لئے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اس نے تولیہ سے ہاتھ پونچھے اور خود بھی پاس بیٹھ گئی۔

''پھر وہی لوکی'' بڑی بچی منمنائی۔

''چپ چاپ کھالو۔ دیکھ نہیں رہی ہو، ممی کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔''

قمر نے حیرت سے دیکھا۔ چھوٹی کو چھ سال پورے ہونے میں ابھی دو تین مہینے باقی ہی تھے۔ اتنی سمجھ اور ماں کے لئے ایسی ہمدردی؟ قمر کا جی بھر آیا۔ ویسے بڑی صرف گیارہ مہینے بڑی تھی۔ دونوں آگے پیچھے اتنی جلدی ہو گئی تھیں کہ جڑواں جیسی لگتی تھیں۔ پراٹھے کا نوالہ لے کر بڑی لڑکی نے اپنی نکتہ چینی کی تلافی کی:

''کوئی بات نہیں ممی، دہی بھی تو ہے۔ ہم دہی شکر کے ساتھ بھی کھا لیں گے۔'' قمر نے شکر دان اس کے سامنے سرکا دیا جو وہیں میز پر رکھا تھا، پھر دونوں کی پلیٹ میں کھانا نکال کر اٹھ گئی۔

''ممی، تم؟''

''میں پہلے کچن صاف کر لوں، پھر نہا کر اطمینان سے کھاؤں گی۔''

صفائی کے کوئی گھنٹہ بھر بعد وہ غسل خانے میں داخل ہوئی۔ نہا کر ساری کی جگہ شلوار قمیص پہنی۔ اس نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا تو نیند سے آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ گرمیوں کی سہ پہر تھی۔ ایک گھنٹہ ہلکی جھپکی، پھر اٹھ کر بچیوں کا ہوم ورک کرانا، شام کی چائے کے لئے کچھ تیار کرنا۔ چھ بجے انیس آ جائے گا، اس کے حوالے بچیوں کو کر کے وہ بازار جائے گی۔ رات کے کھانے میں کچھ اچھا پکنا چاہیے۔ دال، چاول، ایک سبزی گوشت یا مرغ کا سالن، روٹیاں۔ کبھی کبھی گوشت پکانے کی جگہ وہ کباب لے آتی تھی۔ انیس شاذ و نادر ہی خریداری کے لئے نکلتا، لیکن کھانے میں کمی ہو تو ٹوک ضرور دیتا تھا۔ ''ایک وقت ہی تو چین سے پورا کھانا کھانے کو ملتا ہے، ورنہ آفس میں تو وہی سوکھی روٹی، سوکھی سبزی۔''

''کبھی تم بھی کچھ لے آیا کرو،'' قمر نے ایک آدھ بار طعنہ دیا تو اس نے ٹکا سا جواب ٹکا دیا؛ ''یہ تمہارا ڈپارٹمنٹ ہے۔'' بس کبھی کبھی بیوی اور دونوں بچیوں کو اسکوٹر پر بیٹھا کر حضرت گنج لے جا کر آئس کریم کھلاتا تھا یا کچھ پھل خرید

لیتا۔

''آں.....'' بڑی لڑکی قمر کی پلیٹ میں جھانکنے لگی تھی۔

''ہم کو لوکی کھلا کر تم کیا کھا رہی ہو؟.....'' اس نے متجسس نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''من و سلویٰ......کھاؤ گی؟'' قمر نے ہنس کر کہا: ''بیوقوف، فرج میں پرسوں سے دال پڑی تھی، میں نے سوچا کھا کے ختم کروں۔ تمہارے پاپا تو فرج میں رکھی دال کھاتے نہیں اور تمہیں ہری سبزی کھانی چاہئے، اس لئے لوکی بنادی۔'' لڑکی اتنا طویل لکچر سننے سے پہلے سانپ سیڑھی کے لوڈو پر جھک گئی تھی۔ دال اسے یوں بھی سخت ناپسند تھی۔ اس سے اچھی تو لوکی کی سبزی تھی۔

میں بالکل اماں جیسی ہوتی جارہی ہوں، قمر نے ہول کر سوچا: کہیں لڑکیوں کے ساتھ اتنی ہی سخت گیر بھی نہ ہو جاؤں۔

''ادھر آؤ'' اس نے دونوں کو پکارا۔ وہ فوراً پاس آ گئیں۔ قمر نے پلیٹ ہاتھ سے رکھ دی، انہیں گود میں بیٹھا لیا، پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور دل ہی دل میں بولی:

''میرے اور تمہارے بیچ اتنا جنریشن گیپ نہیں ہوگا جتنا میرے اور اماں کے بیچ تھا، بھلے ان کی طرح باسی کھانا سوارت لگاتی پھروں۔''

''لوڈو پھر کھیل لینا، کچھ دیر چلو چل کر سوتے ہیں، پھر ہوم ورک اور تب کھیل۔'' اس نے پیار سے دونوں کو گود سے ہٹا دیا۔ چھوٹی اس سال ایر کے جی ختم کر کے اسٹینڈرڈ ون میں آنے والی تھی اور بڑی آ چکی تھی۔ دونوں کو ہوم ورک ملتا تھا۔ انیس تو صفا ہاتھ جھاڑ لیتا:

''تم ٹرینڈ ٹیچر ہو، اسکول میں پڑھاتی ہو، میں نو بجے سے چھ بجے تک آفس کرتا ہوں۔ میرے دماغ میں یوں بھی طاقت نہیں رہ جاتی۔'' انیس اس بات پر بہت زور دیتا رہتا تھا کہ وہ نو سے چھ تک آفس کرتا ہے جب کہ قمر دو ڈھائی بجے گھر آ جاتی ہے اور پھر اسے چھٹیاں بھی بہت ملتی ہیں۔ جب دیکھو تب کسی نہ کسی وجہ سے اسکول بند۔

''ارے تمہارا کیا ہے، عیش ہیں تمہارے تو، عیش۔ دو مہینے پورے! ہمیں نہ مل جائیں گرمی کی چھٹیاں۔ ارے دس بیس روز کی بھی مل جائیں۔'' گرمی کی چھٹیوں بھر وہ طوطے کی طرح دہراتا رہتا تھا۔

بظاہر یہ سچ بھی تھا، لیکن انیس نے یہ سوچنے کی زحمت شاید کبھی نہیں کی تھی کہ ایک بار گھر واپس آ جانے کے بعد اسے کچھ نہیں کرنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار تو اسے بھی چھٹی ملتی تھی، پھر اتوار تو تھا ہی۔ اس میں وہ سوتا تھا یا دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس جا بیٹھتا۔ گھر پر مزے سے ٹی وی دیکھتا، چائے کے ان گنت کپ پیتا جو ظاہر ہے قمر ہی بناتی تھی۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا کہ وہ قمر کو تنگ کرنے کے لئے اتنی چائے پی رہا ہے۔ قمر نے ایک بہت مہنگی کمپنی کا ہیلتھ ڈرنک خریدا تھا۔ وہ رات میں بچیوں کو دیتی تھی اور اسی وقت ایک کپ بنا کر انیس کو بھی۔ خود اس نے کبھی نہیں لیا۔ گھر دو تنخواہیں آ رہی تھیں، لیکن پھر خرچ بھی تو ویسے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو بچیوں کا انگریزی اسکول۔ اگر وہ بھی ملازمت نہ کر رہی ہوتی تو بچیاں اس مہنگے اسکول میں کبھی نہیں جا سکتی تھیں۔ انیس چاہتا تھا کہ ان کے یہاں ایک بچہ اور ہو۔ شاید اس بار لڑکا ہو جائے۔

''میں اپنے بیٹے کے ساتھ فٹ بال کھیلوں گا اور کرکٹ''

وہ بڑے ارمان سے کہتا تھا اور اسے اپنی ماں اور قمر کی ماں، دونوں بوڑھیوں کی حمایت حاصل تھی، لیکن قمر ابھی تک اڑی ہوئی تھی۔

''تم سب نے مل کر گارنٹی لی ہے کیا کہ اس بار بیٹا ہی ہوگا؟'' ایک بار اس نے اپنی فطری کٹ حجتی کے ساتھ چڑ کر کہا تھا۔

''اماں کو ایک بیٹی کے بیاہ میں دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ میرے پاس دو ہیں۔ تیسری بھی بیٹی ہو گئی تو کہاں ٹھکانے لگاؤں گی؟'' لیکن یہ کہتے ہوئے قمر کو شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اماں تو اماں، اس میں لنگی جمادارن کی روح کا بھی کچھ حصہ حلول کر چکا ہے۔

اس دن قمر کا ہائی اسکول کا رزلٹ آیا تھا، اس لئے وہ صبح اسے اچھی طرح یاد تھی۔ فرسٹ ڈویژن کا نشہ اچھی طرح یاد تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے لئے باہر نہ جا سکنے، بوائز اسکول میں نام لکھوا کر سائنس نہ پڑھ سکنے کی شدید مایوسی اچھی طرح یاد تھی اور یاد تھی لنگی جمادارن، جو آنگن میں جھاڑو لگاتے لگاتے یکا یک رک کر جھاڑو کے لانبے ڈنڈے پر ٹھڈی ٹکا کر کھڑی ہو گئی تھی اور انتہائی تاسف کے ساتھ ایک ہاتھ کی انگلی ناک پر رکھ کر بولی تھی:

''ہائے رے دیا، پھِن بٹیا!'' (یا مالک، پھر بیٹی ہو گئی!)

ہاتھ میں اخبار لہراتے ابا اور برقع پھڑ کاتی امیرن خالہ ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ امیرن خالہ تو سلام تک کرنا بھول گئیں۔ ''صبح صبح بٹیا ہوئی ہے شکلائن کے یہاں۔'' انہوں نے پھولتی سانسوں کے درمیان بتایا۔ ان کے ساتھ ہی ابا نے تقریباً نعرہ لگایا:

''لو بٹیا، آ گیا فرسٹ کلاس! کتنا ڈری ہوئی تھیں تم۔''

قمر دوڑ کر ابا سے لپٹ گئی۔ انہوں نے ہولے سے سر پر ہاتھ رکھا اور الگ کو ہٹ گئے۔ بچوں کو لپٹا چمٹا کر پیار کرنا اس وقت کے بڑوں کا شیوہ نہ تھا۔ سچ پوچھا جائے تو براہ راست پیار کا کسی بھی طرح کا اظہار نہیں تھا۔

''چلو جاؤ، نفل نماز ادا کرو، قمر'' اماں نے اتنا ہی کہا اور امیرن خالہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ شکلائن سے ان کی بڑی پٹتی تھی۔

''اے ہے، تیسری بھی بیٹی ہی ہو گئی، کہاں نمٹائیں گے؟ ان لوگوں کے یہاں تو تلک میں بھاری بھاری رقمیں بھی خرچ ہوتی ہیں۔''

''ہئی ہے!'' امیرن خالہ نے برقع اتار کر تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''شکلا جی کی اماں کہتی تھیں، اس بار بھی بیٹی ہوئی تو انہیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ دراصل یہ تیسری نہیں، چوتھی بیٹی ہے۔ پہلی دو چار دن کی ہو کے سوری میں ہی ختم

ہوگئی تھی۔''

''اماں، ہمارا فرسٹ ڈویژن آیا ہے۔'' قمر نے زچ ہوکر زور سے پکار کر کہا۔

''جاہل عورتیں! وہ پہلے شکلا جی کی بیوی کا ماتم تو کرلیں'' بڑبڑاتے ہوئے ابا باہر چلے گئے۔

امیرن خالہ رشتے میں اماں کی بہن لگتی تھیں۔ عمر میں چھوٹی تھیں اس لئے سالی ہونے کے ناتے ابا کے منہ لگ کر بول لیا کرتی تھیں۔ ویسے بھی وہ ہڑ بڑ ہڑ بڑ بولنے کے لئے مشہور تھیں۔ تنک کے بولیں:

''ہاں بھائی صاحب، کہہ لیجئے، ہم تو واقعی جاہل ٹھہرے، لیکن قمر سے پہلے ہماری آپا نے دو بیٹے نہ جنے ہوتے تو ہم آپ سے پوچھ لیتے کہ آپ کتنے عالم فاضل ہیں اور بیٹے بھی کیسے کہ لائق ---علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں۔''

پھر آواز قدرے نیچی کر کے بولیں:

''ایک ہی لڑکی ہے اس لئے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔ ارے زیادہ چھانئے مت، کہیں خدانخواستہ کرکرانہ کھائیں۔''

ابا ان کی زد سے باہر نکل گئے تھے، لیکن اماں تو سب سن رہی تھیں۔ بات بدلنے کو انہوں نے بٹوے سے دو روپے نکال کر پگلی کو مٹھائی کھانے کے لئے دیے۔

''چلو، بٹیا کے پاس ہوئے کی مٹھائی تو کھائے کو ملی۔ سوچا تھا اب کی شکلائن سے چاندی کی جھانجھر لیں گے۔'' پھر اماں کا دیا ہوا ڈلی چونا ہاتھ کے پیالے میں لیتی ہوئی بولی:

''ٹھیک کہت ہیں بڑی سکلائن۔ شکلا جی کو چاہئے کہ ڈوسر بیاہ کر لیں۔ اتنی جمین جائیداد گاؤں میں ہے۔ سب داماد آ کے کھائے جہیں۔ ایک ٹھو، بٹوا جروری ہے۔''

وہ اپنی گلٹ کی جھانجھریں بجاتی چل دی۔

''اس کا نام یونہی پگلی تھوڑی پڑ گیا۔ پاگل تو ہئی ہے، خبطی کہیں کی!'' قمر نے غصے سے کہا۔

''گھر کے پرانے لگے ہوئے نوکروں سے اس طرح بات نہیں کرتے!'' اماں نے جھڑکا۔ ''خواہ وہ جمادارن ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا ہے جو سنا نہیں۔''

''سن لیتی تو کیا کرتی؟''

''کچھ نہیں کرتی۔ اسے تکلیف ہوتی تو تمہیں گناہ ہوتا۔ پلٹ کے جواب دیتی تو تمہاری بے عزتی ہوتی۔''

''اماں، تمہارے نزدیک ہم پگلی سے بھی گئے گزرے ہیں؟'' قمر نے پیر پٹخے۔ ''مہترانی تمہیں زیادہ عزیز ہے۔''

''کیا ہوگیا ہے آج کل کے بچوں کو؟'' اماں نے تاسف سے سوچا۔

''یہ لڑکی کہاں کھپے گی۔ اس قدر بدزبان!''

قمر کی ''کھپتے کھپتے'' عمر شریف اٹھائیس برس ہو رہی تھی اور اماں کو برے برے خواب آنے لگے تھے۔ بڑی خوش فہمی تھی اماں کو--- پڑھائی ختم ہوتے ہی شادی کر دیں گی، لڑکا اب حاضر ہوا کہ تب۔ لڑکا فوری طور پر حاضر نہیں ہوا تو نوکری تو ہو جاتی۔ لڑکوں میں سے ایک نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ چونکہ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا، اس لئے وہیں اپنے ہی ڈپارٹمنٹ میں جگہ مل گئی۔ دوسرے نے ایم۔ کام کیا تھا، وہ ایل آئی سی میں نوکری پا گیا۔ انٹرویو کے لئے بمبئی بلایا گیا تھا، آرام سے چلا گیا۔ ناسک میں پوسٹنگ ہوگئی، آرام سے رہ پڑا۔ قمر نے باکس آفس کی معرفت جہاں درخواست بھیجی تھی، وہ ایک دور افتادہ شہر تھا۔ اسکول میں بورڈنگ نہیں تھا۔ سلیکشن ہو جانے کے باوجود قمر نہیں جا سکی۔ پرنسپل نے کہا بھی کہ وہ ایک شریف گھرانے کو جانتے ہیں، وہاں بطور پیئنگ گیسٹ رکھوا دیں گے، لیکن ابا اماں دونوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ لڑکی پڑھ رہی ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں، لیکن نوکری کرنے کے لئے اکیلی لڑکی نہ جانے کہاں، کس کے یہاں رہتی پھر رہی ہے، یہ کوئی سمجھنے کو تیار نہیں ہوگا۔ ایک بار سرکاری ملازمت ملی۔ اس میں تو اور بھی کوردہ دیہات میں بھیج دیا گیا۔ قمر نے خود انکار کر دیا۔ وہاں جا کر اسکول دیکھنے کے بعد اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

- جاری ہے -

''معصوم خواہش''

یتیم بچے نے اپنی کلاس ٹیچر سے معصوم خواہش ظاہر کی کہ Parent Teacher Meeting کے لئے اس کے والد کے طور پر ترکی صدر مملکت کو بلایا جائے۔

ٹیچر نے اس کے اصرار پر خط لکھ دیا لیکن ساتھ اسے سمجھا دیا کہ صدر بہت مصروف آدمی ہیں، اگر وہ نہیں آئے تو تم نے پریشان نہیں ہونا۔

اور سب کے لئے خوشگوار حیرت کی بات یہ ہوئی کہ صدر طیب اردگان اس میٹنگ کے دن سکول آ گئے اور انھوں نے بچہ کے گارڈین کے طور پر میٹنگ میں شرکت کی۔

اہم بات یہ نہیں کہ اس سے دنیا تبدیل ہوگئی بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس سے بچے کی ذہنی زندگی ہمیشہ کے لئے تبدیل ہوگئی۔

یہ وہ مقام ہے جو تاریخ میں بہت کم حکمرانوں کو نصیب ہوا۔ حکمران پوری قوم کا گارڈین ہے لیکن اس ذمہ داری کا احساس بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا۔

○

'' آسرائے رسولؐ ''

نعت رسول ﷺ

جسے خدا کی طلب ہو، وہ ہو فدائے رسولؐ
کہ اس مراد کا حاصل نہیں سوائے رسولؐ

ادب ہُوا ہے فقط آپؐ کے لیے تخلیق
اسے جہاں میں اُتارا گیا برائے رسولؐ

جو دیکھئے تو نہیں سایہ آپؐ کا موجود
جو سوچئے تو نظر آئیں سب پہ چھائے رسولؐ

ہے تاجِ عرشِ معلیٰ نبیؐ کا نقشِ قدم
فلک کی آنکھ کا سرمہ ہے خاکِ پائے رسولؐ

وفورِ شوق سے دو نیم ہو گیا مہتاب
پسند آئی اسے اس قدر ادائے رسولؐ

یہ مہر و ماہ یہ گلزار، انجمنوں کی قطار
لیے ہوئے ہیں سبھی نورِ خاکِ پائے رسولؐ

جگہ ہے کونسی وہ جس جگہ نہیں موجود
نبی کے نقشِ قدم اور جلوہ ہائے رسولؐ

جیوں تو نام مرا ہو نبی کا دیوانہ
مروں تو قبر پہ تحریر ہو گدائے رسولؐ

وہ شیؔوہ حشر کے دن نامراد کیا ہو گا
جسے نصیب ہے دنیا میں آسرائے رسولؐ

شریف شیوہ
(لاہور)

سلام

لہو کے دشت میں تنہا کھڑا ہے
حسینؓ ابن علیؓ کا حوصلہ ہے
جو کربل میں زمانہ سن رہا ہے
محمدؐ کے نواسے کی صدا ہے
وہیں ٹھہری ہے بادِ نو بہاری
جہاں شبیر کا خیمہ لگا ہے
گلا جو اک شقی نے کاٹ ڈالا
نبیؐ کا بارہا چوما ہوا ہے
یہ قطرے جو چمکتے ہیں لہو کے
پیامِ صبحِ نو لکھا گیا ہے
حسینؓ ابن علیؓ زندہ ابد تک
نشانِ شمر کب کا مٹ چکا ہے
جلے ہیں کتنے سورج اُس دیئے سے
ترے ہاتھوں جو خیمے میں بجھا ہے
تجھے پڑھتے رہیں گے آیتوں میں
مرے مولا تو آلِ مصطفیٰ ہے
عدو کے پاس مال و زر نہیں کم
ہمارے پاس خاکِ کربلا ہے
یہ کس کے ہجر میں رویا ہے بادل
یہ کس کے غم میں صحرا جل رہا ہے
مرے شعروں کی تم قسمت تو دیکھو
لباسِ کربلا پہنا ہوا ہے
عدیلؔ اڑ جائے گا سب رنگ ہستی
بقا کا کربلا ہی راستہ ہے

ابرہیم عدیل
(جھنگ)

زریاب

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

میں کچن میں کام کر رہی تھی۔ اچانک ڈھول بجنے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ آوازیں قریب ہوتی جارہی تھیں، ڈھول کی آوازوں کے ساتھ اب ''دمادم مست قلندر'' کی بھی آوازیں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک دم میرے منہ سے نکلا:

''لو بھئی! سہون کے متوالے فقیر چندہ لینے آ گئے۔''

یہ سال میں ایک مرتبہ اور کبھی دو مرتبہ اسی انداز میں چندہ لینے آتے ہیں۔ پانچ یا چھ آدمی ہوتے۔ ایک شخص ڈھول بجاتا، ایک بڑا سا چمٹا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے اس کو بجاتا، تیسرا لکڑی کی ایک تختی میں لگے گھنگروؤں کو بجاتا، چوتھا بڑا سا جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہوتا اور باقی لوگ ناچتے ہوئے ''دمادم مست قلندر'' کے نعرے لگاتے۔ جب تک یہ گلی میں رہتے، آوازوں کا ایک سیلاب پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لئے رہتا۔

یہ لوگ ہمارے گیٹ کے نزدیک آ چکے تھے اور آوازوں کا شور۔۔۔ مت پوچھیں؟ میں ایک دم بھاگی ''مِنال'' کہتی ہوئی۔ مجھے یقین تھا وہ آوازوں کے شور سے گھبرا کر اٹھ چکی ہوگی اور رو رہی ہوگی۔ لیکن کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا مِنال اسی طرح لیٹی سو رہی تھی جیسے میں نے اسے لٹایا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی ناک کے سامنے اپنی انگلیاں رکھیں۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ پھر میں نے اس کی نبض دیکھی، ہاتھ پکڑنے سے وہ تھوڑی سے کلبلائی۔ نبض بھی بالکل صحیح تھی۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں اٹھی اور پیسے نکال کر چوکیدار کو دئے یہ وہ ان لوگوں کو دیدے۔ پیسے ملنے کے بعد وہ مست آگے بڑھ گئے اور آوازوں کا شور آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔

''مِنال اتنے شور میں کیسے بے خبر سوتی رہی؟'' یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔

احمد آفس سے آئے، میری شکل دیکھ کر پوچھنے لگے:

''کوئی پریشانی ہے؟''

میں نے اس کو اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ ہم دونوں نے کچھ ٹیسٹ کیے۔ مِنال کو بٹھا کر اس کے پیچھے جا کر اسے آوازیں دیں، تالیاں بجائیں، برتن گرائے، برتنوں کو بجایا مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی اپنے ایک کھلونے کو لئے ہوئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی بھی آواز سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ہماری قوتِ گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی۔ ہماری نگاہوں نے ایک دوسرے سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ہم کہنا نہیں چاہتے تھے۔

احمد نے چائلڈ اسپیشلسٹ سے وقت لیا۔ مِنال کو لے کر ہم اس کے پاس گئے۔ اس نے مِنال کا معائنہ کیا، دوسرے ماہر ڈاکٹروں سے بھی رجوع کیا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم نے اس کا معائنہ کیا، کئی ٹیسٹ کیے۔ پھر ایک دن ڈاکٹری فیصلہ ہم پر بجلی گرا گیا کہ مِنال تمام زندگی سن نہیں سکے گی۔ یہ سُننے کے بعد مجھ پر اور احمد پر کیا گزری بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دونوں بالکل گُم سے ہو گئے تھے۔ لب مرتعش تھے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ سوال کیا۔

''کیا مِنال بول سکے گی؟'' ان پانچ ڈاکٹرز کی ٹیم میں سے ایک ڈاکٹر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مِنال آواز کو سن نہیں سکے گی تو اس کے دماغ کے نظام کو اس کا علم نہیں ہوگا کہ آواز کیا Phenamenon ہے اور اس کا کوئی فنکشن ہے؟ اس طرح جب کوئی آواز، کوئی آہٹ سن نہیں سکے گی تو اس کو اس کا علم نہیں ہوسکے گا کہ الفاظ، زبان، موسیقی کیا چیز ہوتی ہے۔ نتیجتاً گویائی سے بھی محروم رہے گی۔''

میں اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ جب کوئی سن نہیں سکتا تو وہ بول بھی نہیں سکتا۔ پھر بھی نجانے کیوں یہ سوال کیا تھا۔ شاید میری یہ خواہش تھی کہ میں غلط ثابت ہو جاؤں اور ڈاکٹرز یہ کہہ دیں کہ مِنال ''قوتِ گویائی'' سے محروم نہیں ہے۔

فی الحال ہم دونوں اپنے اس دکھ کو دبائے احمد کی والدہ ''ماں جی'' کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ وہ اپنی اکلوتی پوتی، جسے وہ بہت چاہتی تھیں اس کے متعلق یہ سب جان کر بہت دکھی ہوگئی تھیں۔ مِنال کی ددھیال بہت مختصر تھی۔ احمد اور ارشد بھائی یہ صرف دو بھائی تھے۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ ارشد بھائی MBA کرنے امریکہ گئے اور وہیں Settle ہوگئے۔ ایک پاکستانی فیملی میں شادی کر لی اور اب ان کے تین بیٹے تھے۔ ارشد بھائی بیوی بہت اچھی طبیعت کی تھیں بہت ملنسار اور محبت کرنے والی۔ یہ لوگ ماں جی کی وجہ سے پاکستان آتے رہتے تھے۔

پچھلے سال یہ لوگ پاکستان آئے تھے، جب مِنال چھ ماہ کی تھی ارشد بھائی اس سے بہت بہت پیار کرتے تھے۔ گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ اکثر کہتے ''میرے چار بچے ہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی۔'' ارشد بھائی کو جب مِنال کے متعلق پتہ چلا تو ان کو بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہم سے ایسی باتیں کیں جس سے ہمیں حوصلہ ملا۔

کچھ عرصہ میں ہم نے اس صدمے کو قسمت میں لکھا جان کر قبول کر لیا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ مِنال بھی بڑی ہو رہی تھی۔ وہ اب دو سال کی ہو چکی تھی، میں اور احمد کسی ایسے ادارے کی تلاش میں تھے جس میں ایسے بچوں کو تعلیم اور تربیت دی جاتی ہو۔ ہمیں جہاں بھی ایسے سکول کا پتہ چلتا ہم وہاں جاتے، پورا سروے کرتے لیکن ہم دونوں مطمئن نہیں ہو پا رہے تھے۔

کسی نے ہمیں کلفٹن میں ایک ایسے پرائیویٹ سکول کا بتایا۔ میں اور

احمد دونوں وہاں گئے۔سکول نرسری سے لے کر میٹرک تک تھا۔ یہ صرف سکول ہی نہیں تھا اس میں ''اشاروں کی زبان'' سکھائی جاتی تھی۔ بچوں کو تربیت بھی دی جاتی تھی اشاروں کی زبان میں اخلاق و آداب کے رموز، ان کی ادائیگی سکھائی جاتی تھی۔اس کے علاوہ والدین چاہیں تو ان کو بھی اشاروں اور حرکتوں سے اظہارِ خیال کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بچوں کے رجحان کو دیکھ کر مختلف کام (Skills) بھی سکھائے جاتے تھے جیسے بیکنگ (Baking) کٹنگ (Cutting) سلائی (Sewing) فائن آرٹس (Fine Arts) ایمبرائیڈری (Embridery) وغیرہ۔ ہمیں یہ پسند آیا اور ہم نے مِنال کو اس سکول میں داخل کر دیا۔

میں نے اور احمد نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی ''اشاروں کی زبان'' سیکھیں گے تا کہ اپنی بیٹی سے بات چیت کر سکیں۔

میں صبح مِنال کو سکول لے کر جاتی اور پھر خود بھی دو گھنٹے کی کلاس لیتی۔ اس کے بعد میں گھر آ جاتی۔ احمد آفس کے بعد جاتے وہ بھی کلاس لیتے اور مِنال کو ساتھ لے کر آ جاتے۔ ہم تینوں کی ایک چھوٹی سی دنیا علیحدہ بن گئی تھی۔ ماں جی کو اگر چہ یہ ''اشاروں کی زبان'' نہیں آتی تھی زیادہ تر میں اور کبھی کبھی احمد مترجم بن جاتے اسی طرح دادی، پوتی ایک دوسرے سے بات کر سکتی تھیں۔

ارشد بھائی کا فون آتا رہتا تھا ایک دن فون پر انہوں نے بتایا کہ وہ ہم سب کو Sponser کر رہے ہیں۔ بہت دیر بات کی کہنے لگے ''تم لوگ یہاں آ جاؤ گے تو ہم لوگ امریکہ میں بھی اور امریکہ سے باہر بھی مِنال کو ماہرین سماعت بچوں کے ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں گے ضرور کچھ نہ کچھ بہتری کی صورت نکل آئے گی۔ ارشد بھائی نے بتایا کہ ان ملکوں میں معذور افراد کے لیے بہت سہولتیں ہیں۔ یہاں پر جہاں فلک بوس عمارتیں ہیں وہاں وہیل چیئر کے ذریعے معذور افراد کو اندر داخل ہونے کے لیے ایک ڈھلان کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ بسوں میں بھی وہیل چیئر کے ذریعے داخل ہونے اور بیٹھنے کی سہولت دستیاب ہوتی ہے۔ معذور افراد کے لیے یہاں پر گاڑیاں مختص ہوتی ہیں، فون کرنے پر وہ گاڑیاں آتی ہیں، شاپنگ وغیرہ کے لیے جانا چاہیں لے کر جاتی ہیں پھر ایک مقررہ وقت پر گھر چھوڑ دیتی ہیں۔ اور یہ کہ مغرب کی دنیا میں معذور افراد بے کار تصور نہیں کیے جاتے ہیں۔ یہاں پر معذور افراد دفتروں میں کام کرتے نظر آتے ہیں یہاں انسان کی معذوری کو نااہلی تصور نہیں کیا جاتا، ایسے افراد اپنی ذہنی صلاحیتوں اور اپنے ہنر (Skills) کے لحاظ سے معاشرے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہاں پر معذور افراد کو بہت عزت دی جاتی ہے اور ہر شخص ان کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔''

راشد بھائی کی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی اور اطمینان بھی۔ کاش! ہمارے معاشرے میں بھی لوگ اس طرح سوچنے لگیں۔ یہاں پر تو معذور افراد کو دیکھ کر لوگوں کا رویہ یا تو تمسخرانہ ہوتا ہے یا پھر ترس کھانے والا۔ مِنال کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ابتدا میں جب لوگوں کو معلوم ہوا تو با قاعدہ طور پر لوگ ہمدردی جتانے آئے اور بہت افسوس کا اظہار کیا۔ اب بھی کچھ لوگ جب بھی ان سے ملاقات ہو گی مِنال کا پوچھتے ہوئے اس پر ترس ضرور کھاتے ہیں۔ بلکہ اس پر ہی کیا مجھ پر بھی ترس کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''پتہ نہیں اللہ کی اس میں کیا مصلحت ہے، ایک ہی اولاد دی اور وہ بھی ایسی؟''

پہلے مِنال ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی، سکول میں پڑھ رہی تھی، گفتگو کے اشارے سمجھنے لگی تھی۔ مِنال بے حد ذہین اور حساس تھی۔ وہ لوگوں کے چہروں کے تاثرات کو بھی پڑھ لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی لوگوں کے سامنے جانے سے کتراتی تھی۔ کوئی آتا تو وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

وقت گزر رہا تھا۔ مِنال نے پانچویں کلاس پاس کر لی تھی۔ اسی دوران ہمارے امریکہ جانے کی کارروائی مکمل ہو گئی اور ہم سب امریکہ چلے گئے۔

پہلے ارشد بھائی نے مِنال کو شکاگو کے ماہر سماعت ڈاکٹروں کو دکھایا۔ جب کوئی اُمید نظر نہ آئی تو پھر مِنال کو کینیڈا، جرمنی اور فرانس کے ماہر سماعت ڈاکٹروں کو دکھایا کسی نے بھی کوئی طمانیت بخش جواب نہیں دیا۔

ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں تھے۔ ارشد بھائی نے سارے اخراجات ادا کیے۔ احمد نے اور میں نے بہت منع کیا کہ ہم نے شکاگو میں دکھا دیا ہے جب یہ ڈاکٹر کسی قسم کی کوئی امید نہیں دلا رہے ہیں تو پھر مزید کیا امید وابستہ کی جاتی ہے۔ مگر ارشد بھائی نہیں مانے کہے لگے: ''کسی قسم کی کوئی تشنگی باقی نہیں رہنا چاہیے''

شکاگو میں ہم نے مِنال کو ISD (Illionois School of Deaf) میں داخل کر دیا۔ پرنسپل نے بتایا کہ ہم اپنے سکول کے بچوں کو ایک پُر اعتماد اور اپنی کفالت کرنے والا شہری بناتے ہیں۔ ہمارے پاس بچوں کو لکھنا، پڑھنا اور Mathematics سکھائی جاتی ہے اس کے علاوہ مختلف کام (Technologies) جس میں بچے کا رجحان ہو سکھائی جاتی ہیں تا کہ وہ ملازمت کر کے ایک عام شہری کی طرح زندگی گزار سکیں۔

اس سکول میں بچے وہیں رہتے، صرف ہفتے میں دو دن سنیچر اور اتوار کو گھر جاتے۔ مِنال یہاں بہت خوش تھی ایک ہفتہ کے بعد آتی اپنے سکول کی ساری باتیں بتاتی، خوب ساری باتیں کرتی۔ اس کو خوش اور زندگی میں آگے بڑھتے دیکھ کر ہم سب بھی بہت خوش تھے۔

مِنال نے ہائی سکول مکمل کر لیا۔ وہ اب ایک خوبصورت اور با اعتماد لڑکی بن چکی تھی۔ ہم سب بھی اس کی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ چند دن اسی خوشی میں گزر گئے۔ پھر ایک دن مِنال نے خواہش ظاہر کی وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے اور Gallavdet University میں پڑھنا چاہتی ہے۔

اس یونیورسٹی کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا یہ یونیورسٹی واشنگٹن میں ہے۔ سماعت اور گویائی سے محروم طلبہ کے لیے دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ ہے۔ اس جامعہ میں ساری دنیا کے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے

آتے ہیں۔ یہاں کالج سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی ڈگری کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پوری دنیا میں اس یونیورسٹی کا جواب نہیں ہے۔ البتہ یونیورسٹی کی فیس بہت زیادہ تھی۔ سالانہ اخراجات تقریباً US $ 37188/- تھے۔ ان پیسوں کو ایک ساتھ دینے کے بجائے ماہانہ فیس کے طور پر بھی ادائیگی کی جاسکتی تھی۔ یہ تقریباً تین ہزار یو ایس ڈالر بنتے تھے۔

اگر چہ یہ رقم بہت زیادہ تھی لیکن ہماری مِنال کے علاوہ کوئی اور اولاد تو تھی نہیں۔۔۔ احمد کی بھی بہت اچھی جاب تھی اور میرا ''بوتیک'' بھی بہت کامیاب جارہا تھا۔ البتہ سفر لمبا تھا ماسٹرز کرنے کے لیے چار سال درکار تھے۔ ارشد بھائی نے بھی ہمت بڑھائی۔ انہوں نے فیس کے معاملے میں ہم سے Share کرنے کے لیے کہا۔ لیکن ہم نے ان سے یہی کہا ''اگر ضرورت ہوگی تو پھر آپ سے ہی لیں گے۔ فی الحال ہمیں کرنے دیں۔'' مِنال نے کہا طلبہ کے لیے قرض (Loan) کی بھی سہولت ہے۔ میں لون (Loan) لے لوں گی۔ احمد نے مِنال سے کہا ''تم پیسوں کی فکر نہ کرو، جس مقصد کے لیے تم یونیورسٹی میں داخلہ لے رہی ہو اس مقصد کو سامنے رکھو اور دل لگا کر پڑھو۔ ہم لوگ ہیں نا۔۔۔''

مِنال کے ساتھ ہم لوگ بھی گلاڈیٹ یونیورسٹی گئے۔ ہم دیکھ کر حیران رہ گئے، درسگاہ کیا یہ تو ایک شہر ہے۔ یہاں درسگاہ کے ساتھ رہائش گاہیں، دکانیں، سپر مارکیٹس، ریستوران سب کچھ موجود ہے۔ یہاں زندگی ہے، محبت ہے، ہم رشتگی ہے، رونقیں ہیں، گہما گہمی ہے۔ ان تمام لوگوں کے رابطے کا ذریعہ اشاروں کی زبان ہے۔ میں ان لوگوں کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ یہ لوگ آپس میں زندگی کے معاملات میں کتنے آرام سے ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہیں، خواہ وہ اشاروں کی زبان ہی کیوں نہ ہو۔ یونیورسٹی میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو سن بھی سکتے تھے اور بول بھی سکتے تھے، وہ اپنی خوشی سے یہاں جاب (Job) کر رہے تھے لیکن ان سب کے رابطے کا ذریعہ بھی اشاروں کی زبان تھی۔

مِنال کا ایڈمیشن ہو گیا، اس کی رہائش بھی وہیں کیمپس میں تھی۔ ہم لوگ واپس آ گئے۔ مِنال سے ویکنڈ پر فون کے ذریعے بات ہوتی رہتی۔ مِنال کے فون کے ساتھ ایک ٹائپ رائٹر منسلک تھا، مِنال اپنی بات ٹائپ کرتی۔ ایسے افراد کے لیے ایک آپریٹر چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ وہ یہ ٹائپ کیا ہوا پیغام پڑھ کر متعلقہ فرد کو فون کرتی اور پھر اس فرد کا جواب آپریٹر خود ٹائپ کر کے مِنال کو دیتی۔ اسی طرح فون پر گفتگو ہوتی رہتی۔ چھٹیوں میں وہ ہم سے ملنے آ جاتی۔

مِنال ہمیں ای میل بھی کرتی۔ اس کی ای میل سے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ کتنے متحرک، کتنے ہوشیار اور باخبر رہتے ہیں۔ انہیں معلوم رہتا ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے؟ یہ سارے دوست مل کر ایک ساتھ شاپنگ کرتے، بیڈمنٹن کھیلتے، فلمیں دیکھتے، اسٹڈی کرتے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ''یہ جگہ مِنال کے لیے ہی وجود میں آئی ہے اور مِنال اس جگہ کے لیے وجود میں آئی ہے۔''

مِنال کے بہت زیادہ دوست نہیں تھے۔ جو قریبی دوست تھے وہ سب طبقۂ نسواں سے تعلق رکھتے تھے۔ لڑکوں سے دوستی ''ہائے۔۔۔ ہیلو'' تک تھی۔

مِنال کا آخری سمسٹر تھا۔ اس نے آنے کے لیے منع کیا تھا اس نے ای میل کیا تھا کہ ''پڑھائی بہت ہے ان چھٹیوں میں نہیں آسکوں گی۔''

ہم نے سوچا اسے سرپرائز دیا جائے اور میں، احمد اور ارشد بھائی اس سے ملنے پہنچ گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی اور حیران بھی۔۔۔

مِنال نے ہمیں ایک لڑکے سے ملوایا کہ یہ میرا دوست بھی ہے اور پڑھائی میں میری بہت مدد کرتا ہے۔ وہ دو سال سے اسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے۔ میں اسے ایک سال سے جانتی ہوں۔ بہت (Caring) کیرنگ اور مخلص ہے۔

ہمیں حیرانی ہوئی کیونکہ مِنال لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی تھی۔ زین بہت اچھا لڑکا لگا۔ شکل وصورت بھی بہت اچھی تھی۔ بات چیت اور رکھ رکھاؤ میں بھی بہت خوب۔ ارشد بھائی اور احمد کو بھی زین بہت پسند آیا۔ زین کے جانے کے بعد احمد نے پوچھا:

''کیا تم اسے پسند کرتی ہو، اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''مِنال شرما گئی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔''

''تو پھر تم ہمیں زین کے والدین سے ملواؤ'' ارشد بھائی نے کہا۔

''زین کے والدین نیویارک میں رہتے تھے دو سال پہلے ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد بھائی، بہن یا خاندان کے اور لوگ کوئی بھی زین سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔'' دوسرے دن احمد اور ارشد بھائی نے بلا کر زین سے بات کی۔ زیادہ بات احمد ہی کر رہے تھے کیونکہ ارشد بھائی اشاروں کی زبان تھوڑی بہت سمجھتے تھے۔ دو دن بعد زین اور مِنال کے کچھ دوستوں کو بلا ہم نے ان کی منگنی کر دی اور شادی کی تاریخ بھی سمسٹر کے بعد کی طے کر دی۔

شکاگو آنے کے بعد میں سوچ رہی تھی یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟ ڈر تھا ماں جی ناراض ہوں گی کہ ان کو بتایا بھی نہیں اور منگنی کر دی مگر ماں جی کو جب پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔

مِنال کے سمسٹر ختم ہونے کے بعد ہم نے شکاگو میں ان کی بہت دھوم دھام سے شادی کی۔ سب ہی دیکھ کر کہہ رہے تھے ''کتنی خوبصورت جوڑی ہے'' رخصت ہو کر مِنال واشنگٹن چلی گئی۔ زین نے یونیورسٹی کے نزدیک دو کمروں کا فلیٹ لے لیا تھا۔ دونوں اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ رزلٹ کے بعد مِنال نے بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ مِنال نے ہمیں خوشی خوشی E-mail کیا تھا کہ اسے اسی یونیورسٹی میں جوب مل گئی ہے۔ ہم سب بھی مِنال کے لیے بہت خوش تھے اور اس کے مستقبل سے مطمئن بھی۔ اب ہمیں یہ خدشہ اور فکر نہیں تھی کہ ''ہمارے بعد مِنال کا کیا ہوگا۔''

اس دن مِنال کا فون آیا ''ہم لوگ نانا، نانی بننے والے ہیں'' میں خوشی سے اچھل پڑی۔ دل چاہ رہا تھا مِنال کو لپٹاؤں، پیار کروں۔۔۔ سب لوگ

اس خبر سے بہت خوش تھے۔لیکن مجھے دل ہی دل میں یہ سوال بار بار ستا رہا تھا یہ بچہ بھی ان ہی کی طرح ہوا تو۔۔۔؟ یا پھر یہ بچہ نارمل ہوا تو۔۔۔؟

لیکن میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔شاید سب ہی یہ بات سوچ رہے ہوں گے مگر سہنے کی ہمت نہیں تھی۔

پھر وہ دن آیا جب ڈاکٹر نے بتایا ''بیٹا'' ہوا ہے۔ہم سب کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ یہاں پر چوبیس گھنٹے کے اندر بچے کا پورا ''چیک اُپ'' ہوتا ہے کہ آیا بچہ نارمل ہے یا کوئی نقص (Defect) ہے۔ایک طرف بے حد خوشی دوسری طرف فکر ''کیا یہ بچہ اپنے ماں باپ کی طرح ہوگا؟'' کافی حد تک یہی یقین تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی طرح ہی ہوگا۔

نرس بچے کو لے کر آئی ساتھ ہی ڈاکٹر بھی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ کا پوتا (Grand Son) بالکل نارمل ہے۔مبارک ہو (Congratulation) ڈاکٹر نے بچے کو نرس کی گود سے لے کر میری گود میں دیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر! کیا یہ سن سکے گا؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہ سن بھی سکے گا اور بول بھی سکے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ہم سب بہت خوش تھے اور مِنال اور زین بھی اس بات سے بے حد خوش تھے کہ ان کی اولاد میں وہ کمی نہیں ہے جو ان لوگوں میں ہے۔

دو ماہ بعد مِنال نے اپنے گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ زین اسے لینے آ رہا تھا۔

ہم سب دل ہی دل میں پریشان تھے کہ یہ اس بچے کو کیسے پالیں گے ''گونگے بہروں کی بستی'' میں تو یہ بچہ بھی ویسے ہی ہو جائے گا۔ہم نے آپس میں ایک دوسرے سے یہ بات کہی بھی تھی لیکن مِنال اور زین سے کسی نے کچھ نہیں کہا کیونکہ یہ ان کی اولاد تھی اور انہیں اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کیسے پالنا چاہتے ہیں۔ہمیں تو ایک اور غم بھی تھا کہ ''ان لوگوں کے جانے کے بعد کتنا سنّاٹا ہو جائے گا'' زریاب سے کتنی رونق تھی۔اس کی کلکاریاں پورے گھر میں گونجتی تھیں۔

مِنال کے جانے کا دن آ گیا۔سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔سب بے حد افسردہ تھے۔مِنال اور زریاب سے جدائی کے سبب۔ ''چلیں بھئی گاڑی میں بیٹھیں ورنہ لیٹ ہو جائیں گے'' احمد نے کہا۔

اتنے میں زین زریاب کو گود میں لے کر آیا اور میری گود میں ڈال کر بولا:

''آج سے یہ آپ کا بیٹا ہے۔آپ نے جیسے مِنال کو پالا ہے اب آپ اسے پالیں گی۔''

''میں نے اسے لپٹا لیا۔میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاید تشکر کے آنسو، اللہ تعالیٰ نے مجھے 25 برس بعد ایک بیٹا عطا فرمایا تھا۔''

ماں جی اپنے پڑپوتے سے کھیلنے کے ساتھ خود بھی بچی بن گئی تھیں۔

ارشد بھائی نے ''زریاب'' کو تحفۂ خداوندی قرار دیا تھا۔

''دوسرا وکرم پیدا نہیں ہوگا''

چتا سے شعلے اٹھ رہے تھے۔آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی. میں گھر چلا آیا مورخہ ۲۷۔اگست نند کشور وکرم نے اس دنیا کو الوداع کہ دیا جس دنیا کے بارے میں اب انکا خیال تھا کہ یہ دنیا جینے کے لائق نہیں رہ گئی ہے۔ ۲۶۔ اگست دوپہر تین بجے انکا فون آیا، ذوقی مجھ سے ملو۔میں نے ۲۷ تاریخ تین بجے ملنے کا وعدہ کیا12:30 بجے وکرم صاحب کے بیٹے وکاس دت کا فون آیا، وکرم صاحب نہیں رہے۔میں نے جلدی جلدی کچھ دوستوں کو اطلاع دی۔جب وکرم صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں فاروق ارگلی موجود تھے۔ہم نے آخری دیدار کیا۔4:30 بجے گیتا کالونی شمشان گھاٹ آ گئے۔ یہاں زمرد مغل، ایم رحمٰن ایڈووکیٹ، ضیا حسن مدیر آجکل پہلے سے موجود تھے۔آخری رسم انکے بیٹے نے ادا کی۔ میں نے ایک فرشتے کا دیدار کیا جس کا چہرہ نورانی تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے یہ چہرہ اب آواز دینے والا ہو، مرنے کے بعد ایسا شفاف نورانی چہرہ میں نے اپنی زندگی میں کم دیکھا ہے۔میں تین بجے ملاقات کرنے والا تھا اور اب میں سلگتی چتا کے کنارے کھڑا تھا۔ مجھے ان کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔میں اپنا شرادھ اپنی زندگی میں کرنا چاہتا ہوں۔فن اور شخصیت پر آخری کتاب میں نے ترتیب دی تھی۔شرادھ کے دن وہ اس کتاب کا اجرا کرنے والے تھے۔اردو کو لے کر بہت سے منصوبے تھے، جنکا ذکر وہ برابر کرتے تھے۔آخری سانس تک اردو کا یہ عاشق اردو کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔موت سے چار دن قبل ایک کتاب کے اجرا میں بھی ہم دونوں شریک تھے۔اس وقت کون کہ سکتا تھا کہ چار دن بعد ہم اردو کے مجاہد، سفیر، عاشق اور محبوب کو الوداع کہ رہے ہوں گے۔میں ابھی بھی ان شعلوں کی زد میں ہوں۔میں نے اپنی زندگی میں وکرم صاحب جیسا عظیم انسان نہیں دیکھا۔کوئی دوسرا نند کشور وکرم نہیں آئے گا۔ایک ایسا شخص جو کسی کونسل، کسی اکادمی کے بھروسے نہیں رہا۔جس کے ادبی کارنامے کسی کونسل اور اکادمی کے کارناموں سے کہیں بڑے ہیں۔آج اردو زبان و ادب کی کتاب کا ایک روشن باب بند ہوتا ہے۔دنیا سے رخصت ہوتے ہی خزاں اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیتی ہے۔

وکرم صاحب۔۔۔ہم آپ کو نہیں بھولینگے 34 برس پرانا یارانہ تھا، کیسے بھول سکتا ہوں۔آپ بار بار یاد آئیں گے۔جب جب اردو کا تذکرہ ہوگا، آپ کا نام ہونٹوں پر آئے گا۔آپ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

مشرّف عالم ذوقی

رشتوں کی کربلا

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔معمول کی طرح راہداری سے کبھی کبھی کسی کے قدموں کی آہٹ رات کی خاموشی میں خلل ڈال دیتی۔سسکیوں کی آواز سن کر کانتی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔زیرو بلب کی روشنی میں اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو زور دے کر کھولا تو اس کی نظر آخری بستر پر اوندھے منہ لیٹی چمپا کلی پر جا ٹکی۔ایک نظر اس نے درمیان والے بستر پر ڈالی۔پھول متی گہری نیند سو رہی تھی۔اپنے پھیلے جسم کو سمیٹ کر احتیاط سے اٹھی اور ننگے پاؤں ہی چمپا کلی کے بستر کے پاس پہنچ گئی۔

''چمپا اب بس بھی کر کتنا جی کو جلائے گی۔صبح سے تیرا یہی حال ہے کیوں اپنی طبیعت خراب کر رہی ہے؟'' شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چمپا کو چپ کرانا چاہا۔

چمپا کلی ٹس سے مس نہ ہوئی۔اسی طرح روتی رہی۔''خود کو سنبھال چمپا۔اب تو تھوڑے دنوں کی بات رہ گئی ہے۔یہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائیں گے۔'' کانتی نے چمپا کا بازو اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنی انگلیوں سے اس کے بھیگے رخسار خشک کیے۔

''دیکھ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا ہے۔یہ تینوں بھی پریشان ہو رہے ہیں۔تو اس طرح روتی رہے گی تو میں سو نہیں پاؤں گی۔'' کانتی نے اپنے پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔آپ سو جایئے اب نہیں روؤں گی۔'' اس نے پیار سے کانتی کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے تسلی دی۔

کانتی کمر پر ہاتھ رکھے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

پھول متی گہری نیند سوئی رہی۔

پچھلے پانچ مہینے سے تینوں ایک ہی کمرے میں رہ رہی تھیں۔نہ تو رشتہ دار تھیں نہ سہیلیاں۔تینوں کی زندگیوں کے حالات الگ الگ،تینوں عمر کے الگ الگ پڑاؤ پر اور تینوں الگ الگ جگہ کی مکین۔مگر تین باتیں مشترک ہیں۔تینوں غربت کی ماری حالات سے مجبور۔تینوں نے اپنے پریوار کے لیے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھے ہیں اور تینوں نے اپنی کوکھ کرایہ پر دے رکھی ہے۔لہٰذا تینوں ایک ہی کشتی کی مسافر ہیں۔

ملک میں جب سے طبی سیاحت کی صنعت کو فروغ دینے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں تب سے نہ صرف اندرون بلکہ بیرون ملک کے باشندے بھی اس سے فیضیاب ہوئے ہیں اور جب سے سیروگیشن کو قانونی طور پر جائز قرار دیا گیا ہے اس تجارت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

کانتی کی عمر چالیس کو چھو رہی ہے۔اس کے لیے یہ جگہ نئی نہیں۔وہ دوسری بار یہاں آئی ہے۔تین سال پہلے جب اس کے شوہر دیا نند نے اس سے اس بارے میں بات کی تھی تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی پھر بپھر اٹھی تھی:

''کیسے مرد ہو پیسوں کے لیے مجھے کسی اور کے بچے کی ماں بننے کو کہہ رہے ہو؟ تمہارا ضمیر مر گیا ہے کیا؟''

''تجھے کون سا کسی کے ساتھ سونے کو کہہ رہا ہوں صرف کرایہ پر ہی تو دینی ہے۔''

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب تمہیں ڈاکٹر سمجھا دیں گے تو بس میرے ساتھ چلنا۔مجھ پر بھروسہ ہے نا؟ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا تیرے ساتھ۔''

بھروسہ تو اسے خود سے زیادہ تھا اس پر یہ وہ جانتی تھی وہ جو کرے گا سب کے بھلے کے لیے ہی کرے گا۔

اسپتال پہنچ کر پتا چلا تھا کہ کوکھ کرایہ پر دینے کے لیے بہت سے امیدوار ہیں۔اسپتال کیا تھا پانچ ستارہ ہوٹل لگ رہا تھا۔ایک الگ ہال کمرے میں ان جیسے ہی بیس پچیس لوگ جمع تھے۔پھر کمرے کی روشنی مدھم کر دی گئی اور ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسکرین پر تصویریں دکھا کر سمجھانا شروع کیا۔

''آپ سب یہاں جس مقصد کے لیے آئے ہیں اس کے بارے میں بات کر لیں۔ہم اپنی کوششوں سے لوگوں کی زندگیوں کی محرومیوں کو دور کرنے کا جتن کرتے ہیں۔جن کے یہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ بچہ گود بھی نہیں لینا چاہتے ہم ان کے خواب پورے کرتے ہیں انہیں ان کی اولاد دے کر اور ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں جو اولاد کی دولت سے مالا مال ہیں مگر انہیں زندگی کی ضروریات مہیا نہیں کرا سکتے۔

اب میں آپ کو بتا دوں کہ یہ ہم کیسے کرتے ہیں۔سب سے پہلے ہم اس عورت کی بیضہ دانی کو ہارمون کے انجکشن دے کر ترغیب دے کر انڈے تیار کرتے ہیں جو اولاد کی خواہش میں ہمارے پاس آتی ہیں۔جب انڈے تیار ہو جاتے ہیں تو اس کے شوہر کے نطفہ سے زرخیز بنایا جاتا ہے اور اگر ٹیسٹ کی رپورٹ ٹھیک آ جائے تو کرایہ کی کوکھ میں اسے نصب کر دیتے ہیں۔حاملہ عورت کی صحت کی پوری ذمہ داری ہماری رہتی ہے۔وقت بہ وقت پر ٹیسٹ ہوتے ہیں۔جانچ ہوتی ہے اور بچہ پیدا ہوتے ہی اسے اس کے اصل والدین کو سونپ دیتے ہیں۔

اس کے لیے کچھ باتیں بہت ضروری ہیں۔کرایہ پر کوکھ لینے سے پہلے عورت کے مختلف ٹیسٹ ہوتے ہیں۔اگر سب ہمارے معیار پر پورے اُتریں تو ہی کرایہ پر کوکھ لی جاتی ہے۔

کرایہ پر کوکھ لیتے ہی کچھ ضروری کاغذات دستخط کروائے جاتے ہیں

تاکہ کل کو کوئی دقت نہ ہو۔کرایہ کی پہلی قسط اسی وقت دی جاتی ہے اور زچگی کے بعد پوری رقم ادا کر دی جاتی ہے۔جو حاملہ عورتیں نزدیک رہتی ہیں وہ اپنے گھر رہ سکتی ہیں بشرطیکہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور مقررہ وقت پر چیک اَپ کے لیے آتی رہیں اور جو دور دراز سے آتی ہیں انہیں ہم اپنے اسپتال میں رکھتے ہیں۔ان سے ملنے ان کے گھر کے لوگ اتوار کے اتوار آ سکتے ہیں۔صبح دس سے شام پانچ بجے تک۔

اور اب آپ کو بتادوں کہ کرایہ کتنا ہوگا۔تو سن لیجیے کہ ''اتنا مل جائے گا جتنا یہ عورتیں ساری عمر نہیں کماسکتیں''۔ہال میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔

دو منٹ خاموش رہ کر ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔''پانچ لاکھ ایک بچے اور اگر جڑواں ہوئے تو سات لاکھ۔میرا خیال ہے میں نے سب واضح کر دیا۔اب آپ سوچ سمجھ کر اپنی رضا مندی دے سکتے ہیں۔ہمارے پاس جیسے ہی کوئی ضرورت مند آئے گا ہم آپ سے رابطہ کرلیں گے۔''

ہال کی روشنی جل اٹھی اور ڈاکٹر اپنا سامان اٹھا کر باہر نکل گئی۔وہاں موجود لوگوں نے اس کے اسسٹنٹ کو گھیر لیا۔

واپسی کے راستے پر دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔اس رات دیر تک وہ سو نہ سکی۔دیانند نے ایک دو بار بات کرنی چاہی مگر وہ دوسری کروٹ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔اس کے دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔کبھی ضرورتیں اسے اکساتیں تو کبھی اخلاقی اقدار کا پلہ بھاری ہو جاتا۔نو مہینے بچے کوکھ میں رکھ کر کسی اور کو دے دینا اور اس پر اپنا حق بھی نہ جتانا، کیا آسان ہوگا اس کے لیے؟ پھر دوسرے ہی پل ضرورتیں چلاّ چلاّ کر کہنے لگتیں۔

''اتنا پیسہ کبھی زندگی بھر نہیں کما سکتے جتنا نو مہینے میں کمایا جائے گا۔ بچوں کی پڑھائی دیانند کی بیماری، پکی چھت، سب کام آسانی سے ہو جائیں گے۔ صرف کوکھ ہی تو کرایہ پر دینی ہے لوگ تو زندہ رہنے کے لیے خود کو بھی بیچ دیتے ہیں۔''

اس کشمکش میں ضرورتیں جیت گئیں۔اخلاقی قدریں بھی تبھی اچھی لگتی ہیں اگر پیٹ بھرا ہو۔بھوکے پیٹ تو بھجن بھی نہیں ہوتا۔

دیانند کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

دو دن بعد ہی اس کے ٹیسٹ شروع ہو گئے تھے۔کئی روز اسے لگا تار اسپتال جانا پڑا تھا۔ہری جھنڈی ملتے ہی کوکھ کرایہ پر دینے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ آسٹریلیا کے ایک جوڑے نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ہندوستانی عورتوں کو یہ اس لیے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ وہ سگریٹ اور شراب نہیں پیتیں اسی طرح بچے کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔پانچ مہینے وہ گھر پر ہی بچوں کے پاس رہی تھی پھر باقی کے تین مہینے اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں گزارے تھے۔نواں مہینہ شروع ہوتے ہی زچگی ہوگئی۔اس نے بچے کی صرف ایک جھلک دیکھی۔پھر اسے اس کے حیاتیاتی والدین کی گود میں ڈال دیا گیا۔خوشی سے ان کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔انہوں نے پرجوش انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور کرایہ کے علاوہ اچھی خاصی Tip بھی دی۔کوکھ خالی اور گود سونی ہوتے ہی ہلکی سی چبھن کانتی نے ضرور محسوس کی مگر بچوں کے خوش حال مستقبل کے آگے یہ چبھن پھیکی تھی۔توقع سے زیادہ رقم ملنے کی خوشی سے اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

چمپا کلی کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے کانتی کی نیند خراب ہو۔ماں کی طرح وہ اس کا خیال رکھتی تھی۔باپ کے اچانک گزر جانے کے بعد ماں نے اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔جب تک اس کے گھر میں رہی ماں کی سوچ اور نگاہوں کے دائرے میں رہی۔دو چھوٹے بھائی سرکاری اسکول جاتے تو وہ ماں کے ساتھ لوگوں کے گھروں میں برتن اور صفائی کا کام کرتی۔مردوں کی آنکھوں میں مچلتی ہوس نے ماں کو اس کے جوان ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔جوانی بھی اس پر ٹوٹ کر برسی تھی۔بیوہ ماں سے بیٹی کی الہڑ جوانی سنبھالے سے نہیں سنبھل رہی تھی۔جنگلی بوٹی کی طرح اس کی خوبصورتی اور اس کے بدن کی لپٹیں دعوت دیتی محسوس ہوتیں۔ماں کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔بیٹی کی آنکھوں میں بڑھتی چمک اور لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ سے وہ لرز گئی۔سیلاب آنے سے پہلے ہی ماں نے باندھ لگا دیا۔اڑنے سے پہلے ہی اس کے پنکھ کاٹ دیے۔شہر کی بستی سے اٹھ کر گاؤں کی کچی چھت والے مکان میں چلی آئی۔سولہ سال کی عمر میں ماں نے گھر گرہستی کے جنجال میں پھنسا دیا۔ساس سسر کے علاوہ تین دیور دو جوان ہوتی نندا یک ہی چھت کے نیچے رہ رہے تھے۔دو وقت کی روٹی کا مسئلہ ادھر بھی تھا اور پیٹ کی آگ بجھانے کی جدوجہد بھی۔ آسمان سے گری کھجور میں اٹکی۔

شادی کے سال بعد ہی چنٹو اس کی گود میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر آیا۔اس کی زندگی کو معنی مل گئے۔سارا دن کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کاموں میں جٹی رہتی۔چنٹو کی مسکراہٹ اس کے دن بھر کی تھکن پل بھر میں اتار دیتی۔ زندگی سے سب شکایتیں ختم ہو گئی تھیں۔

چنٹو نے ماں بولنا ہی شروع کیا تھا کہ اس کا شوہر پورن اسے سُسر کے بتائے پتے پر لے گیا۔اس سے نہ کچھ پوچھا نہ کچھ بتایا بس اتنا ہی کہا کہ کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں۔کچھ پوچھنے کے لیے زبان کھولی تو بس اتنا ہی کہا:

''صبر سے کام لو گھر جا کر سب بتا دوں گا۔''

رپورٹ آنے تک سب نے چپی سادھ رکھی اور جب رپورٹ آئی تو بم کی طرح اس پر پھٹی۔اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بہو کے فرائض میں یہ سب بھی شامل ہوگا۔اس نے احتجاج کیا، چیخی، چلائی مگر بے بس بے سود۔انہیں اپنی جوان ہوتی بیٹیوں کے لیے رقم درکار تھی اور اتنے کم وقت میں اتنی بڑی رقم صرف انہیں کوکھ کرایہ پر دے کر ہی مل سکتی تھی۔

سسر نے یہ کہہ کر منہ بند کرا دیا:

''ہم نے تمہاری ماں سے کون سا جہیز لیا ہے۔ہمیں تو بہت رشتے آتے تھے وہ تو تمہاری ماں کی بیوگی اور شرافت پر ترس آ گیا۔''

ساس نے دوٹوک بات کہہ دی:

''اگر ہمارے وقت میں یہ ہوتا تو ہم بھی کر لیتے۔ ویسے بھی ہر سال ایک بچہ جنا ہے تم نے تو ابھی ایک ہی پیدا کیا ہے تمہیں کیا دقت ہے؟''

پورن میں اپنی بات کہنے کی ہمت نہ تھی وہ بھلا اس کی ڈھال کیسے بنتا۔ جن عورتوں کے شوہر والدین سے دب کر رہتے ہیں ان عورتوں کی حق تلفی ہو ہی جاتی ہے۔

چنٹو کو چھوڑ کر گھر سے جاتے ہوئے اس کے دل پر منوں بوجھ پڑ گیا تھا۔ کرایہ کی پیشگی رقم لے کر اور اسے اسپتال میں چھوڑ کر پورن واپس لوٹ گیا تھا۔ ممبئی کے تجارتی دکشت جوڑے نے اس کی کوکھ پانچ لاکھ میں خرید لی تھی۔

ہر اتوار پورن چنٹو کو ساتھ لے کر اسے ملنے آتا۔ اور ہر ملاقات کے بعد وہ اور زیادہ رنجیدہ ہو جاتی۔ وہ رات رو رو کر کاٹتی۔ اگلی صبح پھر اسے اتوار کا انتظار شروع ہو جاتا۔

دو مہینے میں ایک بار ممبئی سے دِکشت جوڑا اس سے ملنے ضرور آتا۔ اس کی کوکھ میں پلنے والے اپنے بچے کی صحت دریافت کر کے مسز دکشت تو بچے سے باتیں کرنے لگتی یا پھر چمپا کلی کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کی ہلچل محسوس کر کے خوش ہوتی۔ چنٹو اور اس کے لیے ڈھیر سارے تحفے لانا کبھی نہ بھولتے۔ شروع شروع میں وہ ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی گویا وہ اس کی مجرم ہو۔ پھر دھیرے دھیرے کچھ ملاقاتوں کے بعد مسز دکشت پر اسے رحم آنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ تو اُس سے بھی زیادہ غریب زیادہ مجبور ہے۔ احساس کمتری کا جذبہ دھیرے دھیرے غائب ہو گیا تھا۔ وہ پیسے کے دم سے اپنی محرومیاں پُر کر رہے تھے، خوشیاں خرید رہے تھے اور وہ انہی پیسوں سے اپنی محرمیاں پُر کر رہی تھی، خوشیوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

معمول کی طرح صبح آٹھ بجے نرس ان کے کمرے میں بی پی چیک کرنے آئی تو چمپا کلی کا بی پی زیادہ تھا۔

''لگتا ہے تمہارا گھر والوں سے ملنا بند کرنا پڑے گا'' بزرگ نرس نے ڈانٹ کر کہا۔

''کیوں: یہ رات بھر روتی رہی ہے کیا؟'' پھول متی نے حیرت سے پوچھا۔

''تم گھر میں بھی اسی طرح بے سدھ ہوتی ہو؟'' کانتی نے پوچھا۔

''بھائی گھر میں وہ آرام کہاں جو ادھر ہے'' دوبارہ بستر پر لیٹ کر اس نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

کانتی اور پھول متی کا بی پی بالکل درست تھا۔

''اس طرح کی سوچ ہونی چاہیے۔ سیکھ کچھ اس سے'' نرس چمپا کو سمجھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

پھول متی اٹھ کر چمپا کلی کے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

''تجھے کتنی بار سمجھایا اپنا خیال رکھا کر کوئی کسی کے لیے نہیں جیتا۔ مجھے دیکھ میں بھی تو دو بچے چھوڑ کر آئی ہوں۔ روتی ہوں کیا تیری طرح؟ میرے بچوں کے پاس تو عیاش، لاپرواہ باپ ہے دیکھ بھال کرنے کو۔ مگر تیرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تو پورا پریوار ہے نا؟''

''میرا دل نہیں لگتا اسے دیکھے بنا کیا کروں؟''

''یہ جو کر رہی ہے اس کے لیے ہی تو کر رہی ہے؟''

''میرے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ کشٹ میں سہوں گی اور مزے وہ لوگ لیں گے۔'' اس نے کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''تجھے تھوڑی ہوشیاری کرنی ہوگی۔ مجھے دیکھ یہ سارا پیسہ میرے بینک کھاتے میں جائے گا۔ پھر دیکھنا کیسے دم ہلاتا آگے پیچھے گھومے گا۔ سمجھتا ہے میں کچھ جانتی نہیں گھر سے باہر کدھر منہ مارتا پھرتا ہے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے یہ قدم اٹھایا۔ اب کوئی پرواہ نہیں جس کے ساتھ مرضی چلا جائے۔ اس پیسے سے اپنی چھت کا انتظام کروں گی۔ بچوں کو تعلیم دلواؤں گی۔ اگر کانتی کی طرح ایک ہی بار میں میرے بھی تین بچے نہ سہی دو ہی کوکھ میں آ جاتے تو کام کتنا آسان ہو جاتا۔ اگلی بار کے بارے میں نہ سوچنا پڑتا۔''

''تین بچے لے کر پھرنا آسان نہیں۔ یہ تو میں ہی جانتی ہوں'' کانتی جھٹ سے بولی۔

''جب قیمت دگنی مل رہی ہو تو تکلیف بھی برداشت ہو جاتی ہے۔'' پھول متی نے طنز کیا۔

''پیسہ بہت بڑا سہارا ہے۔'' کانتی نے مانا۔

''مرد سے زیادہ مضبوط۔'' پھول متی نے تصدیق کی۔ پھر وہ پلٹ کر چمپا کلی سے مخاطب ہوئی۔

''ایک بات بتا۔ گاؤں میں سارا دن کام کرتی تھی یا آرام؟''

''ہم جیسی عورتوں کے نصیب میں آرام کہاں؟''

''پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ سارا دن بتا تجھے کوئی کام ہے یہاں؟ کھالیا، پی لیا، سولیا، باتیں کر لیں، ٹی وی دیکھ لیا، ٹہل لیا۔ اوہ ہاں! تجھے تو رونے کا بھی بہت کام ہے۔'' پھول متی نے چٹکی لی۔

''مت تنگ کیا کر اسے ابھی چھوٹی ہے۔'' کانتی نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے دیکھ۔ میں صبح سویرے اٹھ کر گھر کے کام نپٹا کر آٹھ بجے فیکٹری پہنچ جاتی تھی۔ سارا دن گدھوں کی طرح کام کر کے شام کو گھر لوٹ کر پھر گھر کے کام۔ بچوں کو دیکھو پھر ان کے باپ کو بھی دیکھو۔ رات تھک ہار کر بستر پر گرو تو اس کے تقاضے پورے کرو۔ سب کی بھوک مٹاتے مٹاتے اپنا جسم چکنا چور ہو جاتا۔ اگلے دن پھر وہی صبح پھر وہی دوڑ۔ یہاں کتنا آرام ہے۔ نہ کوئی سوچ نہ فکر۔ وقت پر کھانا وقت پر سونا اور دل لگانے کو تم جیسی سہیلیاں۔ بتا اور تجھے کیا چاہیے؟ بچہ ہی جننا ہے نا۔ گھر پر ہوتی تو تیری کوکھ کون سی خالی رہنے دیتا تیرا

مرد۔ کیوں کانتی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''اسے تو صرف اپنے چنٹو سے دور رہنے کا غم ہے۔''

''میں تو جلد سے جلد چھٹکارا پا کر گھر جانا چاہتی ہوں۔'' چمپا نے کہا۔

''گھر جانا چاہتی ہوں۔ ایسے کہہ رہی ہے جیسے پھولوں کی سیج اس کا انتظار کر رہی ہے۔ آج لکھوا لے مجھ سے اگلے سال پھر پیٹ سے ہوگی۔ پھر اس کی فکر کرنا۔'' یہ کہہ کر پھول متی اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور چمپا اٹھ کر چہل قدمی کرنے راہداری میں آ گئی۔

اسپتال کے اوپر کی دو منزلیں صرف حاملہ عورتوں کے لیے بنی ہیں۔ پیٹ نکالے ڈھیلے ڈھالے چوغے پہنے اندر باہر آرام سے چہل قدمی کرتی ایک دوسرے کا حال پوچھتی باتیں کرتی ہیں۔ باہر کے کسی شخص کو وہاں آنے کی اجازت نہیں۔ ملاقات کے لیے انہیں نیچے ہال کمرے میں جانا پڑتا ہے۔

چمپا ٹہل کر کمرے میں پہنچی تو کانتی کی حالت دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اسے لیبر پین شروع ہو چکی تھی۔ ابھی تو نواں مہینہ شروع ہی ہوا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر نرس جمع ہو گئے۔ مسٹر اور مسز اسمتھ دو مہینے پہلے ہی لندن سے اس وقت کے لیے آ چکے تھے۔ انہیں فون کر کے بلا لیا گیا۔ زچگی کے وقت وہ بھی وہیں موجود تھے اور بے صبری سے اپنے بچوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ تین بچوں کو ایک ساتھ اس نے جنم دیا۔ بیٹی اور بیٹوں کو گود میں اٹھا کر ان کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے اور ساتھ ہی حیرت کے تاثر بھی ان کے چہروں پر نمایاں تھے۔ ڈاکٹرز خود حیران پریشان تھے۔ دو بچوں کا رنگ روپ، آنکھیں بالکل مسٹر اسمتھ جیسا اور ایک بیٹے کی رنگت اس کے سر کے بال بالکل کانتی جیسے۔ سارے اسپتال میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔

مسٹر اور مسز اسمتھ تینوں بچوں کو لے کر چلے گئے تھے اور کچھ ہدایتیں ڈاکٹرز کو دے گئے تھے۔ کانتی کو بھی اس کے پورے کرایہ کی رقم مل گئی تھی۔ دیانند اسے لینے آ گیا تھا مگر دونوں کے چہروں پر خوشی نہیں تھی بلکہ ایک پھانس سی چبھ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اپنی تفتیش شروع کر دی تھی۔

کانتی کے جاتے ہی اس کے بستر پر تین ماہ کی حاملہ عورت آ گئی تھی۔

مقررہ تاریخ پر مسٹر اور مسز دکشت بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ چمپا کل سے زیادہ بے چینی انہیں تھی۔ زچگی سے پہلے مسز دکشت اسے ملنے آئی اور بڑا حوصلہ دیا۔ چمپا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

''اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آپ میرے چنٹو کی مدد بھی کریں گی نا؟''

''تم فکر نہ کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا مجھے ڈاکٹروں پر پورا بھروسہ ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہم آج بھی تمہارے ساتھ ہیں کل بھی رہیں گے۔''

چمپا کے چہرے پر سکون کی لہر دوڑ گئی۔

چمپا نے ایک تندرست بچی کو جنم دیا اور جنم ہوتے ہی ڈاکٹروں نے اسے مسز دکشت کی گود میں ڈال دیا۔ وہ دونوں بچی کو پا کر ساتویں آسمان پر تھے۔

جانے سے پہلے چمپا کا شکریہ بھی ادا کیا، اپنی خوشی سے اچھی خاصی رقم Tip میں دی اور چنٹو کے لیے تحفے بھی۔ مسز دکشت نے بچی کو اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''ہماری بچی کو آشیرواد نہیں دوگی۔''

چمپا نے جھک کر بچی کی پیشانی چوم لی۔ دو قطرے اس کی آنکھوں سے لڑھک کر بچی کے رخسار پر ٹپکنے لگے۔ پھر اس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

Tip کی رقم اس نے چھپا کر اپنے سامان میں رکھ لی۔ پورن اسے گھر لے جانے کے لیے نیچے آ چکا تھا۔ آج پھول متی کا چہرہ بھی اداس، بجھا ہوا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ پھول متی سے گلے مل کر جب وہ وہاں سے نکلنے لگی تو اس کی آنکھ بچا کر دھیمے سے اس نے نرس سے پوچھا۔

''سسٹر کتنے سالوں بعد دوبارہ یہاں آ سکتے ہیں؟''

اس کے جواب سے پہلے ہی پھول متی کا زوردار قہقہہ گونجا اور وہ سٹپٹائی سی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

''محبت مر نہیں سکتی''

ڈاکٹر نذیر تبسم اپنی کتاب میں اپنی شریک حیات جواب اس جہاں فانی میں نہیں رہیں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ ہم دونوں میں چھوٹی سی بات پر بڑی لڑائی ہوگئی، گھر کی بیسمنٹ میں، میں بیڈ پر سوتا اور وہ نیچے زمین پر، گرمیوں کی رات تھی، ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سو گئے۔ آدھی رات کو مجھے پیاس لگی، واٹر کولر پاس ہی میز پر پڑا تھا میں نے خود اٹھ کر گلاس بھر پانی پیا، اچانک مڑ کے دیکھا تو وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، غصے سے بولی۔۔۔آپ نے پانی خود کیوں پیا؟

میں نے بھی غصے اور اکڑپن سے کہا، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، مفلوج نہیں ہوں، خود اٹھ کر پانی پی سکتا ہوں، قریب آ کر میرا گریبان پکڑ لیا: بولی۔۔۔ایک بات غور سے سنو! لڑائی جھگڑا اپنی جگہ پر لیکن تمہیں میں اپنا حق اور خوشی نہیں چھیننے دوں گی، پتہ ہے آپ کو پانی دیتے ہوئے مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے، بھلے سے بات چیت بند کیوں نہ ہو، پانی آپ خود نہیں پئیں گے، اس کی آنکھیں نم ناک تھیں، میں نے اسے گلے سے لگا لیا اور لڑائی ختم ہوگئی، اور اب روزانہ رات کو تین چار بار اٹھ کر جب میں خود پانی پیتا ہوں تو سامنے دیوار پر لگی اس کی قد آدم تصویر میں بھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں یا پھر شاید میں اس کی تصویر ہی بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوں تب مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اسے کہا تھا :

"محبت مر نہیں سکتی"

''زبیدہ لاج''

سیما پیروز
(لاہور)

برسوں بعد آج وہ سب زبیدہ لاج میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ناشتے کی میز پر اس نے نظر دوڑائی ماشاء اللہ سب کرسیاں بھری ہوئی تھیں بلکہ کچھ لوگ ادھر اُدھر کھڑے بھی تھے۔ یہاں وہاں اُن لوگوں کے بچے ان کا مستقبل بھرا ہوا تھا مگر ماضی وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔ دور کہیں بہت پیچھے وقت کی گرد میں کھو گیا تھا۔ اس نے چشمِ تصور سے دیکھا وہاں میز کے کنارے والی کرسی پر ابا جی بیٹھا کرتے تھے۔ لمبے چوڑے، سرخ وسفید چہرے پر گھنی مونچھیں۔ شاید مونچھوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی بارعب لگا کرتی تھی۔ پولیس کی وردی اُن پر کتنی سجتی تھی۔ ان کی ساتھ والی کرسی پر اماں اور پھر وہ چھ بہن بھائی۔ ابا جی وقت کے بہت پابند تھے۔ اس لیے سردیاں گرمیاں صبح ساڑے ساتھ بجے ناشتے کی میز پر موجود ہوتے۔ اسی طرح رات کا کھانا پورے آٹھ بجے کریمن بُوا میز پر لگا دیتی تھیں۔ چھٹی والے دن اُن لوگوں کا کیسا جی چاہا کرتا تھا کہ وہ دیر تک سوتے رہیں۔ مگر ابا جی کے خوف کے مارے عین وقت پر پٹ سے آنکھ یوں کھل جاتی جیسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا ہو۔ حالانکہ ابا جی نے آج تک بچوں کو نہ ڈانٹا تھا نہ کبھی مارا پیٹا تھا۔ شاید پولیس کی ملازمت کی وجہ سے ان کے مزاج میں تھوڑی سختی تھی ورنہ وہ ملازموں تک کو نہیں ڈانتے تھے۔ البتہ اگر گھر میں کبھی کوئی بھولے سے کسی مقدمے کی سفارش یا رشوت کے طور پر کچھ لے کر آ جاتا تو پھر ان کا غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ اس وقت سب ڈر کے مارے کانپ رہے ہوتے اور سب بہن بھائی کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے۔ ایسے میں اماں ان سب کو اپنے گرد ایسے اکٹھا کر لیتیں جیسے مرغی خطرے کے وقت چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔

اماں بڑے دھیمے لہجے میں انہیں سمجھا تیں ''دیکھو تمہارے ابا جس پر غصہ ہو رہے ہیں وہ انہیں رشوت دے رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے نا رشوت لینا اور دینا گناہ ہے۔''

آہ پیاری اماں! ان کی یاد سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تو سچ مچ کی جنت تھیں۔ ٹھنڈی میٹھی چھاؤں والا گھنا درخت جس کی چھتر چھایا میں کتنی شانتی اور سکھ تھا۔ اپنی ساری اولاد کو فرداً فرداً ان کے مزاج کے مطابق برتنے اور سمجھنے والی۔

اماں ابا کی یاد سے آنکھوں میں آنے والے آنسو صدف نے انگلی کے پور سے صاف کیے اور دل میں اٹھتی ہوک کو دل میں ہی دبا لیا۔

''ہائے کہاں گئے وہ دن اور وہ پیارے پیارے لوگ۔۔۔''

صبح دم آنکھ کھلتی تو اماں سفید دوپٹے کی بُکل مارے ان سب بہن بھائیوں پر نماز کے بعد دم پڑھ کر پھونک رہی ہوتیں اور بڑے بھائیوں کو نماز کے لیے کتنے پیار سے جگا رہی ہوتیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ اماں نماز کے بعد تلاوت کرتیں اور صدف ان کی گود میں لیٹ جاتی۔ وہ تلاوت بھی کرتی جاتیں اور صدف کے سر اور چہرے پر ہاتھ بھی پھیرتی جاتیں۔ کیسا سرور ملتا تھا اور ایسی میٹھی غنودگی چھا جاتی کہ وہ جانے کن جہانوں کی سیر کو نکل جاتی۔ مدہوشی اس وقت ٹوٹتی جب اماں تلاوت ختم کر چکتیں ''آئے ہائے۔۔۔ سو گئی۔ اب اٹھ جاؤ میری ٹانگ بالکل شل ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی لوٹھا ہو گئی ہو پر بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔''

وہ اٹھنے کی بجائے اور زیادہ اماں کی سے لپٹ جاتی۔ اپنے دونوں بازو ان کی کمر کے گرد حمائل کر کے اور زیادہ ان کی گود میں گھسی جاتی۔

کیسی پیاری اور سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی اماں کے بدن سے۔

''اماں! کون سا پرفیوم استعمال کرتی ہیں آپ؟'' صدف لمبا سانس بھر کے خوشبو سونگھتی۔

''پاگل۔۔۔ صبح صبح میں نے کون سا پرفیوم لگانا ہے۔''

ابا کے ساتھ وہ لوگ جا بجا گھومتے رہتے تھے۔ دو تین سال سے زیادہ کبھی ایک جگہ پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ ہر ٹرانسفر پر اماں سخت بیزار ہوتیں۔ ''لو اب پھر سامان باندھو اور چل پڑو۔۔۔ عجب خانہ بدوشوں والی زندگی ہے۔ جہاں ذرا دل لگنے لگتا ہے وہاں سے کوچ کا حکم مل جاتا ہے۔۔۔''

''نوکری جو ہوئی۔ میں کون سا خوشی سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں۔'' ابا خفا ہو جاتے۔

''بچوں کی پڑھائی کا کتنا حرج ہوتا ہے۔ آپ کی ٹرانسفر بھی تو ایک سے ایک پس ماندہ ضلعوں میں ہوتی ہے۔ آپ کے کئی کولیگ بڑے بڑے شہروں میں مزے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟'' زبیدہ بیگم تو جانتی ہو نا میں رشوت خور ہوں نہ افسروں کی چاپلوسی کرتا ہوں۔ میرے جیسے بندے اسی طرح شٹل کاک بنے رہتے ہیں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ تمہیں ایک ایماندار افسر کی بیوی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔''

پھر ایک دن ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ابا دونوں ٹانگوں اور ایک بازو کا نذرانہ دے کر گھر آ گئے۔ سرکار کی طرف سے تمغۂ جرأت اور ایک پلاٹ ملا۔

''لو بھئی اب تمہیں شہر شہر نہیں گھومنا پڑے گا'' ابا نے اماں سے مذاق کیا تو اماں کی چیخیں نکل گئیں۔ دنوں مہینوں ہم سب سہمے سہمے اداس اور پریشان پھرتے رہے۔

ایک روز ابا جی نے اماں اور ہم سب کو اپنے پاس بلایا۔

''زبیدہ! تم سب کو کیا ہو گیا ہے۔؟ میں زندہ سلامت ہوں۔ اگر میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ختم ہو جاتا تو تم لوگ کیا کر سکتے تھے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے آئندہ میں گھر میں ایسی ماتمی فضا نہ دیکھوں۔''

گھر بنانے سے پہلے ابا اور اماں کی کتنی بحث ہوا کرتی تھی وہ اماں جنہوں نے زندگی بھر ابا جی سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا کیسا کیسا ابا سے خفا ہوتی تھیں۔ ابا ایک کنال پر تین چار بیڈروم کا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اماں بضد تھیں کہ ان کا ماشاء اللہ بھرا پُرا کنبہ ہے۔ اس لیے کم از کم چھ بیڈروم کا گھر ہونا چاہیے۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا گھر کیا کرو گی؟''

''چار بیڈروم چاروں بیٹوں کے لیے ایک ہمارا کمرہ اور ایک گیسٹ روم''

''بچے کیا ساری عمر تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں گے''

''اور کہاں جائیں گے۔۔۔؟ بیٹیاں تو خیر بیاہ کر اپنے گھر بار والی ہو جائیں گی مگر بیٹے بہوئیں اور ان کے بچے تو ہمارے پاس ہی ہوں گے۔ پھر بیٹیاں بھی تو خیر سے میکے آیا کریں گی۔''

''تم بالکل نادان ہو۔ میری بات یاد رکھو کبھی ان خالی کمروں کو دیکھ کر رویا کرو گی''

''اللہ نہ کرے۔ کیسی بدفال منہ سے نکال رہے ہیں۔ آپ بڑا گھر بنا کر نہیں دینا چاہ رہے نہ سہی۔۔۔'' اماں رنجیدہ ہو کر بیٹھ جاتیں۔

جیت آخر اماں کی ہوئی اور زبیدہ لاج کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ابا جی نے ساہیوال والا اپنا آبائی گھر اور سرکار کی طرف سے جو پلاٹ ملا تھا اس کو بیچ کر ایک نئی سوسائٹی میں دو کنال پر پانچ بیڈرومز کا بڑا خوبصورت بنگلہ بنوایا۔ جس روز وہ نئے گھر میں شفٹ ہوئے ان سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ گھر کے باہر اماں اپنے نام کی تختی دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

اس گھر میں آنے کے دو تین سال بعد بڑے بھیا ڈاکٹر اور چھوٹے انجینئر بن گئے۔ اماں نے دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کی۔ دو بہوئیں گھر لا کر مارے خوشی کے اماں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ کیسا بھرا پُرا گھر تھا۔

بڑے بھیا کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔

''کہاں گم ہو صدف۔۔۔؟''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا اس بار میں نے سب کو ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے'' صدف بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''میرا خیال ہے کہ اس گھر اور جو ساہیوال والی زمین ہے ہم فروخت کر دیں'' صدف کے مارے صدمے کے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''بھئی دکھ تو مجھے بھی ہے۔ پر کیا کریں۔۔۔؟ ہم سب باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں زمین کی دیکھ بھال ڈھنگ سے کرنے والا کوئی ہے نہیں۔ اور پھر ہمیں اس زمین کا فائدہ بھی کیا ہے۔ چچا کے بیٹے ساری آمدنی کھا جاتے ہیں کچھ سالوں بعد تم لوگ دیکھنا وہ قبضہ بھی کر لیں گے اور یہ مکان آخر کب تک خالی پڑا رہے گا۔ بیکار میں چوکیدار کی تنخواہ بھرتے رہو۔ ہم میں سے شاید سوائے صدف کے کوئی بھی پاکستان میں سیٹل نہیں ہو گا اور اگر کبھی کوئی واپس آیا بھی تو وہ اپنی آمدنی اور ضرورت کے مطابق گھر بنوا لے گا''

سوائے صدف کے سب نے ہی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ صدف صدمے سے رونے لگ پڑی۔

''عجیب بیوقوف ہو تم بھی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' اپیا نے اس کا مذاق اڑایا۔

''آپ لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہو گا اماں ابا کی نشانی بیچ کر؟''

''پاگل ہو نری۔ اینٹ پتھر بھلا نشانیاں ہوا کرتی ہیں؟''

وہ زچ ہو کر اٹھ کر چلی گئی۔ ''ہے اللہ کتنے مطمئن ہیں میرے بھائی بہن۔ دکھ کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں ان کے چہروں پر۔ میں ہی کیوں ایسی ہوں۔ صدا کی ماضی پرست جھلّی۔''

دوپہر کو سب سو گئے تو وہ باؤلوں کی طرح اوپر نیچے سارے گھر میں پھرتی رہی۔

''یہ کمرہ بڑے بھیّا کا تھا اور یہ ساتھ والا چھوٹے بھیا کا ان کے سامنے اس کا اور اپیا کا کمرہ تھا اور ان کے ساتھ والا چھوٹے بھائیوں کا۔ نیچے ٹی وی لاؤنج سے داہنے ہاتھ پر اماں اور ابا کا کمرہ تھا۔ دونوں بھائیوں کی شادی کے بعد گھر میں رونق عروج پر تھی۔ اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ ناشتے کی میز پر جب سب کرسیاں بھر جاتیں تو اماں ابا سے فخریہ کہتیں۔ ''دیکھا نا ماشاء اللہ کیسے ساری میز بھر گئی ہے۔ آپ تو کہا کرتے تھے اس خالی میز پر ٹیبل ٹینس کھیلا کرنا۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔''

شادی کے دو ڈھائی سال بعد دونوں بڑے بھائی امریکہ چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنی بیویوں کو بھی بلا لیا۔ یوں اماں کی پوتے پوتیاں کھلانے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ جب وہ دکھی ہوتیں تو دونوں چھوٹے بھائی تسلی دیتے۔ ''اماں اداس نہ ہوں ہم دونوں کے پورے ایک درجن بچے ہوں گے۔ وہ سب آپ کی گود میں ہی کھیلیں گے۔'' دم بھر کو ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی۔

اپیا بھی اپنے گھر سدھاریں۔ اماں کو مزید چپ لگ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ جیسے ہی چھوٹے دونوں بھائی تعلیم سے فارغ ہوئے مزید پڑھنے کے لیے وہ دونوں بھی باہر سدھار گئے۔ ان کے جانے پر اماں کیسا کیسا نہیں روئیں۔ ان دونوں نے ضد سے پیار سے اماں کو منا ہی لیا۔

''اماں! کیا آپ نہیں چاہتیں کہ ہمارا مستقبل بھی شاندار ہو۔ یہاں پر اوّل تو نوکریاں ملتی کہاں ہیں؟ اگر مل بھی جائیں تو اس مہنگائی کے دور میں اتنی سی تنخواہ میں گزارا کیسے ہو گا؟ ہم آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم وہاں

سے اتنا کما کر بھیجیں گے کہ آپ اور ابّا جان چین کی زندگی جی سکیں۔آپ نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔اب ہماری باری ہے۔''

''بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔بس تم میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ ہم تھوڑے میں گزارہ کرلیں گے۔ویسے بھی اللہ نے ہمیں بہت دے رکھا ہے۔تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہو تمہارے معذور باپ کو اور مجھے صرف تم لوگوں کی ضرورت ہے۔ہمیں تمہارا روپیہ نہیں چاہیے۔ہمیں صرف تمہارا ساتھ چاہیے۔'' امّاں کے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔

''امّاں! پیاری امّاں! آپ ہمارے راستے کی دیوار نہ بنیں۔ہم وعدہ کرتے ہیں تعلیم مکمل ہونے کے بعد چند سال وہاں لگا کر واپس لوٹ آئیں گے''

''زبیدہ! ضد نہ کرو۔انہیں ہنسی خوشی جانے کی اجازت دے دو۔ پرندوں کے بچے بھی اتنی دیر تک گھونسلے میں رہتے ہیں۔جب تک انہیں قوت پرواز نہیں ملتی۔اب یہ تمہارے پروں کے نیچے نہیں رہ سکتے۔انہیں اب اپنی اپنی زندگی جینے دو''

سال پہ سال گذرتے چلے گئے اور جانے والے پلٹ کر نہ آئے۔ ہر سال ایک نیا بہانہ تیار ہوتا۔دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادی کی اطلاع پر امّاں اتنا روئیں کہ انہیں چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ وقت نے ان کے خواب ان کی آنکھوں سے نوچ کر کہیں پاتال کی گہرائیوں میں پھینک دیے تھے۔ان کا ہر سپنا پانی کی لہروں پہ بناریت محل ثابت ہوا۔

''آپ ٹھیک کہتے تھے بیکار میں نے ضد کر کے اتنا بڑا گھر بنوایا''

''دل چھوٹا نہ کرو۔، ذرا وہ سیٹل ہو جائیں تو چھٹیوں میں ضرور گھر آیا کریں گے'' ابّا انہیں لاکھ تسلیاں دیتے پر ان کے دل کی مرجھائی کلی پھر نہ کھل سکی۔

ابّا کے انتقال کے بعد تو بالکل باؤلی سی ہو گئی تھیں (بھائیوں میں سے کوئی بھی جنازے پر نہیں پہنچ سکا تھا) پہروں یا تو گم صم رہتیں یا پھر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتیں۔ابّا کی پہلی برسی پر سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔امّاں بچوں کو دیکھ کر جیسے ابّا کی وفات کا غم بھول سا گئی تھیں۔

مہینہ بھر وہ لوگ رہے۔کیسی رونق تھی امّاں کے چہرے پر۔

امّاں کو یاد کر کے صدف کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔انگلی کی پور سے آنسو صاف کئے اور باہر لان میں آ گئی۔کتنی یادیں اور محبتیں اس گھر کے چپے چپے پر لپٹی ہوئی تھیں۔وہ کیسے بھول سکتی تھی یہیں پر اس نے سہانے میٹھے سپنے دیکھنے شروع کئے تھے۔اسی گھر میں اس کے دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔

امّاں کو کتنا شوق تھا پھولوں اور پھلوں کا۔لان کے چاروں کونوں پر رات کی رانی، ہارسنگھار، لیونڈر اور موتیے کے مہکتے ہوئے پودے تھے۔کیاریوں میں ہر موسم کے پھول بہار دیتے۔ٹیوب روز کی خوشبو سے سارا گھر مہک اٹھتا۔ گرمیوں میں موتیے پر اتنے پھول آتے۔صدف روزانہ جھولیاں بھر بھر پھول اتارتی اور ان کی لڑیاں پرو کر امّاں کے جوڑے پر لپیٹ دیتی۔جو بچ جاتے وہ پانی کے گھڑوں کے گرد لپیٹ دیئے جاتے۔سردیوں میں رات کی رانی مہکتی تو سارے گھر میں پاگل سی خوشبو اڑتی پھرتی۔بیک یارڈ میں آم، کچنار، لیموں اور نہ جانے کون کون سے درخت لگا رکھے تھے۔

وہ بے مقصد لان میں گھومتی رہی سب پودے جھاڑ جھنکار بن چکے تھے۔مہندی کے پودے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بے اختیار رونا آ گیا۔

''ہائے امّاں! یہ پودا آپ نے کتنے شوق سے لگوایا تھا''

مالی نے انہیں کتنا منع کیا تھا ''بی بی مہندی کا پودا نہیں لگائیں''

''کیوں بھئی۔۔۔؟''

''سنا ہے۔۔۔مہندی کے پودے کے نیچے سانپ رہتا ہے۔''

''ارے جانے دو۔ایسے ہی باتیں بنی ہوئی ہیں۔تم کیا جانو تازہ پتیاں پیس کر لگائیں تو رنگ کتنا اچھا آتا ہے۔میری بہو بیٹیاں لگایا کریں گی'' کیا رنگ اتر آیا تھا ان کے چہرے پر۔

''ہائے یہ جامن کا پیڑ۔۔۔اس کے تنے پر ابھی تک دو نام کھدے ہوئے تھے۔صدف اور عدنان۔وہ بے دھیانی میں اُن ناموں پر انگلی پھیرتی رہی نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور گالوں پر لڑھکتے ہوئے مٹی میں رُل گئے۔اسے لگا ابھی وہ باڑھ پھلانگ کر آئے گا اور کہے گا۔

''اوہو صدف صاحبہ تشریف رکھتی ہیں''

''آپ کو کوئی اعتراض؟'' وہ اترا جاتی۔

''بھئی میں اعتراض کرنے والا کون؟ بس ذرا سا چمن رنگ و بو سے مہک رہا تھا اور خوشبو نے خبر دی کہ تم آئی ہو۔۔۔''

آہ کیسے خوشیوں بھرے وہ دن تھے۔گرمیوں کی لمبی دوپہریں وہ اسی باغ میں کھیلتے گزار دیتے۔امّاں ابّا کے سونے کے بعد وہ سب بہن بھائی سوائے بڑی اپیا اور بڑے بھائیوں کے چپکے سے دبے پاؤں ٹھنڈے کمروں سے نکل آتے۔پڑوس کے بچے بھی آ جاتے اور خوب کھیلتے۔کیریاں توڑ کر نمک مرچ لگا کر کھائی جاتیں، جھولا جھولتے، لکن میٹی کھیلتے۔

عدنان اور صدف تقریباً ہم عمر تھے۔اس لیے اُن دونوں میں خوب بنتی تھی۔عدنان ذرا دبّو قسم کا لڑکا تھا اور صدف تو پٹاخہ تھی۔ایسی حاضر جواب کہ بڑوں بڑوں کو لاجواب کر دیتی۔ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب اس کے پاس موجود ہوتا۔سب شرارتوں کی سرغنہ، بولڈ اور نڈر۔اونچے سے اونچے پیڑ پر منٹوں میں چڑھ جاتی۔وہ درخت کی سب سے اونچی ڈال پر جھولتی ہوئی عدنان کو اوپر آنے کے لیے کہتی۔وہ مارے خوف کے وہیں آنکھیں بند کیے کھڑا رہتا۔''بزدل'' وہ قہقہہ مار کر ہنستی اور بندر کی طرح اچک کر ایک ڈال سے دوسری پر لٹک جاتی۔

چاندنی راتوں میں وہ پہروں آنکھ مچولی کھیلتے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن پر لگا کر اڑ گئے۔اپیا بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔دونوں بڑے بھائی اور

بھابھیاں باہر چلے گئے۔عدنان انجینئرنگ کے آخری سال اور وہ ایم اے فائنل میں پہنچ گئی۔عدنان اور صدف کی ابھی بھی دوستی تھی لیکن اب وہ سب اتنے مصروف تھے کہ دنوں ملاقات نہ ہو پاتی۔مگر نادیہ اور صدف چونکہ کلاس فیلو تھیں اس لیے وہ اکثر اکھٹی ہوتیں۔

عدنان کا انجینئرنگ کا رزلٹ آیا تو اس نے باہر جانے کی تیاری کر لی۔وہ سب کتنا اداس تھے خاص طور پر صدف کیونکہ وہ گہرے دوست تھے۔امریکہ سے اکثر اس کے کارڈ آتے رہتے۔دوسال کے بعد وہ اپنی والدہ کی بیماری کا سن کر ملنے آیا تو پہچانا نہیں جارہا تھا۔

دبلے پتلے اور بقول صدف کے ٹیڑھی ٹانگوں اور مسکین سی شکل والے عدنان کی جگہ ایک خوبرو اور سمارٹ نوجوان میں ڈھل چکا تھا۔صدف تو اسے دیکھ کر چیخ پڑی۔

''ارے واہ!تم تو اچھے خاصے نکل آئے ہو۔''

وہ جھینپ گیا۔سب نے بیساختہ قہقہہ لگایا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ پہلے تم لم ڈھینگ سے ہوا کرتے تھے''

عدنان کے واپس جانے سے پہلے رحیم چچا اور چچی صدف کے لیے پرپوزل لے کر آئے جو سب کے ساتھ صدف کے لیے باعث حیرانی تھا۔مانا کہ وہ بچپن کے دوست اور ساتھی تھے پر ایسا تو ان کے بیچ کچھ نہیں تھا۔صدف نے صاف انکار کر دیا۔امّاں سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی۔''نواب زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ارے گھر بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے بچپن کے ساتھی ہو۔ تمہیں اور کیا چاہیے۔رحیم بھائی اور بھابھی سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں''

اس کے انکار کی وجہ سن کر سب بہت ہنسے''لوگ سوچیں گے کہ میرا اور عدنان کا پہلے سے چکر چل رہا ہوگا''

''بیوقوف!ہمیں کیا لینا دینا لوگوں سے۔ہمیں اور عدنان کے گھر والوں کو سب پتہ ہے اور اگر تم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہو تو کیا برائی ہے۔''

امّی،اپیا اور نادیہ نے اس کے خوب لتے لیے۔

عدنان کے واپس جانے سے پہلے منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی۔منگنی کے بعد صدف عدنان سے ذرا کم بات چیت کرتی تھی۔وہ پریشان تھا کہ صدف شاید ابھی بھی خوش نہیں ہے۔کہیں اس کے انکار کی وجہ کچھ اور تو نہیں۔جب صدف کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا۔شامت اعمال عدنان اُسے لان میں اکیلا نظر آ گیا۔صدف نے اس کی اچھی خاصی گوشمالی کی۔

''اب کیا میں اپنی منگنی پر بھنگڑا ڈالوں۔چوبیس گھنٹے تمہاری طرح ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بن کر پھروں۔''

عدنان بےساختہ ہنس پڑا۔

''لمبے لمبے دانت مت نکالو۔اتنے خوبصورت نہیں ہیں''صدف چڑ کر بولی۔

''یہ ہوئی نا بات۔اب تم پہلے والی صدف لگے رہی ہو۔یار مجھے تمہارا یہی روپ تو پسند ہے۔بولڈ اور جھگڑالو۔''

پھر وہ مزید دوسال کے لیے چلا گیا۔اس کے خط،کارڈ اور ٹیلیفون آتے رہتے۔ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تو اس کی آواز آتی''تمہاری آواز سننا چاہتا تھا اور ایک عدد ڈانٹ۔بہت دن ہوئے تم نے ڈانٹا نہیں تھا۔''

وہ جواباً ہنس کر کہتی''بالکل پاگل ہو!چلو فون بند کرو۔اتنا بل بن جائے گا۔فضول خرچی مت کیا کرو۔چچا کی بڑی حق حلال کی کمائی ہے۔''

''محترمہ!اس کال کا بل میں تمہارے چچا کی کمائی سے ادا نہیں کروں گا۔یہ میں اپنی کمائی سے ادا کروں گا۔''وہ ہنستا ہوا فون بند کر دیتا۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے مابین فاصلہ بڑھنے لگا۔اس کے خطوں اور کارڈز میں کمی آنے لگی۔فون بھی کم آنے لگے۔اگر آتا بھی تو محسوس ہوتا جیسے اس کا دھیان کہیں اور ہے۔

وہ بہت دنوں کے بعد نادیہ کی طرف گئی تو اسے لگا جیسے وہ آنٹی بے حد روتی رہی ہوں۔اس کے پوچھنے پر نادیہ نے ٹال دیا۔اسے دل میں برا لگا لیکن وہ خاموش رہی کہ ہوگا کوئی ذاتی مسئلہ جو وہ بتانا نہیں چاہتیں۔نادیہ دن بدن عجیب ہوتی جارہی تھی۔خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔صدف محسوس کر رہی تھی جیسے اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔جو چپ نادیہ کی چچی کو لگی تھی وہی چپ امّاں کو بھی لگ گئی۔صدف کا دل بھی ہر دم پریشان رہنے لگا۔بہت دنوں سے عدنان کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

ایک دوپہر اس نے نادیہ کو گھیر لیا۔اپنی قسم دے کر آخر وہ نادیہ سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہوگئی۔

''عدنان نے فون کیا تھا کہ وہ نہ تو ابھی واپس آنا چاہتا ہے اور نہ شادی کرنا چاہتا ہے''نادیہ نے روتے ہوئے بتایا۔

صدف نے غصے سے کھولتے ہوئے عدنان کو فون کیا''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟مجھے سچ سچ بتادو۔۔۔یقیناً تمہارا کوئی چکر ہوگا۔''

''کوئی چکر نہیں ہے۔۔۔بس ابھی اپنے آپ کو شادی کے لیے تیار نہیں پاتا۔مجھے ابھی اپنا کیریئر بنانا ہے میں پاکستان واپس آکر چند ہزار روپوں کی نوکری میں گزارہ نہیں کرسکتا۔''

''تمہیں کیریئر بنانے میں کتنے سال لگیں گے؟دو،چار،دس،کتنے سال۔''صدف نے طنز کیا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔اسی لیے میں تمہیں پابند نہیں رکھنا چاہتا''

''بہت اچھا کیا تم نے بتا دیا۔مہربانی تمہاری۔۔۔''تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی تیرتی رہی۔

''اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری محبت میں مری جا رہی ہوں وہ تم تھے۔۔۔ جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے میں نہیں۔'' اور اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اُن دنوں وہ کس قدر افسردہ اور دکھی تھی۔ محبت کے چھن جانے کے علاوہ اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت مارے ڈال رہی تھی۔ کیا میں اتنی بے مایہ تھی کہ عدنان نے اپنے کیریئر کی خاطر مجھے ٹھکرا دیا۔ اتنے سالوں کی دوستی تک کو بھول گیا۔''

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ عدنان کا حشر کر دے بظاہر تو وہ یہ ثابت کرتی تھی جیسے منگنی ٹوٹنے کا اسے کوئی غم نہیں تھا اور نہ ہی عدنان کی اسے رتی بھر پرواہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے ہر چیز عدنان کی یاد دلاتی تھی۔ باغ میں جاتی تو چاندنی رات، موتیے کے پھول وہ کیسے جھولی بھر کر اس کے اوپر ڈالا کرتا تھا۔ بارش ہوتی تو اسے وہ بھیگی راتیں یاد آتیں۔ جب سب مل کر رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے۔ بار بار چائے اور کافی پی جاتی۔ ایک روز پہلے دیکھی ہوئی فلم پر زور شور سے تبصرہ ہوتا۔ بیت بازی کی محفل جمتی۔ اب تو سب کچھ خواب لگتا تھا۔

ایک کہر آلود صبح رحیم انکل کی ڈیتھ ہو گئی۔

مرنے سے پہلے انہوں نے سختی سے منع کر دیا ''خبر دار اگر نے میرے مرنے پر عدنان کو بلایا۔ وہ ہم سب کے لیے مر چکا ہے''

چچی پہروں صدف کو گلے لگا کر روتی رہتیں اس کی اور نادیہ کی کچھ ہی عرصے میں شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد وہ میکے آئی تو پڑوس میں تالا پڑا تھا چچی نادیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔

صدف اپنے گھر میں خوش تھی۔ پھول سے بچے جاں نثار قسم کا شوہر۔ بظاہر وہ بہت مطمئن اور خوش تھی پر دل میں ایک پھانس سی گڑی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ عدنان کو کبھی یاد نہ کرے۔ وہ عمر کے اس دور سے تعلق رکھتا تھا جو گزر چکا تھا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کا فائدہ۔۔۔؟ مگر وہ مسلسل کسی نہ کسی بہانے یاد آتا رہا۔ اس کا خیال کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا۔ کیا وہ مجھے بھول چکا ہو گا۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ صدف کی شادی پر اس کا آخری کارڈ ملا تھا۔

''میں جانتا ہوں تم بہت پیاری لگ رہی ہو گی۔ خدا کرے تم سدا خوش رہو۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

صدف نے غصے سے کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔

ماربل کے بنچ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اور کمر تھک گئی تھی وہ اٹھنے کو تھی کہ آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے یقینی سے سامنے دیکھا کی تخیل کی اڑان، نظروں کا دھوکہ یا واہمہ۔ باڑھ کے اس پار سے کوئی پلانگ کر اس کی اُور چلا آ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک کر منہ میں آ گیا۔ اس کے ارد گرد تیز آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ لیکن اس وقت اچانک اسے سامنے پا کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کہیں بھاگ جائے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت نے اس کے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ صدف نے دل کڑا کر کے نظر بھر کر عدنان کو دیکھا وہ کافی بدل گیا تھا۔ اس کا سرخ وسفید رنگ جھلس کر تابنے جیسا ہو چکا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

''کیسی ہو۔۔۔؟''

''اچھی ہوں۔۔۔''

''تم سے ملنے کی میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں۔۔۔''

''کیوں۔۔۔؟'' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''تم بالکل بھی نہیں بدلی ہو۔۔۔ نہ مزاجاً اور نہ۔۔۔'' عدنان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے اُسی طرح ہو۔ وقت نے تم پر کوئی خاص اثرات نہیں چھوڑا۔''

''کتنا وقت گزر گیا'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد صدف نے بات کرنے کے لیے سرا ڈھونڈا۔

''ہاں۔۔۔ بہت وقت بیت گیا'' عدنان بلا مقصد ہی اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔

عدنان نے اس کے شوہر اور بچوں کی خیریت دریافت کی۔ جواباً اس نے بھی کی۔ عدنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تن گئی۔ صدف جو اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ پوچھ نہیں پا رہی تھی۔ آج بھی اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت وہ بھولی نہیں تھی۔

''اس وقت تمہارا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں'' وہ بے چینی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے بولا ''میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں برسوں سے تم سے معافی مانگنے کی حسرت دل میں لیے پھر رہا ہوں۔''

''معافی کیسی؟ جو آپ نے مناسب سمجھا کیا۔ جو وقت گزر گیا اب اسے دہرانے سے فائدہ؟'' وہ جانے کے لیے مڑی۔ وہ جو ہمیشہ عدنان کے ایک بار ملنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی تا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔۔۔ اس گھڑی اس کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بدلے کی خواہش۔۔۔ نہ کچھ چھن جانے کا دکھ نہ کوئی احساس زیاں۔۔۔

''پلیز صدف! رکو۔۔۔ جو میں کہنا چاہ رہا ہوں مجھے کہنے دو۔ پھر شاید زندگی میں موقع ملے نہ ملے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میں نے زندگی میں جس لڑکی سے محبت کی ہے جس کو ٹوٹ کر چاہا ہے وہ صرف تم ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اور نظروں میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔

عدنان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں نے تم سے دور جانے کا کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جوسلین میری کلاس فیلو اور بڑی اچھی دوست تھی۔ میں

اکثر اس کے ساتھ تمہاری باتیں کیا کرتا تھا۔اور تمہارے لیے شاپنگ بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔ وہ عام امریکی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ سلجھی ہوئی، سادہ مزاج اور نیک اطوار۔ آخری سمسٹر میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے ہم سب لوگ اپنے اپنے وطن لوٹنے کے خیال سے بہت خوش تھے۔

انہی دنوں رمضان اور عید آ گئی میں نے سوچا چلو اسی بہانے اکٹھے ہوتے ہیں۔امتحانوں کے بعد تو سب اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ جائیں گے۔ اس رات میں نے کچھ دوستوں کو ڈنر پر بلایا۔رات گئے تک خوب ہنگامہ رہا۔ پھر سب لوگ چلے گئے میرے منع کرنے کے باوجود جوسلین رکی ہوئی تھی۔

''اپنے کمرے کی حالت دیکھو جیسے بھوت ناچ کر گئے ہوں۔اکیلے سب کیسے کرو گے تم کمرہ سیٹ کرلو میں برتن دھو دیتی ہوں''

''رات زیادہ ہو جائے گی''

''تم مجھے چھوڑ آنا''

اے کاش وہ رات میری زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔ وہ رات جس نے میری ساری زندگی پر سیاہی پھیر دی۔ نہ جانے کب ہم دونوں کسی کمزور لمحے کی زد میں آ گئے۔اس ایک لمحے نے ہم دونوں کو اپنی نظروں میں گرا دیا۔ہم جو اتنے اچھے دوست تھے ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ میں اپنے آپ سے اور جوسلین سے شرمسار تھا۔ وہ کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں کہ میں کتنا گرا ہوا انسان ہوں۔اور میں تمہارا سامنا کیسے کروں گا؟ اتنے سالوں کی میری شرافت اور پارسائی مٹی میں مل گئی تھی۔

ایک دن جوسلین پریشان سی آئی اور اس نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا۔ پھر میں نے اس سے شادی کر لی ہماری شادی ایک سال چلی۔ بچہ بھی پری میچور ہوا جو دنیا میں چند سانس لے سکا۔ بارہا میں نے چاہا کہ میں واپس آ جاؤں اور سب سے معافی مانگ لوں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گی اور پھر اتنی دیر ہو گئی کہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

'' کاش میں لوٹ آتا۔ وقت بیت جائے تو انسان کے پاس پچھتاووں کے سوا کچھ بچتا ہی نہیں۔''

اتنے سال بیتنے کے باوجود دوسری لڑکی کا سن کر اس کے دل میں کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔

''آپ یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ اس سارے قصے سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ایک چھوڑی ہو گی تو کئی اور مل گئی ہوں گی'' وہ جل کر بولی۔

''صدف! میرا یقین کرو۔ وہ میری پہلی اور آخری بھول تھی۔ جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔''

''مجھے اس جھوٹی کہانی پر رتی بھر اعتبار نہیں''

پھر وہ جانے کے لیے اٹھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے باڑھ کے کنارے تک چھوڑنے چلی آئی۔

''اندر نہیں آئیں گے۔ سب آئے ہوئے ہیں''

''کس منہ سے جاؤں؟''

''اس منہ سے۔۔۔ جیسا اب ہو چکا ہے۔'' وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

باڑھ پھلانگنے سے پہلے عدنان نے اسے مڑ کر دیکھا۔اس آخری نظر میں جانے کیا کچھ تھا کہ وہ اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے۔اس نے اپنی ہتھیلیوں سے انہیں صاف کیا۔ ایک لمبا سانس لیا۔ پھر وہ انتہائی پرسکون اور ہلکی پھلکی اندر کی طرف چلی دی۔

بقیہ : واپسی

اپنے بستر سے اٹھا اور غش کھا کر وہیں گر پڑا۔ اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے پایا کہ کمال اس کے سرہانے بیٹھا ہے اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا ہے۔

ساجد سرگوشی کے لہجے میں بولا، 'کمال، وہ عفریت موبائل سے بھی غائب ہے۔'

ڈاکٹر سوالیہ انداز سے کمال کو دیکھنے لگا۔ کمال نے کسی طرح بات ٹال دی اور اس کے جانے کے بعد موبائل میں تصویریں چیک کیں۔ پھر لیپ ٹاپ میں دیکھیں۔ غار کی تمام تصویروں سے وہ پراسرار عفریت غائب تھا۔ کمال ہونٹ بھینچ کر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

دو دن بعد جب وہ اپنے شہر پہنچے تو کمال نے ساجد سے معذرت طلب کی کہ اس کی وجہ سے ساجد کو اس قدر پریشانی ہوئی۔ ساجد نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی، لیکن اسے بھی افسوس تھا کہ وہ خوامخواہ کمال کے ساتھ گیا۔

پندرہ دن بعد انتخابات کے نتیجے آ گئے۔

جب کمال، ساجد سے ملنے اس کے گھر پہنچا تو صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ ساجد اب تک سو رہا تھا۔ اس کی والدہ نے روکنے کے باوجود ساجد کو جگا دیا۔ کمال کچھ بجھا بجھا ساجد کے کمرے میں داخل ہوا اور تازہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ ساجد نے سرورق پر نظر ڈالی اور چیخ مار کر اخبار پھینک دیا۔

'کیا ہوا؟؟' کمال نے پوچھا۔

'کمال، اخبار میں یہ کیا چھپا ہے؟'

'ساجد، ہم نے عوام کو بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن اب کیا کر سکتے ہیں۔ یہی نتائج ہیں۔'

'نتائج گئے چولہے میں بھائی۔ اس کے پہلے صفحے پر غار والا عفریت کیوں ہے......؟' ساجد ہذیانی انداز میں چیخا۔

ساجد کی بات سن کر کمال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ملکی رام لاہوریہ

پرویزشہریار
(نئی دہلی)

جس نے لاہورنئی ویکھیا،
وہ سمجھوجمیا اِی نئی !
میں نے بھی پاکستان نہیں دیکھا تھا۔

لیکن، ریفوجی کالونی کو دیکھ کر مجھے کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا کہ کراچی اور لاہور کے لوگ کیسے زندہ دلی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوں گے۔کالونی کے ایک سرے پر سونے کے کلس والا گرودوارہ تھا، جہاں سیواداروں کی ہمہ وقت چھل پہل رہتی تھی اور صبح صبح گروانی کے انمول وچن کانوں میں رس گھولنے لگتے تھے ۔کلس پر سونے کی کرپان تھی اور گہرے نیلے رنگ کے ساٹن پر روپہلے رنگ کی دو تلواریں چاند سا ہالہ بنا رہی تھیں۔

'جو بولے سونہال، ست سری اکال!'
'واہے گرو کا خالصہ، واہے گرو کی فتح!'

ایسے ہی ستیہ وچن کی صداؤں سے فضا ہر وقت گونجتی رہتی تھی۔اُن گلیوں میں بسا اوقات عود اور لوبان کی خوشبوئیں بسی رہتی تھیں۔

۱۹۴۷ میں ملک تقسیم کیا ہوا کہ ہر طرف ہندو مسلم فسادات برپا ہو گئے اور انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ باگ اپنے پرکھوں کی صدیوں سے آباد سرزمین چھوڑنے اور ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے۔انگریزوں کی غلامی سے تو ہمیں نجات مل چکی تھی لیکن فرقہ وارانہ تعصب کا طوق ہمارے گلے میں پڑ گیا تھا۔گورے فرنگیوں نے ملک سے جاتے جاتے ہمارے دلوں میں نفرت کے بیج ہمیشہ کے لئے بو دیئے۔جس کا نتیجہ تھا کہ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور ایک دوسرے سے وحشی درندوں سے بھی بدتر سلوک کرنے لگا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اتنی بڑی انسانی آبادی سرحد ِنو دریافت کے اِس پار سے اُس پار کسی ڈھور ڈنگر کی طرح بے تحاشہ منتقل ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔تباہی اور بربادی کا یہ طویل سلسلہ اسی طرح کئی مہینوں تک چلتا رہا ۔ہندوستان سے مسلمان مہاجرین ملک خداداد پاکستان کی سمت کوچ کر رہے تھے اور پاکستان سے ہندو اور سکھ مہاجرین امن وامان کی تلاش میں ہندوستان آرہے تھے۔ان میں بہتیرے ایسے لوگ بھی تھے جو نقل وحمل کی استطاعت نہیں رکھتے تھے یا پھر اپنی سرزمین سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اب وہاں کے مقامی دوست اور احباب کے رحم وکرم پر ڈرے سہمے ہوئے رہ گئے تھے جنہیں اپنا مستقبل اب ڈانواں ڈول نظر آرہا تھا۔

ہمارے آر ڈی ٹاٹا ہائی اسکول کے احاطے سے متصل ایسے ہی مہاجروں کی ایک کالونی تھی جو عرف عام میں ریفوجی کالونی کے نام سے مشہور تھی۔یہ مہاجرین مغربی پنجاب اور لاہور کے علاقے سے لٹ پٹ کر کسی طرح اپنی جانیں بچا کر ہندوستان پہنچے تھے،حکومت نے فوری طور پر واجبی سے کچے پکے مکانات تعمیر کرا کے انھیں کالی ماٹی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک غیر آباد خطہ ارض میں پناہ دے دی تھی۔یہاں یہ لُٹے پٹے پناہ گزین خود کو بہت خجل محسوس کرتے تھے۔کھلے آسمان تلے، جھار جھنگاڑ کے بیچ گذر اوقات کرنے میں وہ بہت ننگ وعار محسوس کرتے تھے۔وہ اپنی ایسی شان وشوکت اور عیش وعشرت والی زندگی کو تج کے ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ریفوجی کیمپ کی قطاروں میں کھڑے ہو کر کھانے کپڑے اور دوائی لیتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

وہ کہتے ہیں ناں کہ پنجابی بندہ مٹی کو بھی رُل کر سونا نکال سکتا ہے۔یہ حقیقت ہے، پنجابی قوم فطری طور پر بہت جفاکش واقع ہوئی ہے۔لہٰذا، انھیں اُجڑ کر بسنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔اُن میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے، جو اپنے کاروبار اور پیشے کے اعتبار سے غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔اُن ہنرمندوں میں ایک نوجوان تھا ملکی رام ---- جو بظاہر کسی پیشے میں کوئی دخل نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کے اندر کچھ کر گذرنے کا ایک غیر معمولی جذبہ موجود تھا۔

اُس نوجوان کے پاس خالی دو ہاتھ تھے اور ہر دم سوچنے والا دماغ۔۔۔جو کسی بھی ساعت ماضی کی یاد سے بیگانہ نہیں ہوتا تھا۔اُس کی یادوں میں لاہور کی رونقیں اُس وقت بھی بسی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں ایک تابناک مستقبل کا خواب ہمہ وقت چمکتا رہتا تھا۔وہ مالی اعتبار سے بے شک قلاش ہو چکا تھا، لیکن اس کے حوصلوں اور اُمنگوں میں کبھی کمی نہیں ہوئی تھی۔

پاکستان سے آنے والے پناہ گزیں جلد ہی اپنے مادرِ وطن کے چھٹنے اور اپنے پیاروں کے لٹنے کا غم بھول کے اپنے اپنے روزگار میں لگ گئے۔ٹاٹا کمپنی نے ساکچی بازار کے آخری سرے پر پناہ گزینوں کے لیے ریفوجی مارکیٹ تعمیر کرا کے اس میں ریفوجیوں کو دُکانیں الاٹ کر دی تھیں۔ملکی رام کے حصے میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔لیکن اُس نے حالات کے سازگار نہ ہونے کا رونا رونے کے بجائے ٹاٹا کمپنی ہی کے صدر دروازے پر دو روپے کا تمبا کو جسے مقامی زبان میں کھینی کہتے ہیں، لے کر بیچنے کے لیے بوری بچھا کر بیٹھ گیا۔اس کے پاس زمین پر بچھانے کے لیے ایک پھٹی سی بوری تھی، سیر بھر کھینی تھی اور ایک پلڑے والا چھوٹا سا ترازو تھا۔یہی اس کا کل اثاثہ تھا۔

آدی باسی مرد اور زن مزدور کمپنی کی دہکتی ہوئی سرخ لوہے کی بھٹیاں جھونکنے کے بعد کھانے کے وقفے کے وقت باہر آتے تو کھانے سے فارغ ہو کر کھینی ضرور کھاتے تھے۔تمباکو میں چونا ملا کر جب اُس پر تال دیتے تو اکثر ان کی زبان پر یہ محاورہ رواں ہو جاتا تھا۔۔۔

اسّی چٹکی نوّے تال، پھر دیکھو، قدرت کا کمال!

اس شغل سے انھیں نئی تازگی اور محنت کرنے کے لیے ازسرِنو جوش مل جایا کرتا تھا۔

ملکی رام کے اندر صبر کا مادّہ بہت تھا۔ وہ محنت کش انسان تھا۔ اس کے اندر خوداعتمادی بہت تھی۔ کڑاکے کی سردی، تپتی دھوپ اور موسلا دھار بارش میں بھی برگد کے نیچے اپنی ٹھیہ جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ تجارت کس طرح سے کی جاتی ہے، سیکھنا ہو تو کسی پنجابی سے سیکھو! ملکی رام اچار اور پیاز سے روٹی کھاتا، تن پر ایک قمیض اور لٹھے کی سفید شلوار ہوتی تھی، کندھوں پر شملہ اور سر پر پٹھانوں والا کلف دار صافہ، لیکن اسی میں مگن رہتا تھا، وہ۔ نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا اُس نے اور نہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی حالات کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ اس کے پاس ایک سائیکل تھی، جسے وہ ہر وقت چمکا کے رکھتا تھا۔ رات برات کہیں جانا ہوتو اس کی ٹرن ٹرن کرتی گھنٹی اور ڈائنمو سے چارج ہونے والا بلب جلتا رہتا تھا۔ اسے پہاڑ جنگل گاؤں سے گزرتے ہوئے بھوت پریت کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ ٹاٹا کی آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے صدر گیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے وہ خود بھی آئرن مین یعنی مردِ آہن بن چکا تھا۔ اُس کے آہنی ارادوں کے سامنے حالات کی آندھیاں چاہے کتنی بھی تیز چلیں، خواہ طوفان آئے لیکن ملکی رام کو اُس کے ارادے سے کوئی بھی ٹس سے مس نہیں کر سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے، اُس مردِ آہن نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھ ڈالی۔ جمشید پور کے باشندوں نے دیکھا ۔۔۔

ملکی رام کی زندگی میں کئی بار ایسا وقت بھی آیا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ ٹوٹ جاتا لیکن اس نے نامساعد حالات کا ہر بار ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پھر زندگی نے ایک ایسی کروٹ بدلی کہ بیس برس کے عرصے میں اُس نے چھوٹی چھوٹی سرکاری الاٹ شدہ دُکانوں سے پرے اپنا ایک الگ ایمپائر کھڑا کر لیا۔ اس کے بڑے بڑے شوروموں میں برانڈیڈ کمپنیوں کے ساز و سامان فروخت ہونے لگے۔ اُس نے اپنا نجی شاپنگ کمپلیکس تعمیر کروا لیا تھا۔ وہ جمشید پور جیسے صنعتی شہر کی تجارتی دُنیا کا بے تاج بادشاہ مانا جانے لگا۔ موٹر گاڑیوں کی ریل پیل رہنے لگی، اس کے ایمپائر کے گرد و پیش۔ ملکی رام کو ونٹیج کاروں کا بڑا شوق تھا۔ ہمہ وقت کئی کئی کاریں اس کے شوروم کے وسیع و عریض احاطے میں کھڑی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود، ملکی رام نے اپنی پرانی سائیکل نہیں بیچی تھی۔ یہ سائیکل ایک شوکیس میں بند کر کے پبلک کی دیدار کے لیے رکھ دی گئی تھی۔ وہ اس کے ماضی کی واحد نشانی تھی۔

ملکی رام اپنے کاروبار میں اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ شادی بیاہ، تیج تہوار کے موقعوں پر بڑے بڑے رئیسوں کی زبان پر بس ایک ہی نام رہتا۔۔۔ ملکی رام اِمپوریم ۔۔۔ وہ شہر کے نامی گرامی رئیسوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔

لیکن، ان سب کے باوجود ملکی رام نے خود کو بالکل بھی بدلا نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آج بھی لاہور کی پرانی انارکلی جھوم اُٹھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار صرف ایک بار اپنے وطن چلا جائے۔ لیکن وہ اُس منظر کو بھول نہیں پاتا تھا کہ جب اُس کی نگاہوں کے سامنے اُس کے ماں باپ کو سن سینتالیس کے خون خرابے کے دوران جان بچا کر بھاگتے وقت قافلے پر حملہ کر کے بلوائیوں نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا تھا۔ ملکی رام کو جب بھی وہ خوفناک منظر یاد آتا تو وہ بہت افسردہ ہو جایا کرتا تھا۔ برسات کی وہ ایک سیاہ رات تھی، کڑاکے کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی۔ بارش بہت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا اس کے والدین کا بہیمانہ قتل کیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ خوف کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اُس منظر نے اُس پر اِس قدر ہیبت طاری کر دی تھی کہ کئی برسوں تک وہ راتوں کو نیند میں برے خواب دیکھ کر جاگ جایا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ نصف صدی کا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی وہ جب کبھی وہاں جانے کا ارادہ کرتا تو قتل و غارت گیری کے وہ خونچکاں مناظر اسے اندر سے ایک دم جھنجھوڑ کے رکھ دیتے تھے۔ لیکن، وہ اُس خوفناک منظر سے کبھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ملکی رام ہندوستان میں انارکلی تعمیر کر کے اپنے بچپن کے اُس خوف کو ہرانا چاہتا تھا۔ اُس کی اسی ضد نے آج اسے تجارتی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا دیا تھا۔

زمانہ تیزی سے بدل گیا تھا، اُس کے پوتا پوتی ہر طرح سے اُسے کہہ کہہ کے تھک چکے تھے۔

''بابا! اب تو اپنا لائف اسٹائل چینج کر دو۔ بھگوان کی کرپا سے پیسے بھی بہت آ گئے ہیں''۔ اس پر ملکی رام اپنے مخصوص انداز سے بڑے گمبھیر لہجے میں کہتا۔ ''بچو! مانا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے ہم دُنیا کی تمام آسائشیں خرید سکتے ہیں۔ لیکن پیسے سے اپنے ماضی کے ان سنہری پلوں کو واپس نہیں لا سکتے۔ پیسہ ہمارا ذہنی سکون، ہمارے دل کا قرار نہیں لوٹا سکتا!

یہی وجہ تھی کہ ۔۔۔ وہ آج بھی لٹھے کی شلوار اور سفید قمیض ہی پہنتا تھا۔ ملکی رام نے اپنے اندر کے انسان کو مرنے نہیں دیا تھا۔ وہ آج بھی اپنی حویلی نما کوٹھی کے باہر نیم کے درخت کے نیچے مونجھ کی چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ اس کا ضمیر نامساعد حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکا تھا جو اس کے تن میں کسی نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ یہ نگینہ رات کی تنہائی میں اسے اکثر روشنی فراہم کیا کرتا تھا۔ یہ خیال گذشتہ کئی برسوں سے اسے خواب میں آ کر خوفزدہ کرتا تھا۔ لیکن ملکی رام اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے والوں میں سے تھا۔

اُسے اپنے بچپن کے دوست سہیل، عسکری اور قاسم سبھی یاد تھے جن کے ساتھ وہ کبڈّی کھیلا کرتا تھا، کبھی کوٹھی کی چھتوں پر چڑھ کے کنکوئے اور پتنگیں اُڑایا کرتے تھے، وہ آم کے باغات میں جا کر کبھی درختوں پر چڑھ کے باغ بکری کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ وہ محلے کی گلیوں میں ان کے سنگ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا۔ اُسے سائیکل بہت عزیز تھی۔ اُسے اِس بات پر کتنا ناز تھا کہ اپنے دوستوں میں سب سے اچھی سائیکل اُسی کی تھی۔

ملکی رام کے زیادہ تر کاریگر مسلمان تھے جو مینا کاری، زردوزی اور کشیدہ کاری کے کام میں ماہر تھے۔ ملکی رام ان کاریگروں پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ جب

کبھی کوئی بہت بڑا آرڈر اسے ملتا، وہ اپنے سب سے زیادہ معتبر کاریگر نصیر خان کو بلا کر اس کے حوالے کرتا اور صرف اتنا کہتا۔ ''دیکھو اسرار! میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ کام میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔'' جواب میں نصیر بھی بڑی حلیمی سے کہتا۔ ''مالک! میں نے کام میں کبھی کوئی کسر چھوڑی ہو تو بتاؤ؟ آپ کا ہر کام میں پوری محنت اور ایمانداری سے کرتا ہوں۔'' یہ سن کر ملکی رام جذباتی ہو جاتا۔ ''نصیر! تیری اسی بات نے تو مجھے تم سب کا گرویدہ بنا دیا ہے، ورنہ میں اکیلا بندہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔ خدا نے مسلمانوں کو یہ ہنر بڑی فیاضی سے دیا ہے۔ تم سب کچھ ہو یا نہ ہو کاری گر بہت اچھے ہوتے ہو۔ خدا تمہارے ہنر کو سلامت رکھے!''

۱۹۶۴ میں جب ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد چھڑ گیا تو ملکی رام نے نصیر کے پورے خاندان کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ بلوائیوں سے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اس کے بیوی بچوں کی حفاظت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نصیر خان کا پورا خاندان اس کا احسان مند تھا اور ہر وقت سر تسلیم خم کیے رہتا تھا۔ رات کے بارہ بجے بھی اگر ملکی رام نصیر کو بلاتا تو وہ سر کے بل چل کے جانے کو تیار رہتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی سے کاروبار میں اتنی ترقی ہوئی تھی کہ آس پاس کے سبھی دکاندار اُن کی دوستی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں یہ آرزو کرتے تھے کہ کاش! انھیں بھی کوئی ایسا ایماندار کاریگر مل جاتا، جس سے وہ بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر سکتے!

لیکن یہ بات کمال کی تھی کہ اتنے تعصب اور مذہبی جنون کے باوجود بھی ملکی رام کی انسان دوستی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ایشور کا شکر بجالاتا کہ اس کے اندر تحمل اور انسانیت کے جذبے نے دم نہیں توڑا تھا۔ وہ مذہبی امور کو اپنے کاروبار سے خلط ملط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس معاملے میں فطری طور پر بڑا رواداروا قع ہوا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ دُشمن کو اخلاق سے زیر کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے پریوار کے ساتھ اتنا ظلم وتشدد ہونے کے باوجود بھی ہنسا کا راستہ نہیں اختیار کیا۔ اس نے انسانوں کے درمیان ہندو مسلمان کی بنیاد پر کبھی تفریق نہیں کی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان کا دل توڑنا سب سے بڑا پاپ ہے۔

وہ روزانہ صبح اُٹھ کر کوڑھی فقیروں کو بھگوئے ہوئے چنے دان کیا کرتا تھا۔ پیسے کے معاملے میں وہ اصول کا پکا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بھیکاریوں کو خیرات میں پیسہ دینے سے وہ اس کی شراب پی جائیں گے۔ چنانچہ، وہ بھیکاریوں کو دان میں ہمیشہ کھانے کی چیزیں دیا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کو محنت کر کے کھانا چاہیے۔ ہٹے کٹے انسان کے لیے بھیک مانگ کر کھانا جائز نہیں۔ وہ ہمیشہ اپاہج اور کوڑھیوں کو ہی دان دیا کرتا تھا۔

ملکی رام جب سے تجارت کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا تھا، اس کی محنت اور ایمانداری کے بہت سے قصے مشہور ہو گئے تھے۔ ضرورت مند لوگ اکثر اپنے ساز وسامان اس کے یہاں گروی رکھ جاتے تھے۔ لیکن جب گروی توڑوانے آتے تو ذرہ برابر بھی امانت میں خیانت نہیں ہوتی تھی۔ اسی وصف نے ملکی رام کو عوام میں بڑا مقبول عام بنا دیا تھا۔ تیج تہوار کے موقعے پر اس کی دکانوں پر خریداروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔

اس شخص کی جب موت ہوئی تو اس کی خبر سن کے پورا شہر مغموم ہو اٹھا تھا۔ مجھے جب خبر ملی تو اپنے وطنِ مالوف سے ہزاروں میل دؤر دِلّی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں بیٹھا میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے کچھ اس طرح محسوس ہوا کہ اب غریبوں، اپاہجوں اور کوڑھیوں کی اتنی دردمندی کے ساتھ مدد کون کرے گا۔

ملکی رام کی موت کے ساتھ گویا ایک انوکھی تہذیب۔۔۔ایک ہندو مسلم یکجہتی اور انسان دوستی کے جذبے کی موت ہو چکی ہو۔ ملکی رام کی موت کی خبر کے ساتھ ہی میرے تصور میں وہ ایک مخصوص واقعہ میری نظروں کے سامنے دوبارہ زندہ ہو گیا۔

وہ واقعہ کہ جس کا میں بچپن سے چشم دید گواہ رہا تھا۔۔۔

ایک اندھا شخص جس کے تمام جسم میں جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ زلفیں اور بڑی بڑی مونچھیں براق کی طرح سفید تھیں۔ اس نے سفید لٹھے کی پٹھانی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ سامنے دؤر تک کوڑھیوں اور اپاہجوں کی لمبی قطار کھڑی تھی اور اس شخص کا ایک خدمت گار اس کا ایک ہاتھ بڑی سی پیتل کی بالٹی میں ڈالتا اور وہ اپنی مٹھی میں بھر کر بھگوئے ہوئے چنے نکالتا اور سامنے کھڑے فقیر کے المونیم کے کٹورے میں ڈال دیتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا فقیر کٹورا لے کر کھڑا ہو جاتا اور ملکی رام کا ہاتھ دوبارہ بالٹی میں چلا جاتا اور خدمت گار کی مدد سے وہ مٹھی بھر بھگوئے ہوئے چنے بھکاری کے کٹورے میں ڈال دیتا اور پھر یہ عمل نہ جانے کب تک چلتا ہی رہتا۔ ہمیں اسکول جانے میں دیر ہو رہی ہوتی تھی۔ لہٰذا، ہم بچے یہ منظر چلتے چلتے منٹ دو منٹ ٹھہر کر دیکھتے اور دل میں یہ سبق لیے آگے بڑھ جاتے کہ فقیروں کو پیسے کے بجائے کھانے کی چیزیں دان کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ بھوکوں کو پیسہ دو۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ!

آج اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی ملکی رام کا وہ واقعہ میرے ذہن سے جیسے چپک کے رہ گیا ہے۔

معاشرہ کا ہر انسان ملکی رام لاہور یہ جیسا امیر ترین انسان بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ پیسے دے کر فقیروں کے غول کے غول تیار نہ کیے جائیں۔

ملکی رام کی طرح بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور محنت کر کے انھیں کمانا سکھاؤ!

خیرات میں پیسے دے کر انھیں نکمّا نہ بناؤ!!

''گفتگو''

جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(پطرس بخاری)

خالی ہاتھ

فوزیہ ملک
(گجرات)

صبح کے دس بجے چکے تھے۔ میں حسب معمول اس وقت تک اپنے کام نمٹا چکی ہوتی۔ بچے اسکول چلے جاتے اور میاں صاحب اپنے دفتر۔ میاں اور بچوں کو رخصت کرنے بعد خود ناشتہ کرتی، اپنے کمرے کے بستر اور چادریں سیٹ کرتی، بیٹی اور بچوں کے کمرے سیٹ کرتے کرتے دس بج جاتے۔ یہ وقت تھوڑی دیر آرام کا ہوتا۔ ٹی وی پر خبریں سنتی اور ساتھ ساتھ کسی دوست سے گپ شپ بھی لگا لیتی۔

مگر آج صبح ہی سے میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں خبریں سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ سر میں بڑھتے ہوئے درد کی وجہ سے میں صوفے پر سر ٹکا کر لیٹ گئی۔ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف میری بہت عزیز دوست عظمٰی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے خاوند کی پوسٹنگ کلر کہار چھاونی میں ہو گئی ہے۔ اتنے چھوٹے اسٹیشن پر پوسٹنگ کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔

میں نے جب وادی کلر کہار کا نام سنا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرے سر کا درد ایک دم سے ختم ہو گیا ہو۔ خوشی اور سکون کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ کلر کہار سے جڑی یادوں نے میرا دل خوش کر دیا۔

کچھ دیر عظمٰی سے بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کیا اور پھر صوفے پر لیٹ گئی اور خود کلامی کرنے لگی "شدید ٹینشن، اداسی اور تنہائی۔ آخر کیوں گھیر لیتی ہیں یہ بلائیں مجھے بار بار"۔ "ایک ہفتہ بھی آرام سے نہیں گزرتا اور سر میں مسلسل درد رہتا ہے۔ سارا دن موڈ خراب رہتا ہے"۔ "ہمارا خوبصورت اور خوشیوں بھرا بچپن اور ماضی، کیوں ہماری موجودہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہے۔ بچپن کی خوبصورت یادیں، ماں باپ کے گھر میں گزری ہوئی خوبصورت زندگی جس میں محبت، توجہ، پیار اور ستائش سب کچھ ملتا ہے۔ پھر وہ زندگی کیوں بدل جاتی ہے اور سب کچھ خواب سا کیوں لگتا ہے"۔

میں اپنی زندگی میں اپنے ابو اور انکے وجود کی کمی کو شدت سے محسوس کرنے لگی۔ فوراً ایک خیال کے آتے ہی میں مطمئن ہو گئی۔

"میں ایک بار پھر کلر کہار جاؤں گی۔ میں وہ ساری جگہیں ایک بار پھر دیکھوں گی۔ جہاں ابو جی تھے، جہاں مور تھے، جہاں جھیل تھی"۔

یہ سوچ کر میں خوش ہو گئی اور جلد از جلد عظمٰی کے کلر کہار شفٹ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابو بطور SHO تھانہ کلر کہار میں تعنیات تھے۔ ہم سب بہن بھائی راولپنڈی میں امی کے ساتھ رہتے تھے۔ اسکول کی پڑھائی کی وجہ سے ہم ابو کے ساتھ ہر اسٹیشن پر نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا راولپنڈی میں مستقل طور پر رہ رہے تھے۔

ابو نئی پوسٹنگ پر بہت خوش تھے انکے بقول یہ علاقہ بہت خوبصورت اور سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں پر جھیل ہے۔ باغات ہیں، بہت پیارے مور ہیں اور تیتر بٹیر بھی۔

(ابو نے پوری فیملی کو چند دنوں کے لئے اپنے پاس کلر کہار بلوالیا)۔

راولپنڈی سے ڈیڑھ یا دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد جب ہم بڑی سڑک کو چھوڑ کر کلر کہار والی چھوٹی سڑک پر آئے تو سامنے ہی ایک بہت بڑی اور خوبصورت نیلی نیلی جھیل نے ہمارا استقبال کیا۔

جھیل کا وہ پہلا منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ میں نے اور میرے بہن بھائیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ گاڑی فوراً روکی جائے تا کہ ہم یہاں رک کر تسلی سے اس سارے منظر کو اور خوبصورت جھیل کو دیکھ سکیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ جھیل بالکل گولائی میں تھی اور اسی گولائی میں سڑک بھی اسکے کنارے کنارے بنی ہوئی تھی۔ گویا پوری جھیل کے اردگرد بذریعہ سڑک بھی ایک بڑا چکر لگایا جا سکتا تھا۔ جھیل کناروں تک پانی سے بھری ہوئی تھی اور کناروں پر سڑک کے ساتھ ساتھ سبزہ، کائی اور چھوٹے چھوٹے درخت بھی تھے۔ اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔

امی جی کے کہنے پر ہم جلد ہی دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر جھیل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کے بعد گاڑی ایک دوسری سڑک پر مڑ گئی جہاں آگے بلند و بالا پہاڑ تھے۔ گویا یہ ایک چھوٹی سی سرسبز وادی تھی جسکے تین طرف خوبصورت پہاڑ تھے۔

چلتے چلتے گاڑی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ پھر ہم ایک چاردیواری میں داخل ہو گئے جسکے باہر "تھانہ کلر کہار" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سامنے ہی والد صاحب کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم سب بہن بھائی جلدی جلدی گاڑی سے نکلے اور ابو جی سے چمٹ گئے۔ انہوں نے سب کو بہت پیار کیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "واہ ابو جی آپ اتنی خوبصورت جگہ پر رہتے ہیں"۔

کلر کہار کے مشہور لوکاٹ تو ہم پہلے بھی کھا چکے تھے۔ مگر آج لوکاٹ اپنے ہاتھوں سے توڑ کر کھانے کا مزہ ہی اور تھا۔

ابو جی کے ساتھ آج بہت دنوں بعد دوپہر کا کھانا کھایا آج تو بٹیروں کا مزہ بھی لاجواب تھا۔ (پتہ نہیں وادی کلر کہار کی خوبصورتی کا اثر تھا یا اتنے دنوں کے بعد ابو جی سے ملنے کی خوشی)۔ ہر چیز بہت اچھی لگ رہی تھی۔

شام ہوئی تو ابو کے ساتھ وہاں کے مشہور دربار پر گئے۔ امی ابو مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے اندر چلے گئے۔ ہم بہن بھائی اردگرد گھومنے لگے۔

میں نے دیکھا کہ یہ مزار ایک بلند پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ مزار

کے اطراف میں چھوٹی چھوٹی سی دیواریں بنی ہوئی تھیں تا کہ کوئی غلطی سے پہاڑ سے نیچے نہ گر جائے۔ پہاڑ کی بلندی پر سے نیچے وادی کا نظارہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ساری وادی سرسبز وشاداب تھی۔ پھولوں اور پھلوں سے بھری ہوئی۔

چلتے چلتے مزار کے پچھلے احاطے کی طرف آئی تو دیکھا دیوار سے تھوڑا نیچے باہر کی طرف ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے فوراً بہن بھائیوں کو بلایا اور ہم خوشی خوشی پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ بے تابی سے چشمے تک گئے اور پانی میں ہاتھ ڈال دیئے پانی صاف شفاف ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سب بچوں نے خوشی سے جی بھر کر وہ پانی پیا۔ ابو جی فاتحہ خوانی کے بعد باہر آئے تو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے وہ بھی نیچے چشمے کے پاس آ گئے۔ امی بھی آ گئیں تو وہ امی جی کو بتانے لگے کہ یہاں جو لوگ بھی منت مرادیں لیکر آتے ہیں وہ اس تبرک کو لیکر جاتے ہیں۔

اچانک نیچے جھاڑیوں میں دو مور پھرتے ہوئے نظر آئے۔ زندگی میں پہلی بار موروں کو اپنے سامنے دیکھ کر سب نے شور مچایا اور تالیاں بجائیں۔ وہ نیلے رنگ کے بڑے بڑے خوبصورت مور تھے۔ مور ہماری تالیوں اور شور کی آواز سن کر ڈر گئے اور بھاگتے ہوئے مزید نیچے وادی میں اترنے لگے۔ ابو نے ہمیں انکے پیچھے نہ جانے دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر واپس اوپر چڑھنے لگے۔

اب رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ابو جی نے سب کو گاڑی میں بیٹھنے کا کہا۔ ہم سب میں سے کوئی بھی واپس جانا نہیں چاہ رہا تھا مگر گاڑی میں مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

کھانا کھانے کے بعد امی جی نے بتایا کہ ہم آج ہی واپس جا رہے ہیں کیونکہ کل تم لوگوں نے اسکول جانا ہے۔ ہم بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی واپس جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب ابو جی نے یہ بتایا کہ میں بھی آپ سب کے ساتھ راولپنڈی جا رہا ہوں تا کہ آپکو رات کے سفر میں مشکل پیش نہ آئے۔ تو ابو جی کے ساتھ ہم سب واپس جانے پر راضی ہو گئے۔

ابو جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر انکے وجود سے وابستہ ایسی ہزاروں خوبصورت یادیں ہیں۔ یہ یادیں زندگی میں انکی کمی کے احساس کو اور زیادہ شدید بنا دیتی ہیں "اللہ پاک میرے ابو کی مغفرت فرما اور انکو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا کرنا۔ (آمین ثم آمین)

یہ الفاظ کہتے ہوئے میں ایک دم خیالات کی دنیا سے واپس آ گئی اور اپنے دکھی دل کو بہلانے کے لئے ٹی وی کا سوئچ آن کر دیا۔ کافی دن گزر چکے تھے۔ عظمیٰ کلر کہار شفٹ ہو چکی تھی۔ آج کافی دنوں بعد اسکا فون آیا تو اس نے بھی اس خوبصورت جگہ کی تعریف کی اور کلر کہار آنے کی دعوت دی۔ میں تو پہلے ہی منتظر تھی میں نے فوراً اسکی دعوت کو قبول کر لیا اور شام کا انتظار کرنے لگی تا کہ میاں دفتر سے گھر آئیں تو انکو کلر کہار جانے کے لئے تیار کروں۔

عظمیٰ کے میاں میجر سے کرنل پر موٹ ہو چکے تھے۔ مبارک باد دینی تو بنتی تھی۔ وہ میاں صاحب کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ لہٰذا سب نے خوشی خوشی جانے کی تیاری کی اور اگلے ویک اینڈ پر کلر کہار جانے کا پروگرام بنا لیا۔

میں اس سفر سے بہت خوش اور جذباتی ہو رہی تھی۔ آج میں تیس سال کے بعد دوبارہ اس خوبصورت وادی میں جا رہی تھی۔ جہاں نیلی جھیل تھی۔ مورتھے سفید دربار تھا۔ ابو جی کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی خوبصورت یادیں تھیں۔ آج میں ان ساری یادوں کو تازہ کرنے جا رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی تیس سال پہلے میں اپنے ابو، امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ اس جگہ کو کتنا انجوائے کیا تھا۔ آج میرے بچے اپنے امی، ابو کے ساتھ جا رہے ہیں۔ آج میں اپنے بچوں کو بچپن کی وہ ساری باتیں بتاؤں گی اور ساری یادگار چیزیں دکھاؤں گی۔

میں نے اپنا سر سیٹ کے پچھلے حصہ پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بچپن کا سارا سفر آنکھوں کے آگے پھرنے لگا اور میں اپنے بچپن میں واپس جا چکی تھی۔ گاڑی چلتی رہی، فاصلے کم ہوتے رہے اور منزل آ گئی۔ مگر میں بے خبر سو رہی تھی۔ ہائی وے سے اُتر کر جب گاڑی مڑنے لگی تو میاں کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ "بیگم اٹھ جاؤ، تمہارا کلر کہار آ گیا"۔

چند منٹوں کے بعد گاڑی نیلی جھیل والی سڑک پر آئی تو مجھے ایک دم حیرت کا جھٹکا لگا۔

یہ جھیل جو اب اپنی موجودہ شکل میں تھی یہ تیس سال پہلے والی اور شفاف جھیل نہ رہی تھی۔ پانی سے بھری ہوئی اور شفاف جھیل نہ تھی۔ جھیل کا پانی پہلے سے بہت کم ہو گیا تھا بلکہ ایک کنارے کی طرف اکھٹا ہو کر ایک بڑے اور گندے تالاب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جھیل کے کناروں پر درخت پودے اور کائی اس حد تک جمع ہو چکی تھی کہ اس نے سڑک سے نظر آنے والی ساری جھیل کو اپنے پیچھے چھپا دیا تھا۔ درخت بہت بڑے اور پرانے ہو چکے تھے اور ایک گھنے جنگل کا منظر پیش کرتے تھے۔ جن کے نظارے میں کوئی حسن اور خوبی نہ تھی۔ میرا پریشان چہرہ اور حیران نظریں وہ پرانی جھیل ڈھونڈ رہی تھیں آج میں نے نہ تو گاڑی رکوائی اور نہ ہی گاڑی سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر جھیل کا نظارہ کیا۔ گاڑی اب دوسری سڑک پر مڑ گئی جہاں آگے تھانہ کلر کہار کی حدود تھی۔ چھوٹی پہاڑی پر چڑھتا ہوا تھانے تک جانے کا راستہ اور تھانے کی بلڈنگ میں سے اب کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وقت کی دھول، نئی تعمرات اور گھنے درختوں نے ہر چیز چھپا دی تھی۔

شائد ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی مگر میں پہچان ہی نہیں پا رہی تھی۔ مجھے نہ وہ راستہ ملا اور نہ وہ بلڈنگ جہاں میرے پیارے ابو جی رہا کرتے تھے۔ مجھے اپنے ابو کی کمی کا دکھ بہت شدت سے محسوس ہوا اور میرا دل بجھ کر رہ گیا۔

پرانے راستے اور سڑکیں اب تبدیل ہو چکی تھیں۔ سفید دربار کس سڑک پر تھا، مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

گاڑی اب پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔ 8 سے 10 منٹ سفر کرنے کے بعد ہم کینٹ کی حدود میں داخل ہوئے۔ میرے دل پر اُداسی چھا چکی تھی۔ گاڑی اب عظمیٰ کے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ اسکے گھر والے استقبال کیلئے باہر موجود

تھے۔سب نے پرتپاک استقبال کیا۔ بچے اور بڑے سب ایک دوسرے سے ملکر بہت خوش ہورہے تھے۔

کھانا کھایا، پارک میں گھومے، چھوٹا سا کینٹ گھوم پھر کر دیکھا اور خوب باتیں کیں۔باتیں کرتے کرتے پتہ ہی نہ چلا، وقت بہت اچھا گزر گیا۔اب رات بہت ہوچکی تھی، میزبان اور مہمان سب ہی تھک چکے تھے لہذا جلدی سونے کیلئے چلے گئے۔

میں بستر پر لیٹی تو دن کے واقعات پھر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔میری نیند اڑ چکی تھی۔کافی دیر جاگنے کے بعد آخر میں نیند کی آغوش میں چلی گئی۔مگر رات کروٹیں بدلتے ہی گزری۔خلاف عادت صبح بہت جلد آنکھ کھل گئی شائد نماز کے ٹائم سے بھی بہت پہلے۔

میرا دل اس بند کمرے اور اندھیرے میں گھبرانے لگا۔اس بیڈروم میں ایک دروازہ باہر ٹیرس پر کھل رہا تھا۔میں اٹھی اور ٹیرس پر جا کر کھڑی ہوگئی۔باہر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی ظاہر ہورہی تھی۔سٹریٹ لائٹس بھی آن تھیں۔یہ کمرہ جہا ں میں باہر ٹیرس پر کھڑی تھی ایک گیسٹ ہاؤس تھا وہ پہاڑ کے اوپر بلندی پر تھا۔کینٹ کا رہائشی علاقہ پہاڑ سے نیچے کھلے میدان میں تھا۔اور اس بالکنی سے پورے کینٹ کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔میں بہت دیر تک کینٹ کی نظر آنے والی ہر چیز کا نظارہ کرتی رہی مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔بلکہ دل میں یہ خیال آیا کہ ''یہاں تو پورا کا پورا کینٹ ہی ان بلند پہاڑوں کی قید میں ہے''۔

میرا دل گھبرانے لگا اور میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر گیلری کی لائٹ آن کرنیکی کوشش کی۔روشنی ٹیرس اور کمرے دونوں کو روشن کررہی تھی۔میاں صاحب بھی لائٹ آن ہونے پر اُٹھ چکے تھے۔

مجھے ٹیرس میں کھڑے دیکھ کر باہر آگئے اور جاگنے کی وجہ پوچھی میں نے رات کی بے سکونی کی شکایت کی اور وضو کیلئے باتھ روم میں گھس گئی نماز فجر کے بعد ہم دونوں ٹیرس پر آ کھڑے ہوگئے۔

میں اب بھی اداس، خاموش اور پریشان تھی۔مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔میں نے اپنے میاں سے کہا "ہم آج ہی واپس چلے جائیں گے۔ناشتے کے فوراًبعد"۔

میاں نے بڑی حیرت سے میری بات سنی اور بولے " مگر تمہیں تو بہت شوق تھا اپنی دوست سے ملنے کا ،کلر کہار دیکھنے کا اور تم تو دو دن رہنا چاہتی تھی"۔میں بولی "ہاں مگر اب نہیں اب میرا دل یہاں بہت گھبرارہا ہے"۔

کل شام کو عظمیٰ اور خاور بھائی سے باتیں کرتے ہوئے انہیں پتہ چلا تھا کہ یہاں کے تیتر اور بٹیر اب ختم ہوچکے ہیں۔نایاب نسل کے نیلے مور بھی ختم ہو چکے ہیں۔مجھے ان خوبصورت جنگلی پرندوں اور جانوروں کی نسل کشی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔

میں اپنی ماضی کی حسین یادوں کو تازہ کرنے کیلئے یہاں آئی تھی مگر اب یہاں کچھ بھی موجود نہ تھا۔وقت کی دھول میں ہر چیز چھپ چکی تھی یا ختم ہوچکی تھی اب میں خالی ہاتھ واپس جارہی تھی۔میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ناشتے کے بعد واپسی کا سفر کرتے ہوئے میں بالکل خاموش تھی۔خشک اور ویران جھیل کے پاس سے گزرتے ہوئے میری بیٹی نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔وہ بہت حیران ہوکر بولی

"ماما!آپ رو کیوں رہی ہیں"۔

میرے منہ سے بے اختیار نکلا:" کچھ نہیں بیٹا۔شائد آپکے نانا ابو سے ملنے آئی تھی مگر وہ نہیں ملے"۔بیٹی کو ماں کا جواب سمجھ نہیں آیا۔وہ حیرت سے ماں کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

میرے رُکے ہوئے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے اور انکو چھپانے کے لئے اس نے اپنا منہ کھڑکی کی طرف کرلیا اور باہر دیکھنے لگی۔

ادبی ترغیبات

۱۔ میر انیس کو "حزیں" تخلص ترک کرنے اور "انیس" تخلص کرنے کی شیخ امام بخش ناسخ نے ترغیب دی۔

۲۔ میر تقی میر کو ریختہ میں شعر موزوں کرنے کی سید سعادت علی خان نے ترغیب دی۔

۳۔ مرزا غالب نے اردو مرثیہ مجتہد العصر مفتی میر عباس کے کہنے پر لکھنا شروع کیا۔

۴۔ ولی دکنی نے اردو شاعری میں فارسی امیزی سعد اللہ شاہ گلشن کے کہنے پر شروع کی۔

۵۔ بیگم اختر ریاض نے مولانا صلاح الدین کے اصرار پر اردو میں طبع آزمائی کی۔

۶۔ جوش ملیح آبادی کو نظم نگاری کی طرف وحید الدین سلیم نے موڑا۔

۷۔ احمد ندیم قاسمی کو افسانہ لکھنے کی ترغیب محمد خالد اختر نے دی۔

۸۔ شاہد احمد دہلوی کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے خاکہ نگاری کی طرف راغب کیا۔

۹۔ ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ترغیب سے کیا۔

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ کو مجید نظامی نے سفر نامہ لکھنے کی ترغیب دی۔

☆

واپسی

ڈاکٹرمحمد یحییٰ جمیل

(امراوتی)

زمین اپنے محور پر گھومتے ہوئے، وندھیا چل اور ست پڑا کے درمیانی جنگل میں،شام کا منظر پیش کررہی تھی۔اچانک کسی چیز کے تڑخنے کی آواز آئی اور پاس ہی لیٹا ہوا کتا ڈر کر بھاگا۔کچھ دور جا کر وہ پلٹا اور آواز کی سمت منھ کر کے زور زور سے بھونکنے لگا۔جنگل کے سناٹے میں کتے کی آواز چند منٹوں تک گونجتی رہی اور پھر مکمل سکوت طاری ہوگیا۔

چناوی مہم اپنے عروج پر تھی۔چار، پانچ روز بعد ووٹ ڈالے جانے تھے۔ساجد ایک سوشلسٹ نظریے کے حامی اخبار میں نامہ نگار تھا۔فسطائی طاقتیں چناؤ میں پورا زور صرف کر رہی تھیں۔ساجد، ریاست کے سیاسی وسماجی حالات کا جائزہ لیتے لیتے تھک چکا تھا۔نائب مدیر احمد کمال سے اس نے کہا،'بہت ہوا، دو روز کہیں گھوم آتا ہوں۔'

'میں بھی انسان ہوں۔' کمال بولا۔

'شادی کرنے کا ارادہ ہے؟' ساجد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا۔

کمال چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر کرسی سے ٹیک لگا کر بولا،'تم آفس سنبھالو، میں چھٹی پر جاؤں گا۔' ساجد اس بات پر بوکھلا گیا۔'ارے نہیں نہیں بھائی، تم بھی چلو بلکہ سیما کو بھی ساتھ لے لیں گے۔' اس نے کہا۔کمال کو نامہ نگار سیما سے انسیت تھی جسے محبت بہر حال نہیں کہا جا سکتا تھا،لیکن ساجد سب کچھ جانتے ہوئے بھی اکثر مذاق کرتا رہتا۔

'ہاں،اس میز کو،اس کرسی کو، بلکہ اس آفس کو بھی پیک کروا کر ساتھ لے لیتے ہیں۔' کمال بولا۔

'ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔' ساجد نے ہنس کر کہا۔

'پروگرام کیسا ہے؟' کمال نے پوچھا۔

'وہ ابھی طے نہیں ہے۔لیکن چھٹیاں...'

' بہت مشکل ہے ساجد صاحب، پھر بھی چلو، باس سے بات کرلیں۔' کمال اٹھتے ہوئے بولا اور دونوں مدیر کے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔

'یہ کوئی وقت ہے چھٹی لینے کا؟' مدیر نے جھنجلا کر کہا۔

کمال کے دماغ میں بجلی چمکی۔'سر مجھے ووٹ ڈالنے کے لیے گاؤں جانا ہی ہے،سوچتا ہوں اگر ساجد کو بھی ساتھ لے لوں تو بھیم بیٹکا کے انتخابات پر ایک اسٹوری ہوسکتی ہے۔'

'بہتر ہے۔' مدیر نے بیزاری سے سر ہلایا اور کام میں مشغول ہوگیا۔چونکہ اسٹاف بہت تھا اس لیے مدیر نے اجازت دے دی۔دونوں کیبن سے نکل گئے۔

'پھنسا دیا تم نے۔'

'بچا لیا فرزند۔'

'لیکن خوب سن لو،کام تم کرنا۔میں صرف آرام کروں گا۔' ساجد نے کہا۔

'بالکل' کمال بے نیازی سے بولا۔اسے بھیم بیٹکا کی سیر ہمیشہ مرغوب رہی تھی۔

'پروگرام کیسا ہے؟' ساجد نے پوچھا۔پھر قہقہہ لگا کر بولا،'خدا کی قدرت،' کمال مسکرانے لگا۔نغمہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

'دیکھیے مس نغمہ، دس منٹ پہلے یہ مجھ سے پوچھ رہے تھے، پروگرام کیسا ہے۔اور اب یہی بات میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ہائے ہائے، ہائے جیک کر لی میری چھٹیاں۔'

'بھوپال۔' کمال نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔'کل صبح نکلتے ہیں۔'

'میں نے شاید بھیم بیٹکا جیسا کچھ سنا تھا۔' ساجد کان کھینچ کر بولا۔

'بھوپال سے بھیرو پور، ستلا پور، سمرئی، عبید اللہ گنج اور بھیم بیٹکا۔یہ ہے پروگرام۔' کمال نے دھنوئیں کا مرغولا چھوڑا۔

ساجد اب سر کھجانے لگا۔نغمہ بے اختیار ہنس پڑی۔

دوسرے دن دونوں بھوپال پہنچے اور شام ہوتے ہوتے وہ کھڑی اور بکھری چٹانوں کے بیچ ساگوان اور سال کے درختوں سے گھرے سرسبز وشاداب علاقے میں تھے،بھیم بیٹکا میں۔ساجد نے سال کا درخت پہلی بار دیکھا تھا۔

'یہ سال کا درخت ہے،اسے سکھوا بھی کہتے ہیں۔' کمال نے بتایا، 'ہندو عقیدے کے مطابق بھگوان وشنو کو یہ پیڑ بہت عزیز ہے۔'

'تو وہ بھی آتے ہوں گے یہاں، گھومنے...' ساجد مسکرایا۔

'ہاں، کہتے ہیں آٹھ بار تو آچکے۔'

نومبر کا مہینہ تھا اور سردی کافی بڑھ چکی تھی۔قیام کے لیے کمال نے ایک بہتر ہوٹل چنا تھا۔انھوں نے رات کا کھانا کھایا اور گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

اگلے روز، کمال، حسب معمول علی الصبح بیدار ہوا اور چونکہ ساجد نے آرام کا فیصلہ کر رکھا تھا اس لیے اکیلا ہی بھیم بیٹکا کی گپھاؤں کی طرف نکل گیا۔ہر جگہ انتخابات کی دھوم تھی۔ساجد سارا دن کمرے میں کاہلی سے پڑا رہا۔وہ باری باری کبھی موبائل اور کبھی ٹی وی دیکھتا۔اس نے دوپہر کا کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا لیا۔کھانا کھانے کے بعد وہ دو تین گھنٹے سوتا رہا اور شام میں نہا دھو کر کمال کا انتظار کیے بغیر مارکیٹ گھومنے نکل پڑا۔کمال نے اخبار کے لیے مواد جمع کیا اور رپورٹ اور تصویریں اخبار کو ای میل کر دیں۔

رات میں جب وہ کھانے کی میز پر ملے تو ساجد نے پوچھا،'کیا کہتے ہیں ارباب علم، بارے ان گپھاؤں کے؟'

'نیوز رپورٹ کا نہیں پوچھو گے؟'
'وہ کیا ہوتی ہے؟' ساجد نے بڑا سا منھ کھول لیا۔ کمال نے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر بولا، 'آج زیادہ گھوم نہیں سکا، تاہم سنو، برصغیر ہند پر انسانی رہایش کے یہ اولین نقش ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ کچھ غار ہوموایریکٹس (Homo erectus) کے ہو سکتے ہیں جو تقریباً ایک لاکھ سال قبل یہاں رہے ہوں گے۔'
ساجد آنکھیں پھیلائے کمال کی باتیں سننے لگا۔
'ان غاروں میں انسانی رقص کے بھی ابتدائی ثبوت موجود ہیں۔'
'اور تصویریں؟'
'ہاں راک پینٹنگ (Rock paintings) تقریباً تیس ہزار سال پرانی ہیں۔'
'حجری عہد کی!' ساجد نے دھیرے سے کہا۔
'ہاں......لیکن غاروں میں جو تصویریں ہیں وہ کسی ایک زمانے کی نہیں ہیں۔ یہاں انسان ہزارہا سال رہتا رہا اور مختلف زمانوں میں تصویریں بناتا رہا۔ یہاں ڈاکیومینٹیڈ ہسٹری تک بڑی دلچسپ تصویریں ہیں۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ یہ راک پینٹنگز آسٹریلیا کے سوانا علاقے میں پائی جانے والی تصویروں سے اور فرانس کی آدی باسی راک پینٹنگز سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔'
'واقعی......!!'
'ان غاروں میں شکار سے کاشتکاری تک اور پھر منظم شہری بننے تک انسان کی مصوری کے نمونے ہیں۔'
ساجد کی آنکھوں میں حسرت دیکھ کر کمال بولا، 'فکر مت کرو، یہاں تقریباً ۵۰۰ مصوّر غاریں ہیں۔'
'پانچ سو......!' ساجد کا منھ کھلا رہ گیا۔
'مگر سیاحوں کے لیے صرف بارہ/۱۲ ہی غاریں کھلی ہیں۔' کمال نے اسے تسلی دی۔
'پھر مابدولت کل تشریف لے چلیں گے۔' ساجد نے گردن اونچی کر کے کہا۔
'ان غاروں کی قسمت کھل جائے گی حضور۔' کمال نے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔
چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ویٹر انھیں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساجد نے اسے اشارے سے بلایا اور اسی لہجے میں آرڈر لکھانے لگا۔ کمال اب مسکرانے لگا تھا۔
روم پر ساجد نے کیمرے کی تصویریں دیکھیں۔ یہ تصویریں سرخ، سفید، پیلے اور ہرے رنگوں سے مزین تھیں، اور ان کی آؤٹ لائن باریک برش سے بنائی گئی تھی۔ کمال نے بتایا کہ وہ ٹہنیوں کے ریشوں کو برش کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ساجد کو شاید مغل منی ایچر قسم کی تصویروں کی توقع تھی وہ کچھ مایوس ہو کر بولا، 'بھائی ایسی تصویریں تو میں بھی بنا سکتا ہوں۔ بے ڈھنگی۔' کمال زور سے ہنسا، پھر وہ دیر تک غاروں کی تصویر کشی پر گفتگو کرتا رہا۔
ساجد صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گیا۔ کمال نے بھی ضروری سامان لیا اور وہ گپھاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھومتے گھومتے انھوں نے سیاحوں سے انٹرویو بھی کر لیا۔ تقریباً چار بجے وہ ہوٹل واپس پہنچے۔ کھانا کھانے کے بعد ساجد بستر پر دراز ہو گیا اور کمال بھی صوفے پر لیٹ گیا۔
پھر ساجد کمرے کی گھنٹی بجنے پر ہی اٹھا۔ کمرہ پوری طرح تاریک تھا۔ اس نے جلدی سے لائٹ آن کیا، گھڑی میں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ دروازہ کھولا تو سامنے کمال مسکرا رہا تھا۔
'ارے......! تم سوئے نہیں تھے؟ کہاں چلے گئے تھے؟؟' ساجد نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔
'مقامی امیدواروں سے انتخابات پر بات کرنے نکل گیا تھا' کمال اپنا بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا، 'چلو کھانا کھالیں، زوروں کی بھوک لگی ہے۔'
ساجد اس کے اسٹیمنا کی داد دیتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔
آج بھیم بیٹکا میں ان کا تیسرا دن تھا۔ کمال نے ساجد سے کہا، 'کل شام میں عبید اللہ گنج کے لیے نکل چلیں گے اور...'
'اور اگلے روز ووٹ ڈال کر شہر واپس۔' ساجد نے جملہ مکمل کر دیا۔
'تمھارے گھر پہلی مرتبہ چل رہا ہوں، کمال صاحب، ڈھنگ کا کھانا کھلانا......'
چونکہ انھیں جنگل میں واقع کچھ گپھائیں دیکھنی تھیں اس لیے انھوں نے ہوٹل سے دوپہر کا کھانا پیک کروالیا اور نکل پڑے۔ کل کی طرح ساجد آج بھی پورے جوش سے کمال کے ساتھ نکلا۔ وہ جنگل میں پہنچے اور گپھاؤں کی تفصیل نوٹ کرنے لگے۔ پھر ایک پیڑ کے نیچے انھوں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ساجد ستانے کے لیے قریب ہی واقع ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لیٹ گیا۔ 'دیکھو قدرت نے ہمارے لیے ٹیلے پر سبزہ بچھا رکھا ہے۔' ساجد بولا۔ کمال خاموشی سے سگار پیتا رہا۔ ساجد نے آگے کہا، 'اور برگد کے پتے سورج کی شعاعوں سے ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔ اور چڑیاں......؟ یہاں کوئی پرندہ نہیں ہے۔' وہ چونک کر بولا۔
'ہاں، عجیب بات ہے۔ پیڑوں کے علاوہ یہاں کوئی اور متنفس نہیں ہے۔' کمال نے دھیرے سے کہا۔
ساجد نے سامنے کھڑی چٹان کو غور سے دیکھا۔ اس کا نچلا حصہ کم چوڑا اور اوپری حصہ پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اس چٹان کی طرف اشارہ کر کے کمال سے کہا، 'دیکھو یہ چٹان تنگ بنیادی کے باوجود کتنی مضبوطی سے کھڑی ہے۔'
'بنیاد گہری ہوگی۔' کمال نے اطمینان سے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد کمال بولا، 'یہ چٹان بھارت کے نقشے سے کتنی ملتی ہے نا؟'
لیکن ساجد کو نیند لگ چکی تھی۔ کمال خاموش ہو گیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گذر گیا۔

'چلو یار، کچھ تصویریں لے لیں پھر نکلتے ہیں۔' کمال نے ساجد کو دھکا دے کر کہا۔

ساجد جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، اور اس کا دھوپ کا چشمہ جو سینے پر رکھا تھا، لڑھک کر ایک طرف پھسلتا چلا گیا۔

'کیا گرا؟' اس نے پوچھا۔

'تمھارا گاگل، وہ اس طرف ہے۔' کمال نے اشارہ کیا۔

ساجد نے انگڑائی لی اور گاگل اٹھانے کے لیے جونہی جھکا اسے ایک درار نظر آئی۔ اس نے اندر جھانکا اور پھر حیرت سے کمال کی طرف پلٹ کر بولا، 'اندر کیا ہے؟'

کمال سراپا سوال بنا اسے دیکھ رہا تھا۔

'دیکھو.....' ساجد نے اشارہ کیا۔

کمال نے آگے بڑھ کر اس درار سے اندر دیکھنے کی کوشش کی تو پایا کہ وہ ایک کشادہ غار ہے اور اس کی دیوار پر ایک روشن تصویر بھی ہے۔

'یہ تو مصوّر غار ہے۔' کمال کی سانسیں تیز ہو گئیں۔

'مصوّر غار!!' ساجد حیران تھا۔

'یہ اَن نوٹسڈ غار معلوم ہوتی ہے۔' کمال نے گپھا میں بدستور جھانکتے ہوئے کہا۔ 'مگر اب تک اَن نوٹسڈ کیسے رہی؟'

'ممکن ہے یہ درار اب بنی ہو' ساجد کی بات پر کمال نے حامی بھری۔ 'چونکہ یہ برگد کے پیڑ سے قریب ہے اس لیے بایولاجیکل ویدرنگ (Biological weathering) اس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔' ساجد نے آگے کہا۔

'ہوں...... برگد کی بروہوں نے اس چٹان کو تڑخا دیا ہوگا۔' کمال بولا۔

'لیجیے، ہم نے بھیم بیٹکا میں نئی مصوّر غار کھوج لی۔' ساجد زور سے ہنسا۔

'ہزاروں سال بعد اس غار کا رشتہ دوبارہ اس دنیا سے قائم ہو رہا ہے۔' کمال بولا۔

کچھ فاصلے پر موجود ایک خارش زدہ کتا رونے لگا۔ 'لیجیے، یہ متنفس آ گیا' ساجد نے کہا اور ایک ڈھیلا مار کر اسے بھگا دیا۔

'چلو اس کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔' ساجد نے کہا۔

'زمین کے اندر ہے یہ غار، راستہ کہاں ملے گا؟' کمال بولا اور ساجد نے بھاگ چکے کتے کی سمت پھر ایک ڈھیلا اچھال دیا۔

'یوں لگتا ہے جیسے غار کو کسی نے دفن کر دیا ہو؟' ساجد نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔

'تم اپنے موبائل سے کچھ تصویریں لے لو۔ کیمرے سے تصویریں لینا مشکل ہے۔' کمال اس کے ڈرامے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ساجد نے آگے بڑھ کر اپنے موبائل فون سے تصویریں لے لیں۔ زرد سورج سال کے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔

'ہم کل دوبارہ آ جائیں گے۔' کمال نے کہا۔

'یعنی آج واپسی ملتوی۔' ساجد نے اپنے جیکٹ کی زپ کھینچ لی۔

'ظاہر ہے۔' کمال نے بھی گلے میں مفلر لپیٹ لیا۔

'پھر ووٹنگ......؟'

'دیکھتے ہیں۔' کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو ساجد نے موبائل کو لیپ ٹاپ سے جوڑا اور تصویریں ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ پھر وہ اطمینان سے تصویریں دیکھنے لگے۔ مگر وہ تصویریں اطمینان سے دیکھنے والی نہیں تھیں۔ تصویریں چونکہ درار سے لی گئی تھیں اس لیے بہت آڑی ترچھی آئی تھیں تاہم سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ یہ ایک ہی تصویر تھی لیکن بڑی مفصل اور انتہائی خوفناک۔

'عجیب تصویر ہے۔' ساجد نے کہا۔

'اگر ممکن ہوا تو ہم کل اندر اترنے کی کوشش کریں گے۔' کمال بولا۔

'ہوں......' ساجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں اپنی اپنی رضائیوں میں دبک گئے۔

دوسرے دن تقریباً نو بجے وہ اسی جگہ موجود تھے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سامان بھی لے آئے تھے، جس کی مدد سے اس گپھا کی درار کو چوڑا کرنے کا منصوبہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔

'آج انتخابات ہیں، لوگ ووٹ ڈالیں گے، خدا کرے زیادہ بارش نہ ہو۔' ساجد نے کہا اور ایک سلاخ سے درار کو چوڑا کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد تڑخی ہوئی چٹان کا ایک ٹکڑا ڈھیلا پڑا جسے دونوں نے مل کر بدقت تمام کھینچ لیا۔ کچھ مٹی اندر گر پڑی۔ بادلوں کی وجہ سے سورج کی کرنیں زمین پر نہیں پڑ رہی تھیں۔ البتہ ملگجی روشنی تو تھی ہی۔ گپھا کا نظارہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ واضح دکھائی دینے لگا۔

'اوہ یہ تو پوری طرح کھل گیا، ہم دونوں ساتھ چھلانگ لگا سکتے ہیں۔' کمال نے کہا۔

'نہیں، پہلے تم ہی اترو۔' ساجد نے کہا۔

کمال نے اندر پیر لٹکائے، ساجد نے سہارا دیا اور کمال بر وہ پکڑ کر نیچے کود گیا۔ اس کے پیچھے ساجد بھی اتر گیا۔ یہ غار تقریباً ۱۰x۱۵ کی رہی ہوگی۔ اندر پر ہول اور پر اسرار سناٹا طاری تھا۔ ساجد اور کمال کو اپنی ہی سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ غار میں عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

'شاید چوہے وغیرہ اس میں آتے جاتے ہوں گے۔' کمال نے دھیرے سے کہا اور اس کی آواز غار میں گونج گئی۔

'تصویر دیکھو' ساجد نے دھیرے سے کہا۔

کمال نے تصویر پر نظر ڈالی۔ کالی چٹان پر ایک انتہائی خوفناک انسانی چہرہ بنا ہوا تھا، اس کی آنکھیں سرخ اور دانت کسی درندے کی طرح لمبے اور نکیلے تھے۔

دانتوں کے گرد کھنچی، سرخ رنگ کی آؤٹ لائن انھیں وحشتناک بنا رہی تھی۔ جسم سانڈ کا تھا جس پر زرد رنگ سے لمبے لمبے بال بنائے گئے تھے۔ گویا یہ سنہری عفریت ہو۔ اس کے بھاری کھروں کے نیچے بے شمار انسان دبے ہوئے تھے۔ وہ سانڈ ایک آدمی کو بے رحمی سے کھا رہا تھا۔ تصویر اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ اس نصف خوردہ جسم کا سرخ خون چمکنے کی وجہ سے بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساجد کو جھرجھری آ گئی۔

'یہ عفریت شاید ریڈیم سے بنایا گیا ہے۔' ساجد نے زبردستی مذاق کیا۔ 'بہت ایڈوانس معلوم ہوتے ہیں سالے۔'

'ششش.....' اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً کمال کی نہیں تھی۔ ساجد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تو کیا یہ سانپ کی پھنکار تھی۔ وہ قدرے کمال کے نزدیک ہو گیا۔

'یہاں سانپ بھی ہو سکتے ہیں؟' ساجد نے سوال کیا۔

'غضب کی تصویر ہے۔' کمال اس کی بات پر دھیان دیے بغیر دلچسپی سے بولا۔ 'اس تصویر کے لیے انھوں نے کس طرح کے رنگ استعمال کیے ہوں گے؟'

'کچھ دیر کے لیے باہر نکلو، حبس ہو رہا ہے۔' ساجد بولا، اسے کمال کے جملے زہر لگ رہے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے دونوں جڑیں پکڑ کر اوپر نکل گئے۔ اوپر نکلتے ہوئے ساجد کو یوں محسوس ہوا جیسے اندر کوئی سایہ ڈول رہا ہو۔ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ باہر نکل کر اس نے گہری سانسیں لیں اور بوتل کھول کر پورا پانی پی گیا۔ کمال نے بھی اپنی ایک سگار کم کر لی۔ آسمان پر بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے اور روشنی بڑھنے لگی تھی۔

'اگر ہم جلد نکل جائیں تو تم ووٹ ڈال سکو گے ورنہ مشکل ہے۔' ساجد نے کہا۔

'ہاں، ہاں کوشش کرتے ہیں۔' کمال بولا۔

'چلو اب تصویریں لے لیتے ہیں۔' کمال نے کہا۔

'ہنہ، اب صرف تم اتر کر تصویر کھینچ لو۔' ساجد نے اپنے خوف کو بیزاری میں چھپانے کی کوشش کی۔ کمال اطمینان سے اندر اترا لیکن کیمرہ سنبھالتے ہی وہ چکرا گیا۔ 'یہ کیا؟' اس نے برخلاف عادت زور سے کہا۔

'کیوں کیا ہوا؟' ساجد نے تشویش سے پوچھا۔

'یہ تصویر دھندلی پڑ رہی ہے۔' وہ بولا۔

'شاید روشنی کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ باہر آ جاؤ۔' ساجد بولا۔

'ایک طریقہ ہے۔ تم اسے اوپر سے ڈھانپ دو۔ اندر اندھیرا ہو گا تو تصویر پھر نظر آئے گی۔' کمال نے کہا۔

'پاگل ہو گئے ہو، میں کہتا ہوں، باہر آ جاؤ۔' ساجد نے تقریباً چیخ کر کہا۔

'اوپر بیگ وغیرہ کچھ رکھ دو۔ کچھ نہیں ہو گا۔'

ساجد نے کسی طرح اسے ڈھانپ کر اندر اندھیرا کر دیا لیکن تصویر کا دھندلا ہونا جاری رہا۔ کمال بری طرح حیران تھا۔ کیا سورج کی معمولی شعاعوں سے اس کے رنگ اڑ رہے تھے؟ لیکن دوسری غاروں میں ہزاروں سال سے تصویریں موجود ہیں۔ کسی غار میں ایسا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصویر کیسے دھندلی پڑ رہی ہے؟

تبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ 'اف...... بارش!' ساجد چیخا۔ اس نے ہاتھوں سے سر ڈھانپا اور کسی درخت کے نیچے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے کھڑی اونچی چٹان پر پڑی۔ اس چٹان پر غار والی تصویر ابھر رہی تھی۔ ساجد بھونچکا رہ گیا۔ 'بھلا یہ کیسے ممکن ہے......؟؟'

چٹان پر تصویر واضح ہوتی چلی تھی۔

'ساجد تصویر پوری طرح غائب ہو چکی ہے۔' کمال اندر سے بولا، 'میں باہر آتا ہوں، ہاتھ دو۔' ساجد نے اس کی مدد کی اور جب کمال باہر نکل آیا تو ساجد نے کانپتے ہوئے اسے چٹان پر بنی تصویر دکھائی۔ کمال نے حیرت اور مسرت کے ساتھ اسے دیکھا اور بولا، 'گھبراؤ مت یار، یہ بارش یعنی پانی کی وجہ سے بنی ہے۔'

'مجھے بچہ سمجھتے ہو؟'

'ارے بھائی یہ ایک تکنیک ہے، لیکن ہزاروں سال پہلے بھی ہو گی......؟

'اب بس کرو پلیز۔' ساجد بولا۔

'نہیں میں مذاق نہیں کر رہا۔ بلڈانہ ضلع میں ایک مسجد ہے جس کی دیوار پر پانی ڈالنے سے قرآنی آیات دکھائی دیتی ہیں۔'

'پھر اس چٹان کے اطراف پھیلی ہری گھاس کیسے جھلس گئی؟ اب ہمیں لوٹ جانا چاہیے، پلیز۔' ساجد بیچارگی سے بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں تاحد نگاہ بادل چھا گئے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ دونوں ہوٹل کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ ساجد بالکل خاموش تھا۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ساجد کی دلجوئی کے لیے کمال نے اسی کے انداز میں کہا، 'شاید یہ بادل بجلیوں کے چابک سے زمین کی کھال کھینچ لیں گے۔' مگر ساجد نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے کانوں میں پراسرار آوازیں گونج رہی تھیں۔

ہوٹل پہنچتے تک ساجد کو تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ اسے کمرے میں لٹا کر، کمال، ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد دوا لکھ دی اور آرام کا مشورہ دیا۔ باہر تیز بارش شروع ہو گئی۔ کمال وقفے وقفے سے دن بھر ساجد سے باتیں کرتا رہا لیکن ساجد کی زبان گویا تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کمال کو اس بات پر حیرت تھی کہ بیبا کی سے حالات کا تجزیہ کرنے والا نامہ نگار اتنے کمزور اعصاب کا مالک نکلا۔

رات میں ساجد ٹھیک سے سو نہیں پا رہا تھا۔ جب بھی آنکھ لگتی وہ خود کو اسی غار میں موجود پاتا۔ پریشاں خوابی سے زچ ہو کر اس نے موبائل اٹھا لیا۔ وھاٹس ایپ چیک کیا، فیس بک دیکھا اور پھر تصویروں کا فولڈر کھول لیا۔ اس میں غار کی تصویریں تھیں۔ ساجد نے پایا کہ غار کی تصویروں سے بھی وہ عفریت غائب ہے۔ سخت سردی میں اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ کمال کو بتانے کے لیے

باقی صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ کیجیے

’’مرے گھر کا راستا‘‘

نصیر ترابی
(کراچی)

وہ بے وفا ہے تو کیا مت کہو بُرا اُس کو
کہ جو ہوا سو ہوا خوش رکھے خدا اُس کو

نظر نہ آئے تو اسکی تلاش میں رہنا
کہیں ملے تو پلٹ کر نہ دیکھنا اُس کو

وہ سادہ خُو تھا زمانے کے خم سمجھتا کیا
ہوا کے ساتھ چلا لے اڑی ہوا اُس کو

وہ اپنے بارے میں کتنا ہے خوش گماں دیکھو
جب اس کو میں بھی نہ دیکھوں تو دیکھنا اُس کو

ابھی سے جانا بھی کیا اس کی کم خیالی پر
ابھی تو اور بہت ہو گا سوچنا اُس کو

اسے یہ دُھن کہ مجھے کم سے کم اداس رکھے
مری دعا کہ خدا دے یہ حوصلہ اُس کو

پناہ ڈھونڈ رہی ہے شبِ گرفتادلاں
کوئی بتاؤ مرے گھر کا راستا اُس کو

غزل میں تذکرہ اس کا نہ کر نصیؔر کہ اب
بھلا چکا وہ تجھے تو بھی بھول جا اُس کو

○

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

طولِ احوال کو اجمال بنانے والا
شعر کہیئے کو ئی تمثال بنانے و الا

پیکرِ لفظ ہے وہ سانس جو لینے لگ جائے
لفظ کس کام کا ، اشکال بنانے والا

وقت کے ساتھ جدائی کو عجب نسبت ہے
ایک اک آن کو صد سال بنانے والا

ملکوں ملکوں ملے تلوار بنانے والے
ڈھونڈھنے پر نہ ملا ڈھال بنانے والا

آدمیت سے وہ خالی تھا بحدِّ افلاس
یہ الگ بات کہ تھا مال بنانے والا

جال خالی لئے جانے میں انا تھی حائل
پھنس گیا جال میں خود جال بنانے والا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

یہ چوٹ بہت بُری بلا ہے
زخموں میں نمک کا ذائقہ کا

کچھ اور سخن نہیں ہے کوئی
تو شاد رہے مری دعا ہے

ناری کا عجیب ہے تھرکنا
جب اُس کا مہینہ اَن گِنا ہے

اس آنکھ کے سامنے نہیں وہ
پُتلا سا اُسی کا ناچتا ہے

تاروں کی ہے چھاؤں اپنی قسمت
معمول ہمارا رت جگا ہے

حیران کریں بیان اُس کے
دیکھو تو وہ شخص پارسا ہے

اس عکس سے جاں بچاؤ ثاقبؔ
کہتے ہیں مقابل آئینہ ہے

❍

اختر شاجہاں پوری
(شاہ جہاں پور)

جنوں کو بخش کر ادراک ہم نے
اُتارا جامۂ صد چاک ہم نے

سفر تکمیل کو پہنچا نہ پھر بھی
جہاں کی چھان ڈالی خاک ہم نے

ڈراتے ہیں وہی ہم کو بھنور سے
بنایا تھا جنہیں تیراک ہم نے

اُسے بھی کر دیا مغموم آخر
سُنا کر قصۂ غمناک ہم نے

تو پھر کرتے بھی کیا اس تیرگی میں
جلا ڈالے خس و خاشاک ہم نے

نہ آیا چاند چہرے پر تغیر
اُڑائی زندگی بھر خاک ہم نے

زمیں والوں کی صحبت میں بھی اخترؔ
نظر میں بھر لیے افلاک ہم نے

❍

واصف حسین واصف
(نیویارک)

دل میں وہ صورتِ ایمان نہیں ہے شائد
اس لیے عشق کا فیضان نہیں ہے شائد

اس نے یہ سوچ کے مٹی سے بنایا تھا مجھے
خاک میں اڑنے کا ارمان نہیں ہے شائد

نشۂ عشق جو ٹوٹے تو مرے ساتھ رہے
میرا ہم زاد بھی نادان نہیں ہے شائد

ہجر اب ضبط کے معیار کو چھو ہی لے گا
سو بکھر جانے کا امکان نہیں ہے شائد

فکرِ آلام سے ہم شیشہ گری سیکھتے ہیں
شہر زادوں کو یہ عرفان نہیں ہے شائد

گفتگو کس سے کریں، کس کو صدا دی جائے
شہر میں دوستی عنوان نہیں ہے شائد

بندگی کے بھی تقاضے ہیں بہت پیچیدہ
اور خدا ہونا بھی آسان نہیں ہے شائد

اپنے آئینے میں ہر عکس کو رسوا دیکھے
ہم میں ایسا کوئی انسان نہیں ہے شائد

اب تری یاد بھی بے چین نہیں کرتی ہے
دل دکھانے کا بھی سامان نہیں ہے شائد

گھونسلے سبز درختوں پہ نظر آنے لگے
یعنی اب راستہ سنسان نہیں ہے شائد

○

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

عقیدت ہے زبانی جمع وخرچ ان خام کاروں کی
حقیقت میں حقیقت کھُل گئی بے روح نعروں کی

بنایا کوزہ گر ہی نے مٹایا کوزہ گر ہی نے
چلو مٹی ٹھکانے لگ گئی ہم خاکساروں کی

کہیں فٹ پاتھ پر ردی کے بھاؤ بکتے دیکھے ہیں
یہی تو رہ گئی ہے قدر اپنے شاہ کاروں کی

وفادارانِ اصلی کو نظر انداز کرتے ہیں
بناتے ہیں وہ جب فہرست اپنے جاں نثاروں کی

ہماری بات تیری ذات پر کیوں کھل نہیں پاتی
نہ کثرت ہے علائم کی نہ شدت استعاروں کی

زمین پاک سے ناپاک تک ظالم مسلط ہیں
دعائیں بددعائیں رد ہوئیں لاکھوں ہزاروں کی

ہمارا کام بنتا اور بگڑتا رہتا ہے اکثر
ہماری زندگانی خیر زد میں ہے اداروں کی

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ہم سے وعدہ تھا نہیں چھوڑ کے جائیں گے تمہیں
اسی وعدہ کو نبھا دو میری جانِ جاناں

تیرا کہنا تھا ''میرا دل ہے تمہارا مسکن''
کیوں ہمیں چھوڑ کے پھر چل دیئے جانِ جاناں

کیا خطا ہم سے ہوئی تھی جو تم روٹھ گئے
تم نے کچھ بھی نہ بتایا ہمیں جانِ جاناں

چھوٹی سی بات کو کیوں طول دیا ہے تم نے
یہ سمجھ میں نہیں آیا میری جانِ جاناں

وہ نگاہیں نہ ادائیں ملیں پھر سے ہم کو
تم سے جس روز ملے راہ میں جانِ جاناں

میں نے جب یاد دلائے تمہیں بیتے لمحے
اشک بہہ نکلے تھے سب یاد ہے جانِ جاناں

تیری یادوں کو اداؤں کو بھلا دیں کیسے
داستاں چھوڑ گئے پیار کی جانِ جاناں

اب تیری یادیں ہیں اور روح کی تنہائی ریاضؔ
کیوں ہمیں چھوڑ گئے راہ میں جانِ جاناں

○

پرتپال سنگھ بیتاب

(جموں، کشمیر)

خُدا تو تھا مگر جلوہ نہیں تھا
تھا طُور اب کے مگر موسیٰ نہیں تھا

یہ پتہ پتہ یُوں سہا نہیں تھا
یہ موسم کل تلک اَیسا نہیں تھا

بِالآخر وقت مجھ پر آ پڑا وہ
مرے پیچھے مرا سایہ نہیں تھا

وہی صورت نگاہوں میں تھی ہر سُو
جسے ہم نے ابھی دیکھا نہیں تھا

سفَر سے لَوٹ کر مَیں نے یہ دیکھا
مرا چہرہ مرا چہرہ نہیں تھا

جِسے کھویا اُسے کھویا تھا بیشک
جِسے پایا اُسے پایا نہیں تھا

اُسی کو پڑھتے رہتے تھے ہمیشہ
جِسے ہم نے ابھی لِکھا نہیں تھا

مَیں اپنے ساتھ تھا بیتاب ہر پل
مَیں اپنے آپ میں تنہا نہیں تھا

○

اشرف جاوید

(لاہور)

بنا دیے گئے مقتل نئے چناروں میں
لہو بہا چلا آتا ہے آبشاروں میں

تہی گلاب تھی شمشیرِ بے نیام کی شاخ
سروں کے پھول کھلانے پڑے ہزاروں میں

بلی چڑھائی گئی بے گناہ بستی کی
گنے گئے سبھی عاشق گناہ گاروں میں

نہ پیرہن ہیں سلامت، نہ جان وتن محفوظ!
عجیب خار اُگ آئے ہیں رہ گزاروں میں

ہمارا ڈوبنا دیکھا ہے اہلِ دنیا نے
کہ تنکا بھی نہ میسر ہُوا سہاروں میں

اُجاڑ ڈالے پرندوں کے ہنستے بستے گھر
اُڑائی خاک ہَواؤں نے لالہ زاروں میں

ستم گروں نے جو چاہا، وہ کر دکھایا ہے
تڑپ رہے ہیں پڑے شیر بھی کچھاروں میں

نہ جانے کس کا جنازہ اُٹھا غریبی میں!
نہ کوئی نوحہ گروں میں، نہ غم گساروں میں

اُسی کی لَو سے اُٹھے گا سحر کا سورج بھی!
نیا چراغ جلا ہے، جو خواب زاروں میں

○

عارف شفیق

(کراچی)

کیا دکھ دل میں کالی رات جو ٹھہری تھی
لیکن چہرے پر تو صبح سنہری تھی

ہوتا ہے ہر روز جہاں انصاف کا خون
ہر بستی میں ایسی ایک کچہری تھی

چل تو رہے تھے ساتھ مرے کوفے والے
لیکن ان کی فطرت میں بے مہری تھی

ڈوبتا ہے مشرق کا سورج روز جہاں
وہ بستی تو اندھی گونگی بہری تھی

جب وہ سانولا چہرہ مجھ سے بچھڑا تھا
اس دن شام کی رنگت بھی دوپہری تھی

جو سوتا تھا اس پر وہ مر جاتا تھا
محل سرا میں ایسی ایک مسہری تھی

گاؤں کے کتنے بچے اس میں ڈوب گئے
وہ ندی دریا سے زیادہ گہری تھی

کتنے معانی تیری غزل میں سمٹے تھے
دیکھنے میں تو سادہ اور اکہری تھی

رہنے کا حق چھین نہ عارف تو اس سے
تنہائی جو شہر دل کی شہری تھی

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۲۲

ٹام کی بات ابھی تک میرے حلق سے نہیں اتری تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ دیوتا مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اب تک جو جو کام کروائے تھے وہ انسانی طاقت اور فہم سے ماورا تھے۔ میں یہاں سانپوں کے علاج کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ سانپ کی کاٹ کا علاج تو کوئی بھی سپیرا کر سکتا ہے۔ میں ان غیر مرئی امور کی بات کر رہا ہوں جن کے جواب نہ میں نیتو کو پنچھی کے میلے میں دے سکا تھا اور نہ روپا کو کمبرلی کے مندر میں۔ ان واقعات نے ہی مجھے یہ باور کرایا تھا کہ کسی بھی کہانی میں میرا اپنا کوئی کردار نہیں تھا۔ میری حیثیت کسی فلم کے ڈائریکٹر کی سی ہے جو فلم میں کسی کو نظر آئے بنا اپنا کام کرتا ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کی ذمہ داری تو اداکاروں کی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس تمام روداد سے میرا تعلق بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔ جیسے سیتا رام کو مناسہ کے درشن کرانے کا یا جیسے تلک رام کو مناسہ کی خوشبو کا سبب مجھے بنایا گیا تھا اور بس۔ میرا مناسہ کی کہانی میں بھی باہر کے آدمی کا کردار تھا اور اب تک کے شواہد کے مطابق جینا، اکرام اور بابا کے ملاپ میں بھی مجھے اپنا کردار کچھ ایسا ہی سجھائی دیتا تھا۔ نہ جانے میں کب ان سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتا اگر باپو کی آواز نے مجھے واپس بھون کی اس محفل لا کر بٹھا نہ دیا ہوتا جہاں کئی گردنیں باپو کی جانب سوالیہ انداز میں گھومی ہوئی تھیں۔ باپو کہہ رہے تھے تم نے یہ کونسی پوتھی کھولنے کو کہا ہے ٹام بابو۔ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے۔ لیکن گزرے ہوئے سمے کے نقوش کسی پتھر پر لکھی ہوئی تحریر کی طرح دل و دماغ پر امر ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھی یہ سب کچھ گویا کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ٹام بابو، تمہارے سوال نے مجھے ماضی کے ایک ایسے مقام سے صدا دی ہے جہاں سے میرے جیون نے ایک عجیب موڑ کاٹا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب میں بھی باقی شمانوں کی طرح بنوں بی بی کا ڈیرہ وال تھا۔ وہ میرے سپنوں میں آتی تھی۔ دیوی مجھ پر بڑی مہربان تھی اور وہ جتنا مجھ پر زیادہ مہربان ہوتی گئی میں اتنا ہی اس کی پوجا پاٹ میں اپنے جیون کے روز و شب گزارتا تھا۔ ڈیرے میں اس کے چنیدہ شمان مجھے بڑے بابا کہتے تھے۔

یہ سردیوں کی ایک کالی اور اندھیری رات تھی۔ میں اپنی کٹیا میں آنکھیں بند کئے حسب عادت بنوں بی بی کی لو لگائے مراقبے میں بیٹھا تھا کہ اچانک میری کٹیا روشن ہو گئی۔ یہ روشنی اتنی تیز تھی کہ میری بند آنکھوں نے اس کی تیزی محسوس کی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سفید رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے ایک پیکرِ حسن میری کٹیا میں کھڑی تھی۔ اس کے سر پر رکھے ہوئے ہیروں اور جواہرات سے مرصع تاج کے نیچے کالے کالے اور لمبے بال اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ اس کے گلے میں گیندے، موتیے اور مروے کے پھولوں کی مالا تھی۔ اس کی کلائیوں میں چنبیلی کے پھولوں کا گجرا تھا۔ اس کے جسم کی خوشبو نے کٹیا کے تمام ماحول کو ایک عجیب سی سوندھی خوشبو سے معطر کر دیا تھا۔ اس کے لباس سے، اس کے بدن کے پور پور سے اور اس کی آنکھوں سے روشنی ایسے پھوٹ رہی تھی جیسے بارش کے بعد بنجر زمین سے سبزہ پھوٹتا ہے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میری جانب بڑھایا جیسے اپنا ہاتھ مجھے تھامنے کو دے رہی ہو۔ اس کے سانولے ہاتھ پر کسی ماہر آرٹسٹ نے حنا سے گلپاشی کی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا داہنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے تازہ تازہ دھنکی ہوئی روئی میرے ہاتھ پر رکھی ہو۔ پھر اس نے اپنے لال لال ہونٹوں کی پنکھڑیوں سے میرے ہاتھ کی پشت پر ایک بوسہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی باپو نے اپنے ہاتھ کی پشت دکھائی۔

باپو باتیں کر رہے تھے اور مجھے ایسے لگ رہا تھا گویا وہ مناسہ دیوی کے بارے میں بتا رہے ہوں۔ باپو کے ہاتھ کی پشت پر بالکل وہی مہر تھی جیسے مناسہ نے میرے ہاتھ کی پشت پر چھوڑی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ جس دور سے میں اب گزر رہا تھا باپو ان تمام ادوار سے مجھ سے برسوں پہلے گزر چلے تھے۔ اس لیے وہ میری بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ اس کا کم از کم مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میں نے بھی ان واقعات کو باپو کی طرح اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔ لیکن ابھی چند لمحوں میں مجھے باپو کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ باپو کو اتنا قریب سے جانتے ہوئے بھی نہیں پہچانتا تھا۔

باپو کہہ رہے تھے اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور ایک تمکنت اور توازن سے دروازے کی جانب چلنے لگی۔ دروازے کے قریب اس نے مڑ کر میری جانب ایک جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے کٹیا سے باہر نکلا۔ اتنی سردی کے باوجود میرا ماتھا پسینے سے شرابور تھا اور میرے جسم کو ایک کرتے میں بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کٹیا سے باہر نکل کر دائیں جانب ایک پگڈنڈی پر مڑی اور میں اس کے پیچھے چلا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ اس کے پاؤں زمین سے چند انچ اوپر ہوا میں معلق تھے۔ اس کے جسم سے نکلنے والی روشنی پگڈنڈی اور اس کی گزرگاہ کو منور کر رہی تھی۔ اس کی آمد سے پہلے پگڈنڈی کے راستے میں آنے والے پودے اور جھاڑیاں اپنی شاخیں سمیٹ کر اس کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ میں اس سے چند قدم پیچھے چلنے کے باوجود اس کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ ایک دو موڑ مڑنے کے بعد میں نے دیکھا کہ برگد کے ایک پرانے گرے ہوئے درخت کے اوپر مخصوص انداز میں سفید چادر کی بُکل سے اپنے چہرے اور تمام جسم کو ڈھانپے بنوں بی بی بیٹھی تھی۔ میں اپنی دیوی کو جاگتے میں اپنے روبرو دیکھ کر فرطِ عقیدت سے زمین بوس ہو گیا۔

بنوں بی بی نے مجھے مخاطب ہو کر کہا، گیانی جی اٹھو۔ میں اٹھا تو انہوں

نے مجھے یہاں لانے والی ہستی کی جانب اشارہ کرکے کہا، یہ مناسہ دیوی ہیں۔ فرطِ جذبات سے میں مناسہ کے آگے مسجود ہوگیا۔ مناسہ نے مجھے اٹھنے کو کہتے ہوئے کہا، گیانی جی، دو دیویاں آج تمہارے لیے ایک تحفہ اور امانت لائی ہیں۔ دو دیوئیوں کی موجودگی میں تو جیسے اپنا آپ کھو بیٹھا اور ان سے کہا، میری سرکار! میرے پاس بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میرے بھاگوں میری دیویاں مجھ پر مہربان ہیں۔ میرے جواب پر بنوں بی بی نے اپنی چادر کے اندر اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ایک بچے کو نکال کر میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا، یہ بچہ تمہارے لیے دیوئیوں کا ایک تحفہ بھی ہے اور امانت بھی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ بھورے گھنگریالے بالوں اور سبز آنکھوں والے دیوتاؤں کے اس تحفے کے منہ پر ابھی تک دودھ لگا تھا جیسے میرے آنے سے پہلے بنوں بی بی چادر کے نیچے اسے اپنی چھاتی کا دودھ پلاتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مناسہ دیوی نے کالی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا اور یہ ناگن اس بچے کی ماتا کا دوسرا جنم ہے اور یہ بچے کے ساتھ رہے گی۔ میں نے بچے کو چوم کر اپنے سینے سے لگایا ہی تھا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا۔ پلک جھپکتے میں دونوں دیویاں جا چکی تھیں۔ اس بچے کو اپنی کٹیا میں لاکر میں نے اپنے بستر پر لٹایا تو کالی بھی اس کے ساتھ ہی سوگئی۔ صبح تڑکے ایک جنگلی بکری نے کٹیا کے باہر آکر ممنانا شروع کردیا۔

باہر جاکر میں نے اس کا دودھ دوہا۔ ایسے میں بچہ جاگ گیا۔ میں نے اسے دودھ پلایا تو وہ ایک بار پھر سوگیا۔ اس کے باوجود کہ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، ڈیرے میں موجود سب شانوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ دو دیوئیوں نے میری کٹیا میں آکر مجھے ایک بچے کا تحفہ دیا ہے۔ اس واقعہ سے دو روز پیشتر سجنی غلی کا شان پرلوک سدھار گیا تھا اور مجھے کسی اور کو وہاں بھیجنا تھا۔ اسی دن میں نے بڑے بابا کی مسند پر آنند جی کو بٹھایا اور دو دیوئیوں کے اس تحفے کو سنبھالنے کے لیے تیار ہوگیا۔ کسی اور کو سجنی غلی بھجوانے کے بجائے میں نے خود وہاں جاکر اس بھاگوان بچے کی سیوا میں اپنا جیون تیاگنا شروع کردیا۔ اس روز سے اب تک صبح تڑکے جنگلی بکریاں یا ہرنیاں ہماری کٹیا کے سامنے آکر ہمیں اپنا دودھ دے جاتی ہیں۔ باپو نے اپنی بات ختم کی تو میں وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سب سے زیادہ گنگ تھا۔

مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ ہر صبح ہماری کٹیا کے آگے جنگلی ہرنی یا بکری دودھ دینے کے لیے کیوں آکھڑی ہوتی تھی۔ مجھے آج یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میں نے بنوں بی بی کی گود میں بھی کچھ وقت گزارا تھا۔ شاید اسی لیے افریقہ میں بنوں بی بی کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیس میں نے انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ آج مجھے باپو کے بارے میں وہ کچھ معلوم ہوا تھا جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ میں انہیں اتنا قریب سے جانتے ہوئے بھی نہیں پہچانا تھا۔ سندربن میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر بڑے بابا کی مسند ایسی ہوتی ہے جیسے کیتھلک عیسائیوں میں روم کے پوپ کی ہوتی ہے۔ آج مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ باپو نے بڑے بابا کی مسند تک میری خاطر چھوڑی تھی۔ یہ سوچ کر باپو کی شخصیت میرے لیے اور زیادہ قابلِ احترام ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ باپو کا کہا ہوا ایک ایک حرف سچا ہے۔ لیکن باپو کی یہ روداد کسی طرح بھی مجھے ارمہ کا کھویا ہوا بچہ نہیں ثابت کرتی، میں نے باپو کی روداد سننے کے بعد ٹام سے کہا۔

تمہاری بات درست ہے رامو۔ شان جی کی کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم ہی ارمہ کے بچے ہو۔ لیکن ابھی میرے پاس کچھ ثبوت ایسے ہیں جو اس بات کی تردید یا تصدیق کرسکتے ہیں، یہ کہتے ہوئے ٹام نے پتلون کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر بابا کو دکھاتے ہوئے کہا، مہاراج یہ آپ کے نواسے کی لنڈن کے محکمہ اندراج پیدائش سے نکلوائی ہوئی جیون سند (Birth Certificate) ہے۔ ٹام نے بابا کو وہ کاغذ دیتے ہوئے کہا، کیا آپ اس سند میں اپنی پوتری کے دستخط پہچانتے ہیں۔ بابا نے اپنی پوتری کے دستخط دیکھ کر چومتے ہوئے کہا، ہاں گورے بابو، یہ میری پوتری کے دستخط ہی ہیں۔ ٹام نے ان کے ہاتھ سے سند لے کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا، ہمارے ملک میں بچے کی پیدائش کے وقت ان کے پیدائشی نشان (Birth Marks) بھی اس سند پر لکھے جاتے ہیں۔

اس سند کے مطابق مہاراج کے نواسے کا نام صیام آفریدی رکھا گیا تھا۔ جس کے دو پیدائشی نشان تھے۔ ایک اس کی بائیں ہتھیلی پر اور دوسرا بالکل ویسا ہی نشان اس کی پیٹھ پر ریڑھ کی ہڈی کے اٹھارویں مہرے کے اوپر تھا۔ پھر اس نے مجھے یاد دلانے کے انداز میں پوچھا، تمہیں یاد ہے آج سے دو سال پہلے جب تمہیں کالج میں داخل کرانے کے بعد گاڑی میں بیٹھے ہوئے تم نے اور جینا نے اپنی ہتھیلی کے بیچ نشان پیدائش کی مماثلت پر حیرت کا اظہار کیا تھا؟ میں نے اپنی ہتھیلی پر مٹر کے دانے کا سرخ تل دیکھتے ہوئے کہا، جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اچھا اب تم ذرا اپنا کرتا اتارو تا کہ ہم تمہارے جسم پر دوسرے پیدائشی نشان کی موجودگی یا غیر موجودگی کی تصدیق کرلیں، ٹام نے کہا۔ میں نے نہ سمجھتے ہوئے سب کے سامنے اپنا کرتا اتارا اور ٹام نے میری پیٹھ سب کے سامنے کرتے ہوئے پیٹھ پر ریڑھ کی ہڈی پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا، میں اس نشان کی بات کررہا ہوں۔

میری دوسری جانب بیٹھے ہوئے بابا نے میری بائیں ہتھیلی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ بابا کی بائیں ہتھیلی پر بھی بالکل ویسا ہی ایک تل تھا۔ پھر انہوں نے اپنی بائیں ہتھیلی اور میری بائیں ہتھیلی پر وہ تل سب کو دکھاتے ہوئے کہا، گورے بابو یہ تل تو ہمارے پریوار کی ایک اٹوٹ پہچان ہے؟ اس کے ساتھ ہی ٹام نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی جینا کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی آگے کرتے ہوئے کہا، مہاراج یہ دونوں بچے آپ کی پوتری کی نشانیاں ہیں۔ میری لے پالک بچی جینا آپ کی نواسی اور رامو آپ کا نواسہ ہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ میں کسی صورت اس جھٹکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں جیسے بھونچال آگیا تھا۔ میرا بدن کانپنے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

بے ہوشی انسانی جسم کا ایک اندرونی خود حفاظتی ہتھیار ہے۔ جب درد کی شدت سوا ہوجاتی ہے، جب انسانی ذہن اپنی سوچ کی حدود پھلانگ کر بے

قابو ہو جاتا ہے اور جب انسانی دماغ کسی انہونی کا شکار ہوتا ہے تو بدن کا سارا نظام رک جاتا ہے جسے بے ہوشی کا نام دیا جاتا ہے۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوئی تھی۔ میرے ذہن نے پچھلے لمحوں میں غیر متوقع ہتھوڑوں کی اتنی ضربیں برداشت کی تھیں جنہوں نے میری سوچ کا سارا نظام درہم برہم کر کے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں میں نے ایک سپنا دیکھا۔ مجھے اچھی طرح علم نہیں کہ یہ واقعی کوئی سپنا تھا یا بے ہوشی کے عالم میں میرے ذہن کی بے لگام سوچوں کو لگام دینے کی جستجو تھی۔ جو کچھ بھی تھا مجھے وہ سپنا ہی لگا تھا۔ اور میں اسے سپنا ہی سمجھ کر آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

کیا دیکھتا ہوں کہ گورا اور کالی پھن پھیلائے ایک دوسرے سے پیوستہ میرے سامنے کھڑے ہیں۔ پھر دونوں رینگتے ہوئے ایک جانب چلنے لگے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں ارمہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس کے بستر پر چڑھ کر بالکل ایسے لیٹ گئے جیسے میاں بیوی ایک بستر پر ایک دوسرے کے بازو میں لیٹتے ہیں۔ ایسے میں ان کے بستر پر کالی جانب بنوں بی بی اور گورے کی جانب مناسہ دیوی نمودار ہوئیں۔ مناسہ نے گورے پر اور بنوں بی بی نے کالی پر ہاتھ رکھا تو کالی نے ارمہ اور گورے نے انعام کا روپ دھار لیا ہو۔ پھر مناسہ دیوی اور بنوں بی بی کے بیچ ارمہ اور اکرام میری جانب اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے بستر سے اٹھ کر مجھے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے تو بنوں بی بی نے مجھے مخاطب ہو کر کہا، تم اپنے ماتا پتا سے آخری بار گلے مل لو۔ ہم انہیں لینے آئے ہیں۔ میں بھی اپنے بازو ان کی جانب پھیلا کر بڑھا تو دونوں نے مجھے ایک ساتھ گلے لگا لیا۔ دونوں نے میرا ماتھا چوما اور مجھے کہا، اب ہم تمہاری جانب سے بالکل مطمئن ہیں۔ اب ہمارے چلنے کا سمے آ گیا ہے یہ کہتے ہوئے دونوں بنوں بی بی اور مناسہ دیوی کے ساتھ جیسے فضا میں تحلیل ہو گئے اور میں انہیں زور زور سے پکارنے لگا۔ میری آنکھیں کھلیں تو میں بستر پر پڑا اپنے ماتا پتا کا نام پکار رہا تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنے کمرے میں یعنی کیلاش کے کمرے میں لیٹا تھا۔ جینا میرے بستر پر بائیں جانب بیٹھی میری ہتھیلی مسل رہی تھی، نیتو میرے داہنے ہاتھ بیٹھی میرے چہرے کو گیلے تولیے سے پونچھ رہی تھی اور باقی تمام لوگ میرے بستر کو گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

میری آنکھیں کھلتے ہی سب کے چہرے جیسے کھل اٹھے۔ میں نے باپو کی جانب رخ کر کے پوچھا، گورا اور کالی کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا تو اپنا خیال رکھ رے، وہ اپنی جگہ پر ہیں۔ نہیں! مجھے بتائیں باپو وہ کہاں ہیں؟ میں نے بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ وہ الماری میں تمہارے بیگ میں ہیں۔ میں نے اٹھ کر الماری سے بیگ اٹھایا تو وہ مجھے ہلکا لگا۔ میں نے اسے کھولا تو وہ خالی تھا۔ وہ دونوں چلے گئے باپو، میرے ماتا پتا چلے گئے باپو، وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لیے میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا اور اپنی ماتا کے کمرے کی جانب بھاگا۔ سارے لوگ میرے پیچھے بھاگے۔ ماتا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور ان کا بستر بھی ویسا ہی کھلا تھا جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا اور ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر بستر خالی کر کے نکلا ہو۔ کمرے میں مناسہ کی جانی پہچانی خوشبو تھی۔ وہیں بیٹھ کر میں نے سب کو ابھی دیکھا ہوا سپنا سنایا۔

آج مجھے معلوم ہوا کہ کالی اور گورا میرے علاوہ نہ صرف ایک دوسرے سے بلکہ اکرام اور جینا سے اتنی جلدی کیوں کر مانوس ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر میں ماتا کے بستر پر ڈھیر ہو کر زور زور سے رونے لگا تو جینا نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور میں جیون میں پہلی بار اپنی ماں جائی کی بانہوں میں بہنے لگا اور وہ بھی جیسے پھٹ پڑی۔ ساتھ ہی وہاں پر موجود ہر آنکھ بہنے لگی۔ ہمارے ذہنوں کا غبار ہمارے آنسوؤں نے دھو دیا۔ میں نے اپنا سر جینا کی بانہوں سے ہٹایا تو بابا نے ہم دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ پھر اکرام کی باری آئی۔ پھر ہم ایک سے دوسرے کی بانہوں میں منتقل ہوتے رہے اور روتے رہے۔ غبار کچھ اور دُھلا تو ذہن کا مطلع صاف ہو چکا تھا اور سب کی آنکھوں میں نمی کی بجائے چمک تھی۔ اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی چمک۔

میرے خیال کے مطابق اب سمے آ گیا تھا کہ بابا سے اکرام کا تعارف کروایا جائے۔ لیکن میں نے یہ بات ٹام پر چھوڑ دی اور اسے مخاطب ہو کر کہا، اگر مناسب سمجھیں تو آپ بابا سے اکرام کا تعارف بھی کروا دیں۔ ٹام نے کہا، کیوں نہیں۔ کیوں نہیں! پھر اس نے بابا سے مخاطب ہو کر کہا، مہاراج! یہ آپ کے داماد انعام آفریدی کے چھوٹے بھائی اکرام آفریدی ہیں۔ یہ اپنے بھائی کی تلاش میں ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ بابا نے اکرام کی جانب دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا، میرے گلے لگ جاؤ بچے، پچھلے پچیس ورش سے میں اپنے داماد کو گلے لگانے کی حسرت دل میں پال رہا ہوں۔ تمہیں گلے لگا کر اپنے داماد کو گلے لگانے کی پیاس کچھ تو کم کر سکتا ہوں۔ پھر بابا نے اکرام کو گلے لگانے کے دوران کہا، کیلاش نے نہ صرف تم سے تمہارا بھائی اور بھابھی بلکہ مجھ سے میری پوتری اور میرا داماد بھی چھینا تھا۔ میرے بچے، ہم دونوں ایک ہی وحشی کے ظلم کا شکار ہیں۔ ایک ہی وحشی کے ظلم کا شکار ہیں۔ اس بار بابا نے کیلاش کو اپنا بیٹا نہیں کہا تھا۔

ہم ابھی تک ماتا جی کے کمرے میں کھڑے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے ہمیں بیٹھ جانا چاہیے۔ چلو بیٹھک میں چل کر باتیں کرتے ہیں، ٹام بولا۔ بابا بولے نہیں! بیٹھک تو ہمارے مہمانوں کے لیے ہے اور یہاں میرے پریوار کے لوگ موجود ہیں۔ چلو ہم محل خانے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ بابا کی اردلی میں ہم ماتا جی کے کمرے سے نکل کر اسی برآمدے میں دائیں جانب بڑھے۔ چند کمرے چھوڑ کر ہم ایک بڑے سے گیٹ نما دروازے سے ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تو بابا بولے، اس کمرے میں ہمارا پریوار اکٹھا ہوا کرتا تھا اور میں آج اس کمرے میں سالوں بعد داخل ہو رہا ہوں۔ رقبے کے لحاظ سے یہ کمرہ بیٹھک سے چھوٹا تھا لیکن سجاوٹ کے لحاظ سے یہ کمرہ بیٹھک سے کئی گنا بہتر تھا۔ میں بابا

کی جانب اور جینا کی دوسری جانب ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹام، باپو اور نیتو ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تو اکرام اور غفار ہمارے بائیں ہاتھ کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ مجھے غفار کا خیال آیا کہ ہم نے اسے خواہ مخواہ اتنی دیر تک اپنی باتوں میں گھسیٹا ہوا ہے۔ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا، ماموں آپ کی طبیعت خراب تھی۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی واپسی کا انتظام کرواتا ہوں۔ اس کی بجائے بابا نے جواب دیا، ابھی نہیں۔ ابھی مجھے آپ تمام سے کچھ کہنا بھی ہے اور کچھ سننا بھی ہے۔ اس لیے غفار کو ابھی یہیں رہنے دو۔

بابا نے ٹام کی جانب رخ کر کے کہا، گورے بابو، آپ نے مجھ سے میرے پیاروں کو ملانے کے لیے نہ جانے کتنے جتن کیے ہوں گے۔ میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ ٹام نے جواب دیا، مہاراج، اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو میں نے یہ سب کچھ اپنی بیٹی جینا کی خوشی کے لیے کیا ہے اور میں یہ سب کچھ نہ کرتا اگر مجھے سانپ کی کاٹ راموکے در تک نہ لے جاتی۔ پھر ٹام نے سب کو ہماری پہلی ملاقات کی روداد سناتے ہوئے میرے کانونٹ میں داخلے کے بعد جینا اور میرے ہاتھ پر تل کے نشان کی مماثلت تک بات ختم کرنے کے بعد کہنا شروع کیا کیونکہ مسز براؤن کو کیلاش سے ملنے والی معلومات کے مطابق جینا کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے کسی جانکار کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن جب میں نے راموا اور جینا کی ہتھیلی پر بالکل ایک جیسا تل دیکھا تو مجھے فطری طور پر تجسس ہوا اور میں نے جینا سے پوچھا کہ اگر اسے ہندوستان میں اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو ڈھونڈنے کی خواہش ہو تو ہم اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کر سکتے ہیں۔ جینا بھی اس مماثلت پر حیران تھی اس لیے اس نے مجھے اپنے رشتہ داروں کو کھوجنے کی اجازت دے دی۔ ہم نے سب سے پہلے جینا کی لے پالک (Adoption) کمپنی سے رابطہ قائم کر کے جینا سے متعلق باقی معلومات حاصل کیں۔

وہاں سے ہی مجھے آپ کی پوتری کی ڈائری ملی۔ یہ ڈائری لندن میں خریدی ہوئی لگتی تھی کیوں کہ اس کے تمام اندراج لندن کے تھے۔ بابا نے ٹام کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا، ہاں وہ اپنی ہندوستان والی ڈائری یہاں چھوڑ گئی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ وہ ہندوستان کے جیون کو لندن کے جیون سے جدا رکھنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی ڈائری میں کہیں بھی اپنا ہندوستان کا پتہ نہیں لکھا تھا اس کے علاوہ ایک اور بات حیران کن تھی کہ پوتری کے لندن میں پائے جانے والے کاغذات میں سے اس نے کہیں بھی خود کو راجکماری نہیں لکھا تھا، ٹام بولا۔ گورے بابو، میری پوتری بہت سادہ تھی۔ اس نے خود کو کبھی راجکماری نہیں کہلوایا تھا، بابا نے ٹام کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ آپ کی بات اس حد تک درست ہے کہ اس کی ڈائری کے اندراج کے مطابق اس نے اپنے راجکماری ہونے کی خبر انعام کو بھی شادی سے کچھ روز پہلے بتائی اور اسی اندراج کی وجہ سے مجھے اس کا راجکماری ہونا معلوم ہو سکا تھا، ٹام نے جواباً بابا کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ڈائری سے ہی مجھے ان کے بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی تو میں نے اندراجِ پیدائش کے دفتر جا کر جینا کے بھائی کی سندِ پیدائش نکلوائی تو مجھ پر عقدہ کھلا کہ میری جینا کا صرف ایک ہی بھائی تھا اور اس کے ہاتھ کے علاوہ اس کی پیٹھ پر ریڑھ کی ہڈی کے اٹھارویں مہرے کے اوپر بھی ویسا ہی نشان تھا۔

میں راموسے جن پر اسرار حالات میں ملا تھا یا مجھے کہنا چاہیے کہ صیام سے ملا تھا؟ ٹام نے میری جانب رخ کر کے پوچھا۔ میں نے جواب دیا، باپو نے مجھے رامونام دیا تھا اور میرے ماتا پتا نے میرا نام صیام رکھا تھا اس لیے مجھے یہ دونوں نام عزیز ہیں۔ آپ مجھے جس نام سے چاہیں بلا سکتے ہیں۔ ٹام نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں جن پراسرار حالات میں صیام سے ملا تھا وہ مجھے بار بار اس بات کی جانب جھکا رہے تھے کہ ہو نہ ہو یہی لڑکا جینا کا بھائی ہے۔ اگر اس کی صورت کو غور سے دیکھیں تو آپ کو اس میں انعام آفریدی کی کئی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً اس کی آنکھوں، جسم اور بالوں کی رنگت بالکل اپنے باپ پر ہیں۔ جبکہ اس کے بالوں کا گھنگریالا پن اس کی ماں کی طرف سے ہے۔ اکرام نے یہاں سے ٹام کی بات اچکتے ہوئے کہا، آپ کی بات درست ہے۔ جب میں نے صیام کو پہلی بار دیکھا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ خصوصی طور پر اس کی سبز آنکھیں اور بھورے بال۔ ہمارے خاندان میں سب کی آنکھیں سبز، کھلتا ہوا رنگ اور بھورے بال ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اس سے اس کے بارے میں کچھ ذاتی سوالات بھی کیے تھے اور اسی وجہ سے میں نے اسے اپنا ذاتی دکھ بھی بتایا تھا۔

ٹام نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ لیکن ایک بات ہمارے لیے پریشان کن تھی کہ اگر راموواقعی جینا کا بھائی ہے تو ایسے کون سے حالات تھے جنہوں نے ایک پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ کو سپیرا بننے پر مجبور کیا اور پھر اس کے والدین کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا؟ ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہم نے ایک بار پھر لے پالک کمپنی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے ہمیں مسز براؤن کے بیان کی وہ کاپی دی جو میں آپ کو پہلے دکھا چکا ہوں۔ اس بیان سے ہمیں اندازہ ہوا کہ کیلاش نے یقیناً مسز براؤن سے جھوٹ بولا تھا۔ ورنہ سچ کی صورت میں جینا کا چھوٹا بھائی بھی والدین کے ساتھ ہی بلوائیوں کا شکار ہو چکا ہوتا۔ یہ سوچ کر ہم نے یونیورسٹی کے ہسپتال سے ارمہ کے ٹخنے کی چوٹ کے وقت کے داخلے کا فارم نکلوایا۔ چونکہ یہ فارم شادی سے پہلے کا تھا اس لیے ارمہ نے اس میں اپنے باپ کا نام اور ہندوستان میں اپنے آبائی شہر کا نام لکھوایا تھا۔ یہ تمام معلومات اکٹھی کرنے میں ہمیں دو سال لگ گئے۔ اپنی تحقیق مکمل کرنے کے بعد میں نے راموسے بات کرنے کی ٹھان لی اور اسی سلسلے میں ہم آج آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔

ٹام نے سانسیں درست کرنے کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ راموآپ تمام لوگوں کو کسی نہ کسی حوالے سے جانتا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ لوگ ایک دوسرے کو

جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔ اکرام بولا، صیام سے میری ملاقات کسی طرح بھی کم پراسرار نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنی اور میری ملاقات کی کہانی سناتے ہوئے کہا، میری ماں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس نے بھی مجھے کہا تھا کہ اس لڑکے کی شکل صورت ہو بہو میرے انعام جیسی ہے۔ لیکن میں نے ان کی بات سن کر اَن سنی کر دی تھی کہ ماؤں کو ہر نوجوان میں اپنے گمشدہ بچے کی صورت نظر آتی ہے۔ میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ جس لڑکے کو محض ایک سپیرا سمجھ کر اپنے گھر لا رہا تھا وہ میرا اپنا خون اور میرا بھتیجا نکلے گا۔

اکرام کی بات کے جواب میں بابا بولے لیکن تمہارے برعکس میرا من گواہی دیتا ہے کہ اس بچے سے میرا کسی نہ کسی جنم میں کوئی نہ کوئی ناطہ ضرور تھا۔ ورنہ دیوتا اس بچے کو خواہ مخواہ میرے سر پر نہیں تھوپ رہے تھے۔ پھر بابا مجھ سے مخاطب ہو کر بولے، تمہیں اس بھون میں اپنی وہ رات یاد ہے جب تم نے کیلاش کے کمرے سے سانپ نکالا تھا اور اس کے بعد تم مجھے میرے بستر پر سلانے آئے تھے؟ جی ہاں، وہ تو چند ہفتے پہلے کی بات ہے میں نے جواب دیا۔ وہ بولے، ہاں اسی رات میں نے تمہاری ماتا کو سپنے میں دیکھا تھا۔ وہ تمہارا ہاتھ تھامے میرے پاس آئی اور تمہارا ہاتھ مجھے پکڑاتے ہوئے بولی، بابا اب یہ آپ کا خیال رکھا کرے گا۔ مجھے یقین تھا کہ میری پوتری نے کسی خاص وجہ سے ہی مجھے تمہارا ہاتھ پکڑایا تھا اور اسی وجہ سے دوسرے روز میں نے تمہیں اپنی مردانہ خاندانی انگوٹھی بھی دی تھی اور نیتو کو ہماری خاندانی زنانہ انگوٹھی بھی پہنا دی تھی۔

مجھے بابا کے سپنے پر حیرت ہوئی تو میں نے جینا سے پوچھا، کیا تمہیں بھی معلوم تھا کہ میں تمہارا بھائی ہوں؟ جینا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا، ہاں بھی اور نہیں بھی۔ ہاں اس لیے کہ ہماری تحقیق کے سارے حقائق تمہاری جانب اشارہ کر رہے تھے۔ اور نہیں اس لیے کہ کچھ مزید حقائق ابھی تک پسِ پردہ تھے اور میں تمام حقائق کی روشنی میں ہی تم پر یہ بھید کھولنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے دل کی گہرائیوں سے تمہیں اپنا بھائی تسلیم کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے میں تم سے ایک بار ایک بہن کی حیثیت سے ملی تھی اور جب نیتو کو تمہارے بارے میں مجھ پر شک ہونے لگا تو میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری ہونے والی بھابھی میرے بھائی اور میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار رہے۔ یہ کہتے ہوئے جینا نے ہاتھ بڑھا کر سامنے بیٹھی ہوئی نیتو کے گال پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ نیتو نے جواب دیتے ہوئے کہا، تم نے مجھے بالکل مطمئن کر دیا تھا۔ اگر تم راموکی بہن نہ بھی ہوتیں تب بھی میرا دل تمہاری جانب سے بالکل صاف ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے کوئی کچھ کہتا بابا نے محفل برخواست کرتے ہوئے کہا، میرا خیال ہے باقی باتوں کو کل پر چھوڑ دیں۔ پھر انہوں نے غفار سے کہا، غفار میاں اگر تم کل پھر آ سکتے ہو تو آ جانا۔ میں چاہتا ہوں تم واپس بھون میں پہلے کی طرح کام کرنا شروع کر دو۔ غفار بولا مہاراج مجھے سوچنے کا موقع دیجئے میں آپ کو چند دنوں میں بتا سکوں گا۔ اچھا ٹھیک ہے تم کلو سے کہہ دو، وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔ غفار کے جانے کے بعد بابا نے نیتو اور اکرام سے کہا، میری خواہش ہے کہ تم ٹیلی فون کر کے اپنے اپنے گھر والوں کو یہاں بلاؤ۔ میں تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ نیتو تو جیسے اس انتظار میں بیٹھی تھی۔ فوراً اچھل کر کھڑی ہو گئی اور کچھ دور میز پر پڑے ہوئے فون سے کلکتہ کے لیے ایک ٹرنک کال بک کروا دی۔ اس کے بعد اکرام نے بھی افریقہ کے لیے ایک اوورسیز کال بک کروائی۔

بابا اٹھے تو میں اور جینا دونوں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہمارے درمیان آ کر ہم دونوں کے کندھوں پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا، مجھے میرے کمرے میں لے چلو، میرے بچو۔ جینا نے اگرچہ ان کا کمرہ نہیں دیکھا تھا اس کے باوجود میری رفاقت میں انہیں سہارا دیتی ہوئی چلنے لگی۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے جسم سے چمٹا کر باری باری ہمارا ماتھا چومنا شروع کر دیا۔ جواباً ہم نے بھی ان کو پیار کرنا شروع کر دیا۔ بابا کہنے لگے تم میری آنکھوں کی روشنی ہو اور میرے دل کا قرار ہو۔ مجھے اب اپنی پوتری کے جانے کا کوئی قلق نہیں کیونکہ وہ جاتے جاتے مجھے تمہاری صورت میں دو خوبصورت تحفے دے گئی ہے۔ پھر اپنے بستر پر لیٹے ہوئے بابا جینا سے مخاطب ہو کر بولے تم اپنی ماتا کے کمرے میں رہو تو مجھے خوشی ہو گی۔ وہ بابا کا ماتھا چومتے ہوئے بولی، اچھا بابا۔ پھر انہوں نے ہمیں کہا، میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں آج کے بعد بھون میں میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ جی ہاں بابا، اس بار میں نے بابا کو جواب دیا۔ اچھا اب تم جاؤ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا، میں آپ کو سلانے کے بعد جاؤں گا۔ وہ لیٹے تو میں ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا اور جینا نے بھی میری دیکھا دیکھی یہی عمل کیا۔

مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ مغرب کی پروردہ ہونے کی وجہ سے جینا کے لیے مشرقی ماحول کی کئی روایتیں نہ صرف ناقابلِ قبول ہوں گی بلکہ ناقابلِ برداشت بھی ہوں گی۔ اپنوں اور پیاروں کی کھوج ایک تجسس کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن جب تجسس ختم ہو جاتا ہے تو حقیقت کا سامنا کرنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ جینا کا دو سالہ تجسس آج ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے اپنی جڑیں معلوم ہو گئیں تھیں اور اب حقیقت ایک کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی۔ میں نے سوچا کیا جینا لندن میں اپنا سب کچھ قربان کر کے خود کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا حوصلہ رکھتی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ میں کاہے کو سوچ رہا ہوں۔ یہ سوچنا تو جینا کا کام تھا۔ یہ سوچ کر میں نے جینا سے کہا اگر تم چاہو تو جا کر نئے کمرے میں شفٹ ہونے کے لیے چلی جاؤ، میں بابا کو سلا کر آ جاؤں گا۔ جینا جیسے اس بات کی منتظر تھی اس لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بابا کا جسم اس وقت تک دباتا رہا جب تک وہ سو نہیں گئے۔

انہیں سلانے کے بعد میں وہاں سے چل کر اپنے کمرے کی جانب جانے لگا تو راہداری کے موڑ سے نکل کر جینا میرے سامنے آ کر بولی مجھے تم سے

کچھ کہنا ہے۔ میں نے جواب دیا، چلو میرے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ہم دونوں راہداریوں سے ہوتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے تو نیتو میرے کمرے میں میری منتظر تھی۔ میں نے جینا سے پوچھا تم مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہو یا نیتو کی موجودگی میں؟ کہنے لگی میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا، اچھا تو بیٹھ جاؤ اور جو کہنا ہے کہو۔ وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی، بابا چاہتے ہیں کہ میں آج کے بعد بھون میں رہوں۔تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ نفسیات کی ایک طالبہ کی حیثیت سے تمہارا یہ سوال کسی اور کی بجائے خود سے ہونا چاہیے تھا میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔تم نے ہی یہ سب کچھ شروع کیا تھا اس وقت تم نے خود کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے ایک نیا راستہ نکلتا ہے اور ایک راہ پرانی ہے۔ نئے راستے اور پرانے راستے اپنے اپنے مسائل کے ساتھ تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ نئے راستے پر تمہارے پیارے ہیں۔جن کے دل تمہاری محبت سے لبریز ہیں۔اس محبت کے عوض شاید وہ تم سے بھی کچھ قربانیاں مانگیں گے۔ جیسے اپنی بیٹی کھونے کے بائیس برس بعد بابا کو اپنی بیٹی کی نشانیاں ملی ہیں تو ان کی یہ خواہش جائز ہے کہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں۔ پرانی راہ پر تمہارے سامنے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کسی لالچ کے بغیر تمہیں پال پوس کر تم پر اپنی ساری محبتیں نچھاور کیں۔ یہ ان کی تمہارے لیے محبتیں ہی تھیں کہ انہوں نے کھلے دل سے تمہاری خاطر ہمیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک دوسرے سے ملایا ہے۔

اگر تم ان دو راستوں میں سے کوئی ایک راہ چنو گی اور دوسری راہ سے یک لخت کنارہ کش ہو جاؤ گی تو تم سارا جیون اپنے ضمیر پر ایک بوجھ لیے پھرتی رہو گی۔ اور ہاں تمہارے لیے ایک تیسرا راستہ اعتدال ہے۔اس راستے پر چلنے کے لیے تمہیں اپنے لیے میانہ روی کا ایک ایسا راستہ چننا ہوگا جو ایک تو پہلے دونوں راستوں کو بھی تمہارے لیے کھلا رکھے گا اور دوسرا تمہارا ضمیر بھی ہر قسم کی آلائش سے پاک رہے گا۔لیکن سوچ تمہاری اپنی ہوگی۔تم اس سلسلے میں ٹام، مائیکل، بابا، اکرام اور ڈانا سے بھی بات کرو۔ اور یہ فیصلہ تمہیں ابھی اور اسی وقت نہیں کرنا۔تم خوب سوچو سب سے سوچنے کا وقت لو، اور اس مسئلے کے ہر زاویے کا بغور جائزہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے اندر اپنے لیے ایک اچھا فیصلہ کرنے کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔لیکن یہ فیصلہ تمہارا اپنا ہونا چاہیے۔ میرا، بابا کا، اکرام کا، یا ٹام کا نہیں ہونا چاہیے۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے تم میری ماں جائی ہو۔ میرے ماں باپ کی نشانی ہو۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ بخوشی قبول ہوگا۔ جینا کے چہرے پر رونق آ گئی۔ مجھے کہنے لگی، میں جس بات کو اتنا مشکل سمجھ رہی تھی تمہاری باتوں نے اسے آسان کر دیا ہے۔ میں تمہاری باتیں نہ صرف اچھی طرح سمجھ چکی ہوں بلکہ ان پر ابھی سے عمل شروع کر دیتی ہوں۔ پھر وہ کمرے سے نکلنے سے پہلے میرے اور نیتو کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولی میں جاتی ہوں۔تم اب ایک دوسرے سے باتیں کرو۔

جینا کے جانے کے بعد حیران نیتو اٹھ کر میرے قریب، جہاں کچھ دیر پہلے جینا بیٹھی تھی، آ کر بیٹھتے ہی بولی۔ یہ سب کیا ہے را۔۔۔اس نے میرا نام راموں لیتے لیتے خود کو روکا اور پھر پوچھا، اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کس نام سے پکارا کروں؟ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا، جو نام تمہیں بھلا لگے۔ میرے لیے دونوں نام اچھے ہیں۔ وہ بولی، تو اچھا اب میں تمہیں صیام کہا کروں گی۔ مجھے صیام زیادہ سندر نام لگتا ہے۔ چلو پھر تم مجھے صیام ہی کہا کرو، میری سندری۔ میری سندری کے ریمارک پر اس کے حسین اور گلابی چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔ پھر کہنے لگی، مجھے کبھی کبھار یہ سب کچھ کوئی سپنا لگتا ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ ابھی سپنا ٹوٹے گا اور میری آنکھ کھلے گی تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔تم نہیں ہوگے، تمہارا ساتھ نہیں ہوگا۔ اور کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری کہانی بھی الف لیلوی کہانیوں کی طرح کسی نئی کہانی میں ڈھل کر ادھوری رہ جائے گی۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور میں تمہاری کیا ہوں؟ تم تو میرا سب کچھ ہو، نیتو۔تم نے مجھے اس وقت چاہا جب میں ایک معمولی سپیرا تھا۔تمہارے ماتا پتا نے مجھے اس وقت اپنایا تھا جب میں ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ میں کل بھی وہی تھا جو آج ہوں اور کل بھی وہی رہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے من سے میرے بارے میں سارے ڈر نکال دو۔تم جب بھی سپنے سے اٹھو گی مجھے اپنے پاس بستر پر لیٹا پاؤ گی۔ اس بستر پر، میں نے بستر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے شرارتی فقرے پر وہ مسکراتی ہوئی بولی، تم سے باتیں کر کے تو میرے سارے ڈر دور ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے دن کچھ اور ہوتا ہے تو سارے ڈر کسی اور روپ میں واپس آ جاتے ہیں۔ جیسے کل یہاں بیٹھ کر تم نے میرے من کے سارے ڈر دور کر دئے تھے۔ میں خوش خوش جا کر سوئی کہ رامو میرا ہے۔لیکن وہ کل کی بات تھی کیونکہ کل تم رامو تھے اور رامو کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آج تم راجکمار صیام ہو گئے اور راجکمار صیام میرے لیے اجنبی ہے۔اس لیے وہ سارے ڈر ایک بار پھر واپس آ گئے ہیں۔معلوم نہیں کل تم کچھ اور ہو جاؤ گے تو میرے سارے ڈر پھر سے لوٹ آئیں گے۔

میں نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے جواب دیا، کل چاہے میں کچھ بھی ہو جاؤں ایک بات طے ہے کہ تمہارا ہوں۔تمہیں اس بارے میں نہ کوئی خوف ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی قسم کا شبہ۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے فون کر کے گھر بات کی، میں نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے پوچھا۔ اوہ ہاں۔ جیسے اسے اچانک یاد آ گیا۔ اسی لیے تو میں تمہارے کمرے میں بیٹھی تھی لیکن تمہیں دیکھ کر سب کچھ بھول گئی۔ ممی کو جب میں نے فون پر تمہارے بارے میں بتایا تو وہ بالکل حیران نہیں ہوئیں۔ کہنے لگیں رامو کے اندازِ گفتگو سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی رگوں میں کسی بڑے خاندان کا لہو گردش کر رہا ہے۔ میں نے ان سے تمہیں کھونے کا خدشہ ظاہر کیا تو وہ بولیں، تمہیں رامو کے بارے میں کسی قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے کہا تمہاری ممی تم سے زیادہ بہادر ہیں۔ کہنے لگی، لگتا تو ایسا ہے۔ لیکن معلوم نہیں اگر وہ میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟ میں نے کہا، وہی کچھ کرتیں جو تم نے کیا

ہے۔ پھر میں نے پوچھا، اچھا تو وہ کب آ رہے ہیں؟ وہ تو کل آئیں گے۔ لیکن میں انہیں یہ نہیں بتا سکی کہ بابا نے انہیں کیوں بلوایا ہے؟ وہ بولی تو میں نے اس کے بالوں کو چومتے ہوئے جواب دیا، شاید ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہ انہوں نے اپنی نیتو جیسا قیمتی ہیرا ان کے نواسے کی جھولی میں ڈالا ہے۔

اس سے پہلے کہ نیتو مجھے کچھ جواب دیتی دروازے پر دستک ہوئی تو نیتو میرے سینے سے سر اٹھا کر الگ بیٹھ گئی اور میں نے زور سے کہا، دروازہ کھلا ہے اندر آ جائیں۔ کمرے میں آنے والا اکرام تھا۔ انہیں دیکھ کر ہم دونوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ میں نے انہیں اپنے سامنے والے صوفے پر بٹھا کر پوچھا، آپ کی افریقہ بات ہوئی انکل؟ آج میں نے انہیں پہلی بار انکل کہہ کر مخاطب کیا تھا اس لیے انہیں اچھا لگا۔ بولے، ہاں میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ جب میں نے نیلم کو بتایا کہ تم حقیقتاً میرے بھتیجے اور انعام بھائی کے بیٹے ہو تو اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ میری امی نے تو تمہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی مجھے کہا تھا کہ انہیں تم میں اپنے انعام کی جھلک نظر آتی تھی اور انہیں یقین تھا کہ تمہارے اندر آفریدی خون گردش کر رہا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ اگر انعام بھائی کی نوجوانی کی کوئی تصویر ہمارے پاس ہوتی تو وہ بالکل صیام جیسا لگتا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب سے میرے والد کی پاسپورٹ والی تصویر نکال کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، دیکھو تمہاری ٹھوڑی کا ڈمپل اور تمہارے اوپر والے ہونٹ کی بائیں جانب کا تل بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔

تصویر کو غور سے دیکھا تو انکل کی بات واقعی بجا تھی۔ میرے چہرے کا تل اور ڈمپل بالکل میرے باپ جیسا تھا۔ اچھا وہ لوگ افریقہ سے کب تک پہنچ رہے ہیں؟ میں نے انکل سے پوچھا۔ وہ بولے، نیلم نے مجھے بتایا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکا وہ آنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ ہم یہاں کلکتے سے اتنی دُور کانپور میں بیٹھے ہیں اور وہ نئے ملک میں آئیں گے تو انہیں کلکتہ ایئرپورٹ سے کون ریسیو کرے گا اور پھر انہیں یہاں تک کون لائے گا۔ میری بجائے نیتو بولی، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں انکل۔ بس مجھے ان کا فلائٹ نمبر بتا دیں۔ ان کو کلکتہ ایئرپورٹ سے لے کر کانپور تک لانے کا سارا انتظام میں کروادوں گی۔ چلو میری یہ فکر تو ختم ہوئی۔ اب تم ذرا یہاں میرے قریب آ کر بیٹھو، اکرام نے نیتو کو اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔ نیتو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ کر ان کے پاس صوفے پر جا کر بیٹھی تو اکرام نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا، کل تک تم راموں کی منگیتر تھی لیکن آج تم صیام آفریدی کی منگیتر اور ہمارے خاندان کی ہونے والی بہو اور آبرو ہو۔ شکریہ انکل، نیتو نے بھی اتنا کہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور دھرمیندر ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہو کر تقریباً چلاتا ہوا بولا، جلدی چلیں سرکار، مہاراج کی حالت بہت کھراب ہو رہی ہے۔ ہم سب بھاگ کر بابا کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا تو وہ اپنے بستر پر جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔

☆

- بقیہ -

مہمان

میاں جی کے سیدھے بازو پر رکھ دیا۔'' واہ واہ کیا رنگ جما ہے۔ بہت اچھا، بہت خوب صورت میاں صاحب یہ سوٹ آپ پر خوب جچے گا بہت اچھا ہے۔''

''یہ سوٹ ایک مجھے اور ایک نذیر کو دے دو'' میاں صاحب نے دکاندار کو حکم دیا۔ ''شکریہ میاں صاحب'' جیرے نے کہا اور تھان سے کپڑا اپھاڑتے ہوئے دکاندار کو غور سے دیکھنے لگا۔

جب وہ شام گھر پہنچے تو بلقیس کے پاس تین ہزار روپے کے کپڑے تھے اس میں ایک سوٹ کا کپڑا میاں صاحب کے لیے تھا۔ ایک شال نرگس اور ایک خاصا مہنگا کمبل اختر علی کے لیے تھا۔ کچھ کپڑے استاد گاموں، سارنگی نواز اور طبلہ نواز کے لیے تھا۔ ابھی میاں نثار اور بلقیس مہمان خانے میں ٹھیک طرح سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ ''تو چھ ماہ سے لارے لپے دے رہی ہے اگر تم نے اتنے گئے گزرے نہیں ہو تو مکان خالی کر دو۔''

''بھائی ذرا آہستہ، میرا ہونے والا داماد آیا ہوا ہے۔ وہ کیا سوچے گا'' نرگس کی آواز تھی جو اُس کی منت سماجت کر رہی تھی۔ چودھری نثار نے بلقیس سے کہہ کر نرگس کو بلوایا۔ پوچھنے پر نرگس نے کہا ''کچھ نہیں بیٹے یہ مالک مکان ہے کرایہ لینے آیا ہے اسے پچھلے چھ ماہ کا کرایہ دینا ہے۔''

چودھری نثار نے جیب میں ہاتھ ڈالا ساڑھے چھ ہزار روپے باقی تھے اُس نے چھ ہزار روپے گن کر نرگس کو دے دیے اُس نے آنکھیں پونچھی اور دعائیں دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

چودھری نثار کو ایسا لگا جیسے اُس کے جسم میں ہمت باقی نہیں ہے اُس کی جیب میں اب صرف چار پانچ سو روپے تھے۔ بلب کی روشنی میں اُس نے بلقیس کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا'' میں فیصل آباد جا رہا ہوں آدھا مربع بیچ کر ایک لمبی سی کار لوں گا پھر دونوں گارڈن ٹاؤن کی سیر کریں گے'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆

مہمان

سلیم خان گمی
پنجابی ترجمہ: نوید سروش
(میر پور خاص)

فصل بہت اچھی ہوئی تھی جس کو اُس نے گوجرہ منڈی میں فروخت کیا اور پیسے جیب میں ڈال کر سیدھا لاہور آ گیا۔ وہ دو مرتبہ پہلے بھی لاہور آ چکا تھا ایک بار چودھری فرزند علی کے ساتھ گھوڑوں اور جانوروں کی نمائش دیکھنے اور دوسری بار کرم الٰہی کے ساتھ ہم دردی کے طور پر ایک قتل کے مقدمے کے سلسلے میں آیا تھا۔ دونوں مرتبہ وہ لاہور کے ہوٹلوں میں رہا تھا گانا سننے کے لیے گانے والیوں کے کوٹھوں پر گیا تھا۔ اس مرتبہ اُسے تفریحی مقامات کی سیر کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُسے گجرے بیچنے والے ایک معصوم بچے نے بلقیس کے گھر کا پتہ دیا تھا۔

اُس نے لاہور کے علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک کی طرف رخ کیا جہاں بلقیس کا گھر تھا۔ اس کے ساتھ اس کے ماں باپ، بڑا بھائی، چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن رہتی تھی۔ شام کو استاد سارنگی نواز اور طبلہ نواز موسیقی سکھانے آتے تھے۔ استاد کا مقام خاص تھا۔ سارنگی اور طبلہ نواز محترم استاد کے کہنے پر سُر چھیڑتے اور تال لگاتے تھے۔ بلقیس ہفتے میں صرف دو مرتبہ موسیقی کا علم سیکھتی تھی تا کہ اُسے تال کی شد بد ہو جائے اور ضرورت کے وقت یہی اُس کے کام آئے۔

کوٹھوں پر گجرے بیچنے والا جوان غیر نہیں تھا بلقیس کے خاندان کا خاص فرد تھا۔ بلقیس کی ماں کو اُس نے کہہ دیا تھا کہ میاں نثار کسی دن اُن کے گھر مہمان بن کر آئے گا۔ یہ بات معمولی نہیں تھی۔ گجرے بیچنے والے نے اس سے پہلے بھی ایسے مہمانوں کو راستہ دکھایا تھا۔ اس کی اطلاع بلقیس اور اُس کی ماں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوتی تھی۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے لوہے کا دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ گول تھا رنگ بالکل صاف تھا۔ سر کے بالوں میں چاندی چمک رہی تھی۔ آنکھیں گہری اور موٹی موٹی تھیں۔ ایسی گہرائی اور چمک جو انسانی نفسیات کو عرفان کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دونوں کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔

''میرا نام نثار ہے میاں نثار'' چودھری نثار نے کہا۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ لاہور میں چودھری کو میاں کہا جاتا ہے۔ لفظ ''میاں'' عزت اور قدر کے لیے مخصوص ہے۔

''میں واری میں صدقے، اندر آؤ باہر کیوں کھڑے ہو جیرے نے ہمیں بتا دیا تھا۔ نرگس نے کہا اور لوہے کے بنے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ میاں عرف چودھری نثار اندر داخل ہوا اور اُس نے اپنے آپ کو گول صحن میں کھڑا پایا۔ اس گول صحن کے ارد گرد حجروں کی طرح کمرے بنے ہوئے تھے جو گھر کے مختلف افراد کے لیے مخصوص تھے۔ ایک خاص کمرہ استاد سارنگی نواز اور طبلہ بجانے والے کے لیے تھا جہاں صرف موسیقی سکھائی جاتی تھی۔ فرش پر قالین اور پیک دان تھا۔ فرنیچر کوئی نہیں تھا۔ کمروں کے متعلق اُسے تمام واقفیت بعد میں ہوئی تھی۔ اُسے بڑے احترام کے ساتھ مہمان خانے کے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ اس کمرے میں ایک بڑا پلنگ تھا۔ دو کرسیاں اور ایک میز۔ اس کے علاوہ سنگھار میز کی ایک شیلف میں کراچی لاہور کے ڈائجسٹوں کے نئے اور پرانے شمارے تھے۔ دیواروں پر بروک شیلڈ اور دوسری ادا کاراؤں کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں کسی ادا کار کا کوئی پوسٹر نہیں تھا۔

نرگس اُسے بیٹھک میں لے کر آئی تو سامنے بیس اکیس سال کی بلقیس کھڑی تھی۔ اُس کا پورا سبز لباس مغلیہ شہزادی کی طرح تھا۔ اس نے سلام بھی مغلیہ انداز میں کیا۔ چودھری نثار نے ذرا سی دیر کے لیے اپنے آپ کو شہزادہ سلیم اور بلقیس کو انار کلی سمجھ لیا مگر یہ خیال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ نرگس بول اُٹھی۔ میری بیٹی بلقیس اس کا پہلے زرقا نام تھا پر اس نے یہ نام بدل لیا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے افسران کہتے ہیں کہ یہ نام شریف زادیوں کے نہیں ہوتے۔ اُس بازار کی لڑکیوں کے ہوتے ہیں اس لیے زرقا کا نام بلقیس رکھ دیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر گائے۔ چوری چوری کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے چودھری نثار نے کہا ''بڑا اچھا خیال ہے۔''

''کرسی پر تشریف رکھیے، دل کرے تو پلنگ پر آرام کرو۔'' نرگس بولی۔ ''ممی آپ بھی کمال کرتی ہیں بیڈ کو پلنگ کہہ رہی ہیں'' بلقیس عرف زرقا نے کہا۔ اُس کی آواز میں پیار کی مٹھاس تھی۔ چودھری نثار نے محسوس کیا کہ وہ میٹھے گنے کا رس پی رہا ہے جس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس بھی شامل ہے۔

''پتر کیا پیے گا؟ چائے، دودھ، کافی یا ٹھنڈا؟''

چودھری نثار عرف میاں نثار نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''جو تمہارا دل کرے''

''پھر بھی پتر جو کہو گے مل جائے گا'' نرگس نے پیار سے کہا۔

''چائے ٹھیک رہے گی، موسم تبدیل ہو رہا ہے اور میں نے سفر بھی کیا ہے۔''

''میں بناتی ہوں'' بلقیس دروازے کی طرف چلی تو اُس کی ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور کہا ''تو میاں صاحب کے ساتھ باتیں کر، میں اپنے بیٹے کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بناؤں گی۔'' اور وہ باہر نکل گئی۔

ماں باہر گئی اور بیٹی دوسری کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ چودھری نثار نے

اُسے دیکھا، وہی گول چہرہ، وہی گوراچٹا رنگ، وہی سیاہ لمبے بال، ستواں نرم وملائم بدن، آنکھوں میں بے حساب چمک، جس طرح ماں نے نفسیات میں ایم اے اور بیٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہو، نثار سوجان سے قربان ہوگیا۔

چودھری نثار ایک سیدھی سادی بیوی کا شوہر تھا۔ جولسّی، دودھ، مکھن اور دیسی گھی کے استعمال سے موٹی ہوگئی تھی۔ اس لیے اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ اُسے بیاہ کرلایا تھا وہ اس وقت مٹیارسی یعنی دبلی پتلی نازک سی ستواں بدن آنکھوں میں چمک، لمبے سیاہ بال، ہنستی تو گالوں کے بیچ گڑھے پڑ جاتے تھے مگر چودھری اُس کے دوستوں اور تین بچوں کی خدمت کرتے ہوئے خالص دودھ، مکھن، گھی، مرغ بریانی، حلوا، زردہ، گجریلا اور پراٹھے پکاپکا کراور کھا کھا اپنے دبلے پتلے جسم پر اُس نے چربی کی بھاری تہہ چڑھالی تھی۔

''لے پتر تو اور بلقیس چائے پیو۔ میرے بیٹے سے پوچھ لو کہ شکر کتنی لے گا'' نرگس چائے کے برتن میز پر رکھ کر ایک جملہ بلقیس اور میاں صاحب کے لیے چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ چودھری نثار کھاجانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''کتنی شکر'' بلقیس نے پوچھا۔

نثار نے کھا جانے والی نظریں بدل کر پی جانے والی نظریں بلقیس کے چہرے پر گاڑدیں اور بولا ''دو چمچے''۔ ''ہائے اللہ اتنی شکر؟''

''بھئی ہم تو گڑ کھانے والے لوگ ہیں'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اب تو سنا ہے کہ عام زمیں دار بھی شکر بنانے کے کارخانے لگا چکے ہیں۔''

''میں تو کارخانے کو کھڑا گنا بیچ دیتا ہوں ٹھیکے دار سے سودا طے کیا جیب میں پیسے ڈالے اور بے فکری''

بلقیس نے ایک ادا کے ساتھ چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھائی اور شیفون کا دوپٹہ سر سے کھسک کر کندھے پر آ گیا اُس کی ادا سے پرچ اور پیالی میں چمچہ چھنک اُٹھا۔ نثار کا جسم کانپ کر سیدھا ہوگیا اور اُس نے پیالی اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی۔

نثار نے بڑی مشکل سے ایک گھونٹ پیا ہوگا کہ ماں دروازہ کھول کے اندر آئی۔ ''پتر دوپہر کے کھانے میں کیا پسند کرے گا۔''

''جو آپ کا دل کرے'' نثار نے فرماں برداری سے کہا۔

''بریانی، پھلکے، پڈنگ، ادرک کے ساتھ سوپ، زیرے والا دہی ٹھیک رہے گا۔''

''امی جی جو دل کرے پکالو، کھانا ذرا لذیذ ہونا چاہیے یہ پہلی بار ہمارے گھر کھانا کھائیں گے۔'' بلقیس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ نرگس دروازے کی طرف گئی۔ میاں نثار نے کُرتے کی جیب میں اپنا ہاتھ ڈالا اور پانچ سو کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا ''امی جی سنو'' وہ مڑی اور نثار نے پانچ سو کا نوٹ اُن کے ہاتھ میں تھمادیا۔ وہ نوٹ لے کر باہر نکل آئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔

نثار نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بلقیس کو کھا جانے اور پی جانے والی نظروں سے گھورا ہی تھا کہ دروازہ کھول کر گھوگھی اندر آ گیا۔ یہ آٹھ نو سال کا لڑکا تھا۔ ''تجھے کیا ہوا ہے کمینہ روتا کیوں ہے؟'' بلقیس نے اُسے گود میں لے کر پیار کیا۔

''باجی ماسٹر جی نے اسکول سے بھگا دیا ہے'' گھوگھی بولا۔ اُس کی چیں چیں جاری تھی۔

''ماسٹر جی نے میرے بھائی کو کیوں بھگایا ہے۔'' اُس نے پوچھا۔

''کہتا ہے کہ تم وردی پہن کر نہیں آئے، مجھے وردی لے دو نا'' رونا بند کر کے گھوگھی بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں تجھے کہاں سے لے کر دوں۔ میں کون سی کالج کی پرنسپل ہوں'' بلقیس نے ڈانٹتے ہوئے کہا اس ڈانٹ میں پیار کم اور دکھ زیادہ تھا۔ اسی لمحے نثار نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے پانچ سو کا نوٹ گھوگھی کے ہاتھ میں تھا اور وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد نرگس چائے کے برتن لینے کمرے میں آئی تو بلقیس منہ بسورنے لگی۔

''کیا ہوا منہ کیوں بنا لیا ہے؟ میاں صاحب میرا پتر یہ منہ دیکھنے نہیں آئے ہیں۔'' ماں نے اُسے ڈانٹا۔

''ماں تجھے کہتے ہوئے سال ہوگیا ہے کہ میرے کان اور بازو خالی ہیں مگر تو نے مجھے ایک پیسے کا زیور نہیں بنوا کر دیا'' زرقا عرف بلقیس نے پُرزور احتجاج کیا۔ ''پیسے آئیں گے تو میں اپنی لاڈلی بیٹی کو سونے سے پیلا کردوں گی۔ وہ برتن اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں بلقیس اور میاں نثار گھر سے نکل کر مون مارکیٹ کی طرف چلے گئے جو نزدیک ہی تھی۔ مارکیٹ سے بلقیس کو تیس ہزار روپے کا ایک گہنوں کا سیٹ دلوایا۔ جب واپس آئے تو اُس نے سونے کا سیٹ پہنا ہوا تھا۔

مزیدار کھانا میاں نثار اور بلقیس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد بلقیس نے زیور اُتار کر سنگھار میز پر رکھ دیا۔ جب اُس کی ماں برتن لینے آئی تو وہ برتنوں کے ساتھ زیور کا ڈبا بھی لے گئی۔

''استاد آ گئے ہیں'' اُس کی ماں کی آواز دروازہ چیرتی ہوئی اندر آئی۔

''ہائے اللہ! ان سے میری جان کب چھٹے گی۔'' وہ جھلا کر بولی۔

''تو کیا تم گلوکارہ نہیں بننا چاہتیں؟'' چودھری نثار نے پوچھا۔

''چاہتی تو ہوں میں تو چاہتی ہوں کہ نور جہاں بن جاؤں، فریدہ خانم بن جاؤں اقبال بانو بن جاؤں مگر استاد لوگ محنت بہت کرواتے ہیں۔'' بلقیس نے اداس ہو کر کہا۔ ''محنت کرنی پڑتی ہے میں محنت نہ کروں تو فصل اچھی نہیں ہوگی۔'' بلقیس کرسی سے اُٹھی اور کپڑے درست کرنے لگی۔ ''مجھے ریاض کرتے نہیں دیکھو گے؟'' اُس نے نثار سے پوچھا۔

"تجھے دیکھنے تو اتنی دور سے آیا ہوں" وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں ریاض کرنے والے کمرے میں آ گئے۔ بلقیس نے ادب سے جھک کر استاد گاموں کو "آداب" کہا اور ادب سے بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے آہستہ سے کہا۔ "خیر ہو میاں صاحب کی" استاد گاموں نے بیٹھے بیٹھے اونچے سروں میں کہا۔ سارنگی نواز اور طبلہ بجانے والے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دعائیں دینے لگے۔ استاد اور سازندوں نے کورس کی صورت میں دعائیں دینی شروع کیں تو چودھری نثار نے گھبراتے ہوئے بلقیس سے پوچھا:

"کیا انہیں بھی کچھ دینا پڑے گا"

"استاد کو پانچ سو باقی کو دو دو سو"

نثار نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پانچ سو کا نوٹ اور چار سو کے نوٹ نکال کر اُنہیں اُن کی حیثیت کے مطابق دینے کے بعد کمرے سے باہر نکل کر بیٹھک میں چلا گیا۔ بیٹھک میں آنے کے بعد اُس نے بقیہ رقم گنی۔ اب اُس کے پاس دس ہزار روپے تھے۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ ائیر فریشنر کی مصنوعی خوش بُو آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگا اُسے اپنی حویلی کا خیال آیا۔ ٹریکٹر، ٹرالی، بیل، بھینس، گائیں، اوپلے، پرانی جیب گندے میلے نوکر اور بندوقیں اُٹھائے مونچھوں والے چوکیدار اور اِدھر حسن، نزاکت، ناز نخرے سلجھی ہوئی باتیں، صاف ماحول، طریقہ، سلیقہ، "سبحان اللہ" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ دروازہ بجا۔ "آ ؤ تشریف لے آ ؤ" چودھری نثار نے اپنی موٹی آواز کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اندر آ کر ایک ادھڑ عمر شخص نے بھاری آواز میں کہا "السلام علیکم"۔

"وعلیکم السلام" اُس نے جواب دیا اور سوچا۔ یہ کوئی اُٹھائی گیروں کا استاد لگتا ہے مگر اُس کے ہاتھ میں تتر کیوں ہے۔ "تم نے مجھے پہچانا نہیں میں بلقیس کا باپ ہوں اختر علی" اس نے تتر کے پروں کو الٹے ہاتھ کی ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھو!" نثار نے کہا اور اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"مجھے بلقیس کی ماں نے بتایا ہے کہ تم نے بلقیس کے لیے شاپنگ کی ہے۔ بیٹا مجھے یہ بات پسند نہیں۔ ابھی بات پکی نہیں ہوئی ہے۔ تم پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو تمہارا زیادہ خرچ نہیں ہونا چاہیے۔" اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں" اُس کے کان خالی اچھے نہیں لگ رہے تھے اور وہ چاہتی بھی تھی" نثار نے بڑے ادب سے کہا۔ "تو اُس کے کپڑے بھی ایسے نہیں تھے مگر اُسے کون سا گل برگ یا گارڈن ٹاؤن گھومنا ہے۔" اختر بولا "گل برگ یا گارڈن ٹاؤن گھومنے میں کیا حرج ہے وہاں بھی انسان ہی رہتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں۔" اختر علی جواب دیے بغیر کھڑا ہو گیا۔ "آپ تشریف رکھیں اُٹھ کیوں گئے۔" نثار نے بڑے احترام سے کہا۔

"نہیں مجھے چلنا چاہیے۔ میرا پتر گھی کھاتا ہے دیسی گھی اور دیسی گھی میں بادام پستے ملا کر کھاتا ہے اور اتفاق ہے کہ دیسی گھی بادام پستے سب ختم ہو گئے۔ میں وہ ہی لینے بازار جا رہا ہوں آپ آرام کریں" اختر علی دروازے کی طرف نہ گیا بلکہ کھڑا رہا۔ نثار خاصا عقل مند تھا بات سمجھ گیا اُس نے ایک ہزار روپے کُرتے کی جیب سے نکال کر اختر علی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"یہ تو بہت ہیں خیر کوئی بات نہیں۔ گھی اور بادام تو گھر والوں کے کام بھی آ سکتا ہے۔" اختر علی نے دروازے کی طرف منہ کیا مونچھوں کو تاؤ دیا اور تتر کو کھلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ بلقیس اندر آئی "اُف توبہ، یہ استاد" اُس نے کہا اور ایک لمبا سانس لے کر کرسی پر ڈھے گئی۔ "کیوں کیا ہوا ہے" نثار نے پوچھا۔ "وہ پھر تم سے ملنا چاہتے تھے کہتے ہیں شکریہ ادا کرنا ہے" میں نے کہہ دیا کہ وہ آرام فرما رہے ہیں۔ نثار "وہ آرام فرما رہے ہیں" یہ سن کر دل وجان سے بلقیس پر فدا ہو گیا اور پلنگ سے اُٹھ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ اُس نے بلقیس کے کپڑے دیکھے۔ اُس نے معمولی گرم کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس نے سوچا وہ چاہنے والا ہو اور چاہت کا مرکز بلقیس ہو اور اُس کے کپڑے ایسے ہوں وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اٹھ کیوں گئے" بلقیس نے معصومیت اور سادگی سے کہا۔

"چلو تمہارے لیے سوٹ خریدنے انارکلی چلتے ہیں" نثار نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

"نہیں مجھے کپڑوں کی ضرورت نہیں مجھے کون سا میلہ دیکھنے جانا ہے" وہ ایک خاص ادا سے بولی۔

"چلو اُٹھو بھی"

"نہیں میں انارکلی نہیں جاؤں گی" وہ مصنوعی ضد سے بولی۔

"بھئی میرے خرچے کا خیال مت کرو۔ اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ اُٹھو، اُٹھو میری جان" نثار نے بلقیس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی سے کرسی سے اُٹھی اور سنگھار میز سے چادر اُٹھا کر سر پر لی اور نثار کے ساتھ چل دی۔ جب وہ صدر دروازے سے نکلنے لگی تو پیچھے سے آواز آئی بیٹا میرے لیے بھی کوئی اچھی سی شال لیتے آنا۔"

وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر انارکلی گئے۔ پہلے انہوں نے بانو بازار جا کر چاٹ کھائی اور پھر کلاتھ ہاؤس آ کر کپڑا پسند کرنے لگے۔ بلقیس نے ایک سوٹ پسند کیا اُسی دوران ایک موٹا تازہ مشٹنڈا جوان اُس کے قریب آیا اور حیران ہو کر بولا "آپی تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"جیرے تو یہاں کیسے" وہ بھی اُسی طرح ہو کر بولی۔

"آپی! میں تو یہاں اپنے لیے سوٹ لینے آیا تھا"

"انہیں سلام کر میاں صاحب ہیں۔"

"جیرے نے جھک کر سلام کیا۔ نثار نے ایک ہاتھ بڑھایا اور نذیر نے دونوں ہاتھوں میں نثار کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ ملانے کے بعد انہوں نے مردانہ کپڑوں کا جائزہ لیا اور ایک تھان نکلوا کر دیکھا اور کپڑا لے کر بڑے ادب سے

باقی صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ کیجیے

محرومیِ اولاد

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

نہیں اقبال نا امید اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

موسم خزاں کے دوران زرد پتوں کو گرتے دیکھ کر جہاں فنا کا تصور ذہن پر یاسیت کا بادل تان دیتا ہے وہیں یہ امید کہ موسم بدلے گا، بہار میں نئی کونپلیں پھوٹیں گی اور ٹہنیوں پر نوخیز اور سرسبز پتے پھر جنم لیں گے، زندگی کو ایک نیا سہارا دیتی ہے۔ انسانی زندگی کے سلسلے میں بچوں کی پیدائش بھی ایک ایسا خوش کن واقعہ ہے کہ جس سے حیات کے جاوداں اور زندگی کے ازل سے ابد تک رواں دواں رہنے پر یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ بچوں کی پیدائش اور ان کا وجود نہ صرف ان کے ماں باپ بلکہ تمام ماحول کے لیے ایک ایسا مسرت آگیں تجربہ ہے جس کو صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو صاحبِ اولاد ہیں۔ اگر چہ بادی النظر میں ہر روز بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن معاشرے میں ایسے بھی لاتعداد لوگ ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

اعداد و شمار

طبی نقطہ نگاہ سے شادی کے ایک سال بعد کوششوں کے باوجود اگر ولادت کے آثار نمودار نہ ہوں تو ایسی صورت میں عام طور پر بانجھ پن کے امکانات کے بارے میں سوچنا شروع ہو جاتا ہے۔ بانجھ پن کی اس تعریف پر یہ اعتراض ہے کہ ایک سال طویل عرصہ نہیں کیونکہ اگر اسے درست مان لیا جائے تو پندرہ سے بیس فیصد جوڑے بانجھ پن کی تعریف میں آجائیں گے۔ اس اعتراض سے قطع نظر یہ بات طے ہے کہ امریکہ میں دس ملین جوڑے بے اولاد ہیں۔ اولاد سے محرومی کی وجوہات میں تیس فیصد کے ذمہ دار مرد ہیں اور ستر فیصد کی ذمہ دار عورتیں ہوتی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان وجوہات میں سے بیشتر آج کے دور میں قابلِ علاج ہیں لیکن پھر بھی ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کسی بھی حال میں صاحبِ اولاد نہیں ہو سکتے۔

تخلیق کا مختصر جائزہ

حمل کی کامیابی کے لیے عورت کی کوکھ سے ایک صحت مند انڈے کا اجراء اندرونِ شکم موجود نلکیوں کے ذریعے اس کا رحم مادر میں پہنچنا اور وہاں اس کا ایک صحت مند اور نارمل مردانہ جرثومے سے اتصال اور ان دونوں کے مرکب کا رحم کی اندرونی سطح میں نصب ہونا ضروری ہے۔ اس مرحلے کی سلسلہ وار کڑیوں میں سے کسی ایک کا ٹوٹ جانا تخلیقی عمل کی ناکامی کا سبب ہوتا ہے۔

محرومیِ اولاد کی وجوہات

اگر میاں بیوی خواہش اور کوشش کے باوجود اولاد کی نعمت سے محروم ہوں تو دونوں ہی کو طبی مشوروں اور ضروری معائنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھنی ضروری ہے کہ مردوں میں ازدواجی تعلق قائم کرنے کی صلاحیت اور باپ بننے کی صلاحیت بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ بدقسمتی سے اس غلط مفروضے نے کہ شوہر کامیابی سے ازدواجی تعلق قائم کر سکتا ہے تو اولاد نہ ہونے کی تمام تر ذمہ داری بیوی پر ہے، ہمارے معاشرے میں عورتوں پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں۔

مردوں میں اولاد کے ناقابل ہونے کی وجوہات میں مادۂ تولید کا نقص سرفہرست ہے۔ اگر مادۂ تولید میں تولیدی جرثوموں کی تعداد میں کمی یا مکمل غیر موجودگی ہو تو ایسی صورت میں بھی حمل ممکن نہیں خواہ متعلقہ مرد اپنی بیوی سے ازدواجی تعلق قائم کرنے پر پوری طرح قادر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ مرد کے مادے میں کسی طرح کے انفیکشن کی آمیزش بھی ناکامی کا سبب ہو سکتی ہے۔ اگر مادے میں جراثیم کی تعداد صحیح ہو تو بھی ان کی حرکت کرنے کی صلاحیت اور سخت جانی، ایسے عناصر ہیں جن پر حمل کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ کبھی کبھی کچھ خاص ہارمون بھی مادۂ تولید کی ساخت اور ان میں کمی بیشی پر اثر انداز ہو کر محرومیِ اولاد کا سبب ہو سکتے ہیں۔

عورتوں میں محرومیِ اولاد کے بھی بہت سے اسباب ہیں۔ حمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر ماہ باقاعدگی سے ایک انڈا جو خشخاش کے دانے کے برابر ہوتا ہے اس کی کوکھ میں موجود تھیلی سے خارج ہو کر ایک قیف نما نلکی سے نکل کر رحم تک کامیابی سے پہنچے۔ اس انڈے کے اخراج میں ناکامی (جسے انگریزی میں Anovulation کہتے ہیں محرومیِ اولاد کا اہم ترین سبب ہے۔ انڈے کا اخراج مختلف قسم کے ہارمون کے زیر اثر ہے اور اس کے لیے عام صحت کا بھی نارمل ہونا ضروری ہے۔

اگر انڈے کا اخراج نارمل ہو تو بھی قیف نما نلکی میں کوئی رکاوٹ اسے رحم تک پہنچنے سے روک سکتی ہے یا رحم کی اندرونی استرکاری اس نازک انڈے کو تباہ کر سکتی ہے اور اس کی رطوبت کی تیز ابیت مردانہ جرثومے کو انڈے تک پہنچنے سے پہلے ہلاک کر سکتی ہے۔ عورتوں کی اندرونی بیماریاں اور انفیکشن بھی حمل کی کامیابی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

محرومیِ اولاد کے اسباب کی تحقیق

آج کل ہر بڑے میڈیکل سینٹر میں پیدائش اور افزائش نسل کے خاص شعبے موجود ہیں جو اس مسئلے سے متعلق مختلف ماہرین کی ٹیم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے مردوں پر ٹیسٹ کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ نسبتاً آسان، غیر پیچیدہ اور کم قیمت ہے۔ ایک عام جسمانی معائنے کے بعد جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ متعلقہ مرد کے اعضائے رئیسہ نارمل ہیں، مرد کے مادۂ تولید کا معائنہ کیا

جا تا ہے۔جس میں تولیدی جرثوموں کی تعداد، ان کی طبعی صورت اور ہیئت اور خاص طور پر ان کی حرکت کرنے کی صلاحیت نارمل ہے یا نہیں۔اگر اس ٹیسٹ کے نتائج نارمل ہوں تو مرد کے لیے مزید کسی ٹیسٹ کی ضرورت نہیں اور محرومیٔ اولاد کے لیے وہ ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا اگر اس کے مادۂ تولید میں کوئی نقص ہو تو خصیات کی Biopsy کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک معمولی اور بے ضرر عمل ہے اور چند منٹوں میں کیا جا سکتا ہے۔

عورتوں کے ضمن میں سب سے پہلے اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ آیا ہر ماہ ان کی کوکھ سے انڈے کا اخراج ہوتا ہے یا نہیں۔نارمل حالات میں انڈے کا اخراج ایام شروع ہونے کے چودھویں دن ہوتا ہے۔ان دنوں عورت کی جسمانی حرارت ایک درجہ بڑھ جاتی ہے۔کچھ سال پہلے تک اس کے لیے صرف یہ ٹیسٹ مروج تھا کہ روزانہ کے ٹمپریچر کا چارٹ بنایا جائے لیکن اب اسے ترک کر دیا گیا ہے اور خون کے ذریعے کچھ ہارمونز کی پیمائش کی جاتی ہے اور رحم کے اندرونی سطح کی ''کھرچن'' (Scrapping) کا معائنہ کر کے یہ طے کیا جاتا ہے کہ انڈے کا اخراج ہو رہا ہے یا نہیں۔رحم کی اندرونی سطح کا نمونہ آئندہ ماہ کے ایام سے چند دن پہلے لینے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ آیا رحم کی زمین حمل کا پودا کامیابی سے نصب کرنے کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں۔رحم کی مختلف بیماریاں اس سلسلے میں منفی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

ایک اور اہم ٹیسٹ جو ازدواجی تعلق کے بعد بارہ سے سولہ گھنٹے کے اندر اندر کیا جاتا ہے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ آیا رحم کا اندرونی ماحول مردانہ جرثومے کے لیے سازگار ہے یا نہیں۔

اگر یہ تمام ٹیسٹ نارمل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈے کا اخراج معمول کے مطابق ہے، رحم کی اندرونی سطح صحت مند ہے اور اس کا ماحول اور مختلف رطوبتیں مردانہ جرثومے کے لیے بے ضرر ہیں عام حالات میں اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر اس کے باوجود بھی اولاد کے آثار پیدا نہ ہوں تو سمجھ لیجیے پیچیدہ اور مشکل ٹیسٹ کرنے پڑتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے رحم کے اندر ایک خاص قسم کا رنگ پریشر کے ساتھ ڈال کر ایکسرے کھینچے جاتے ہیں تا کہ رحم سے انڈوں کی تھیلی تک جانے والی نالیوں کی مکمل تصویر کشی کی جائے اور دیکھا جائے کہ آیا ان نالیوں میں کوئی رکاوٹ تو نہیں جو انڈے کو رحم کے اندر پہنچنے سے روک رہی ہے۔اگر یہ بھی نارمل ہو تو پیٹ میں ایک مہین اور لچکدار دوربین ڈال کر انڈوں کی تھیلیوں اور ان کے اطراف موجود اعضاء کا براہِ راست معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو بائیوپسی کے ذریعے ان کا نمونہ لیا جاتا ہے۔

پچاس فیصد جوڑوں میں مندرجہ بالا ٹیسٹ کے ذریعہ محرومیٔ اولاد کی وجوہات جانی جا سکتی ہیں اور ان کے ممکنہ علاج کی کوشش کی جا سکتی ہے مگر اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی دس سے پندرہ فیصد جوڑے ایسے ہیں جن میں محرومیٔ اولاد کا کوئی حتمی سبب معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔

محرومیٔ اولاد کا علاج

ان جوڑوں میں جن میں محرومیٔ اولاد کی وجہ شوہر کے مادۂ تولید میں جرثوموں کی تعداد میں معمولی کمی کے علاوہ اور کوئی مسئلہ نہ ہو، صرف یہ مشورہ کافی ہوتا ہے کہ ازدواجی تعلق اس وقت پیدا کیا جائے جب ''مدتِ زرخیزی'' ہوتی ہے چونکہ مردانہ جرثومہ رحم میں بہتر گھنٹے زندہ رہ سکتا ہے اور انڈے کی زندگی صرف چوبیس گھنٹے ہوتی ہے۔اس لیے مدتِ زرخیزی صرف ان بہتر گھنٹوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انڈے کے اخراج سے چوبیس گھنٹے پہلے اور چوبیس گھنٹے بعد ہوں۔یاد رہے کہ انڈے کا اخراج ایام شروع ہونے کے چودھویں دن ہوتا ہے۔

اگر مادۂ تولید کی ترسیل کرنے والی نالیوں میں رکاوٹ ہو تو مائیکرو سرجری کے ذریعہ اس کا علاج کیا جا سکتا ہے۔جرثوموں کی کمی اور ان کی حرکت کرنے کی صلاحیت کے مسائل کے لیے ہارمونز کے انجکشن بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے مردوں میں عام وجہ جرثوموں کی مکمل غیر موجودگی (Azoospermia) ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

عورتوں میں اگر انڈے کا اخراج نہ ہوتا ہو تو اس کا علاج بھی دواؤں اور انجکشن سے ممکن ہے۔تولیدی راستوں اور اعضاء میں رکاوٹ سرجری سے دور کی جا سکتی ہے۔آخری حالت میں مصنوعی طریقے سے انڈے کی زرخیزی کی جاتی ہے۔دو دن کے بعد اسے رحم میں نصب کیا جاتا ہے تا کہ ولادت کے آثار ہو سکیں اس عمل کو IN VITRO FERTILIZATION کہا جاتا ہے۔ایسی حالت میں رحم کا نارمل ہونا ضروری ہے۔مختصر یہ کہ آج کے دور میں محرومیٔ اولاد کے علاج کے بہت سے طریقے موجود ہیں اس لیے اولاد سے محروم جوڑوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے اور پوری کوشش کرنی چاہیے کیونکہ کامیابی کے امکانات مفقود نہیں۔

شیطان

ایک بار جوش ملیح آبادی الٰہ آباد یونیورسٹی گئے۔اس تقریب میں جوش کے علاوہ فراق بھی موجود تھے۔جوش نے اپنی طویل نظم ''حرفِ آخر'' کا ایک اقتباس پڑھا۔اس میں تخلیقِ کائنات کی ابتداء میں شیطان کی زبانی کچھ شعر ہیں۔ جوش شیطان کے اقوال پر مشتمل کچھ اشعار سنانے والے تھے کہ فراق نے سامعین سے کہا: ''سنئے حضرات، شیطان کیا بولتا ہے؟'' اور پھر جوش کو بولنے کا ارشارہ کیا۔

☆

''دشمنِ جاں''

جہانگیراشرف
(برمنگھم)

مجھے آزمانے کا فائدہ ہی کیا ہے ۔۔۔ نہ میں پارسا ہوں نہ تو اپسرا ہے
پاس رہ کے بھی جو مجھ سے جدا ہے ۔۔۔ کوءاُس سے پوچھے یہ کیسی سزا ہے
کھائی قسم نہ کوئی عہدِ وفا ہے ۔۔۔ دو قدم تو چلو ابھی ابتداء ہے
اچھا ہے کون اور کون بُرا ہے ۔۔۔ تو نے جیسے جس کو چُنا ہے
دل وجاں کو درپیش عجب معاملہ ہے ۔۔۔ جو دشمنِ جاں ہے وہی دلربا ہے
معطر معطر سی ساری فضا ہے ۔۔۔ لگتا ہے یہاں سے ابھی وہ گیا ہے
تجھ سا کہاں کوئی تیرے سوا ہے ۔۔۔ تیرے بن دُنیا میں رکھا ہی کیا ہے
یاس میں اگر دل ڈوبا ہوا ہے ۔۔۔ سرِ بام جلا کر کیوں رکھا دیا ہے
اُسے تو نے جہانگیر بھولا جو دیا ہے ۔۔۔ لبوں پہ تیرے اب کیوں دُعا ہے

○

زیباسعید
(کراچی)

دنیا کی نگاہوں سے ہے پوشیدہ حقیقت ۔۔۔ اندر سے بہت چُور رہوں باہر سے سلامت
احساس کی دنیا میں بپا حشر ہے لیکن ۔۔۔ اور سارا جہاں مجھ کو سمجھتا ہے قیامت
یوں عام نہیں جذبۂ ایثار جہاں میں ۔۔۔ کھلتے نہیں ہر شخص پہ اسرارِ محبت
کترا کے گزر جاتے ہیں جو راحتِ جاں تھے ۔۔۔ مخدوش بہت ہے مری ہستی کی عمارت
رنجور ہوں، مہجور ہوں، دل گیر ہوں زیبؔا ۔۔۔ دیکھی نہیں جاتی ہے زمانے کی یہ حالت

○

وشال کھُلر
(لدھیانہ)

دل کی دھڑکن سُنی نہیں ہے کیا ۔۔۔ بات تیری ہوئی نہیں ہے کیا
بزمِ جاناں ہی بزمِ جاناں ہے! ۔۔۔ شے میں کوئی کمی نہیں ہے کیا
درمیاں دیکھئے سخن ور کو ۔۔۔ درہمی برہمی نہیں ہے کیا
تیرے مستوں نے چال چل دی ہے ۔۔۔ لاحقہ لاحقی نہیں ہے کیا
جانے کس سمت ہو لیا کھُلؔر ۔۔۔ تھا جو دائم ابھی نہیں ہے کیا

○

سحرتاب رومانی
(کراچی)

اگرچہ کچھ نہیں امکان میں تھا
مگر میں اپنے پاکستان میں تھا
اُسی جانب ہوا تھا میں روانہ
جہاں کچھ فائدہ نقصان میں تھا
یہی صورت فقط اِک بچ رہی تھی
مرا ہونا مرے فقدان میں تھا
وہی سب جو نہیں تھا پاس میرے
وہی سب کچھ مرے سامان میں تھا
مسافر چلتے چلتے رُک گئے ہیں
نجانے ایسا کیا اعلان میں تھا
بلا کی تیرگی تھی راستوں میں
مگر وہ ایک چہرہ دھیان میں تھا
سحرؔ وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی
رکھا اِک پھول آتش دان میں تھا

○

نبیل احمد نبیل
(لاہور)

تیری فُرقت کے لمحے گِن گِن کے
درد سہتے رہے ہیں ہر دن کے
اب تو آنکھیں ہیں خشک صحرا سی
اب وہ موسم کہاں ہیں رِکن مِن کے
حال احوال تک نہیں پُوچھا
منتظر ہم رہے سدا جن کے
اہمیت اِس قدر ہے بس اپنی
جیسے ہوتے ہیں راہ کے تنکے
وہ جو ناواقفِ محبت ہیں
ہو گئے ہیں وہ دیکھیے کِن کے
کن پہ اُٹھتی ہے بار بار نظر
آپ ہونے لگے ہیں اب کِن کے
ایسا بارود ہے فضاؤں میں
وقت بھی اپنے ماتھے کو ٹھنکے
جب اُنھیں تھوڑا اختیار ملا
ہم سے بدلے لیے ہیں گِن گِن کے
تیر ، تلوار کی طرح دیکھے
ناز نخرے نبیل، کم سِن کے

○

پرویز مظفر
(برمنگھم)

ایک اک مسجد، سارے مندر ہر گردوارا ڈوب گیا
بجلی گھر کا باندھ بنا تو گاؤں ہمارا ڈوب گیا
بستی والوں سے کہتا تھا گھبرانا مت میں جو ہوں
ناؤ بنانے والا مانجھی وہ بیچارا ڈوب گیا
جانے کیسے اتنا پانی چھلکا چاند کٹورے سے
جس میں ہر اک جگمگ جگمگ ٹِم ٹِم تارا ڈوب گیا
ایک پریمی جوڑا جس دریا میں ڈوبا تھا کل رات
آج سمندر میں جا کر وہ دریا سارا ڈوب گیا
اپنی قسمت کو کوسیں یا کشتی کو روئیں پرویزؔ
ہم ساحل پر پہنچے ہی تھے اور کنارا ڈوب گیا

○

عطاءالرحمٰن قاضی

(عارف والا)

سوچ میں گم ہر ایک منظر تھا — آنے والے دنوں کا وہ ڈر تھا
کر گیا راکھ میری سوچوں کو — ایک شعلہ جو میرے اندر تھا
چھپ رہا تھا میں اپنی آنکھوں سے — ہر طرف آئنوں کا لشکر تھا
بوجھ تھا سوچتے زمانوں کا — میرے شانوں پہ کب مرا سر تھا
اے وہ تکمیلِ ہجر کا لمحہ — اک نئے ہجر کا پیمبر تھا
آنکھ تھی آنکھ میں تری تصویر — شاخ تھی شاخ پر گلِ تر تھا
اک جزیرہ تھا میرے دل میں کہیں — ہر پرندہ جہاں سخن ور تھا
نیم کے پیڑ سے میں جا لپٹا — اس گلی میں کہیں مرا گھر تھا
ہم وہ اہلِ کمال جن کو عطا — جو نہ چاہا وہی میسر تھا

احسان قادر

(لاہور)

لامکان و مکان میں خوش ہے — کیا کوئی آسمان میں خوش ہے
وہ مسلسل زمین پر خوش ہے — اور وہ آسمان میں خوش ہے
اک زمیں زاد تجھ تلک پہنچا — کون اس کی اڑان میں خوش ہے
کوئی بھرتا ہے دم محبت کا — کوئی نفرت بیان میں خوش ہے
میں تو اپنے یقین میں خوش ہوں — تو بھلا کس گمان میں خوش ہے
جو بھی جس کو یہاں میسر ہے — وہ اسی کے ہی دھیان میں خوش ہے
میرا تیرا رازدار اول ہوں — جو بھی جیسے گمان میں خوش ہے
تجھ سا قادر ہے کوئی ایسا جو — گوشۂ بے امان میں خوش ہے

حبیب الرحمٰن چوہان

(میر پور خاص)

سزائے کربِ بدن سے گزارتا ہے مجھے — وبالِ عشق مسلسل نکھارتا ہے مجھے
میں اس وجود کے ہونے سے ہوں سوئے تخریب — یہ ہی وجودِ ہزیمت تو مارتا ہے مجھے
فصیلِ ساعتِ بے کیف کو بقا تو نہیں — گزرتے وقت کا ہر پل سنوارتا ہے مجھے
میں بس گمان سے واپس پلٹ کے آتا ہوں — مرے وجود سے کوئی پکارتا ہے مجھے
تمہارے غم کے سمندر میں ڈوبتا ہوں کبھی — کبھی یہ درد تمہارا ابھارتا ہے مجھے
ذرا سی موت نے سکھلا دیا ہے سب مجھ کو — زمانہ کیسے لحد میں اتارتا ہے مجھے
میں اس جنوں کی حقیقت سے مطمئن ہوں حبیب — مرا جنون تو پل پل سنوارتا ہے مجھے

ڈاکٹر سید قاسم جلال

(بہاولپور)

قومِ افتادہ کو، کیا دے گا سہارا کوئی؟
اس چمن کو بھی ملے گا، چمن آرا کوئی؟

کس کے غم میں ہے سیہ پوش ہوئی آج کی شب
آج ہے چاند فلک پر نہ ستارہ ، کوئی

اِک اشارے سے جو تقدیر بدل دیتے ہیں
ڈھونڈ کر لائے وہ درویش، خدارا کوئی

جب دیا دھوکہ ہر اک نے تو یہ ہم نے سوچا
کیا حقیقت میں بھی ہے دوست ہمارا کوئی؟

مجھ کو حق گوئی کی عادت ہے، اسے سننے کی
آج کر سکتا ہے تکلیف گوارا کوئی؟

کس کی مرے دلِ صد چاک سے آتی ہے صدا؟
اس خرابے میں ہے کیا انجمن آرا کوئی؟

کاش اک بار پلٹ آئے خلافت کا نظام
پھر سے لے آئے وہی دور ہمارا کوئی

سرخ رو ہوتے ہیں ہر دور میں خوں دے کے شہید
ہار کر زیست کی بازی، نہیں ہارا کوئی

ڈال کر بوجھ رواجوں کا ، نہیں سوچتے ہم
دب کے مر جائے نہ حالات کا مارا کوئی

اہلِ اسلام جب اپنے ہی نہیں تم ہمدرد
ہاتھ تھامے گا بھلا کیسے تمہارا کوئی

بے حجابانہ جلاؔل آج وہ ہے محوِ کلام
روک دے وقت کا بہتا ہوا دھارا کوئی

عامر عبداللہ

(جھنگ)

دل کو مشکل میں ڈالنے سے گریز
اب کوئی زخم پالنے سے گریز

اور اب کیا ہے ہارنے کو بچا
دیکھ سکہ اُچھالنے سے گریز

میرے دامن میں آ پڑی دنیا
اور مجھے ہے سنبھالنے سے گریز

عمر بھر یہ خلا رہے گا خلا
مجھے دل سے نکالنے سے گریز

ہم کب آئندگاں کا مسئلہ ہیں
ہمیں قصوں میں ڈھالنے سے گریز

بس یہی خاک ہی تو ہے اپنی
خاک پر خاک ڈالنے سے گریز

ہارون الرشید

(بالاکوٹ)

یہ حادثہ بھی کبھی رُونما تو ہونا تھا
کہیں تجھے کہیں مجھ کو فنا تو ہونا تھا

ترا نصیب کہیں تھا، مرا کہیں بھی نہ تھا
اب سفر میں کسی دن جدا تو ہونا تھا

جہاں میں عشق کیا ٹوٹ کر تو تجھ سے کیا
کہ زندگی کو کہیں مبتلا تو ہونا تھا

خوشا کہ میں تری فرقت کا بار اٹھا لایا
یہ زر کسی نہ کسی کو عطا تو ہونا تھا

وہ آ گئی ہے گھڑی دل کو کیا لہُو کرنا
تجھے کبھی نہ کبھی بے وفا تو ہونا تھا

اب اتنا کیوں مرے بجھنے پہ تو فسردہ ہے
چراغ تھا مجھے نذرِ ہوا تو ہونا تھا

○

''بال و پر سارے''

(منتخب تروینیوں کا اجمالی تجزیہ)

ڈاکٹر تقی عابدی
(کینیڈا)

تروینیوں کے گلشن کی سیر سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ گلزار کا کلام خود گلزار کی طرح ہر طرح کے پھولوں سے رنگ برنگ ہے۔ چنانچہ ہم نے نظموں، غزلوں، گیتوں اور ترائیلوں وغیرہ پر کسی قسم کا تبصرہ اور تجزیہ کیے بغیر یہاں صرف اور صرف تروینی کو اپنی گفتگو کا مرکز بنایا ہے۔

دیر تک آسماں پہ اڑتے رہے
اک پرندے کے بال و پر سارے

باز اپنا شکار لے کے گیا

اس تروینی کے پہلے دو مصرعے ایک منظر پیش کر رہے ہیں جو شاعر کا مشاہدہ ہے۔ ہم سب جانتے ہیں جب عقاب کسی پرندے کا شکار کرتا ہے تو پہلے اس کے بال و پر نوچ دیتا ہے تاکہ وہ پھر اُڑ نہ سکے اور اس طرح بے کس اور بے بس ہو کر عقاب کا نوالہ بن جائے۔ چنانچہ پرندے کے بال و پر آہستہ آہستہ زمین پر آنے لگتے ہیں کیونکہ عقاب یہ عمل اونچے درختوں یا چٹانوں پر کرتا ہے اور ویسے بھی عقاب کو پرندے کے بال و پر سے رغبت نہیں رہتی۔

یہاں تروینی کے تیسرے مصرعے نے حیرت یا Suspense کو ختم کر دیا کہ یہ باز کی وجہ سے بال و پر منتشر ہوئے۔ تیسرے مصرعے نے مضمون کو وسعت بھی دی، لیکن اس تروینی کی معنی آفرینی اس میں پوشیدہ اصل حقیقت سے ہے جو شاعر کا مدعا ہے۔ یعنی یہاں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی، انسانی کی بے بسی اور موت کے قوی پنجوں کا ذکر اس روزانہ ہونے والے مشاہدے سے کیا ہے۔ یہاں انسان کی زندگی بھر کا حاصل اس کی ملکیت، اس کے کاروبار، اس کے لباس وسائل، دولت اور اس کا بے جان جسم سب کچھ مدت کے لیے دنیا میں بکھرے پڑے رہتے ہیں جب اُسے موت اپنا شکار بنا لیتی ہے بالکل اسی طرح سے جیسے ایک باز کسی پرندے کو اٹھا کر اپنا لقمہ بناتا ہے اور اس کے بال و پر کچھ عرصے کے لیے اُڑتے بکھرتے نظر آتے ہیں اور کچھ دیر بعد وہ بھی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں گلزار نے موت کی عمدہ پیکر سازی کی ہے۔

تروینی اگرچہ چھوٹی تین مصرعوں کی مکمل نظم ہے لیکن اگر شاعر عمدہ فکر نادر تخیل اور الفاظ کے دروبست سے واقف ہو تو ان تین مصرعوں میں شش جہتی مطالب سمو سکتا ہے۔ مصرعہ دوم کے فقرے ''بال و پر سارے'' کو گلزار نے اپنے شعری مجموعہ کا عنوان بھی قرار دیا ہے۔ پوری تروینی روزمرہ کے سیدھے سادے الفاظ میں صنعت مراعات النظیر کا گلدان معلوم ہوتی ہے۔

صنعت مراعات النظیر = پرندے۔ بال و پر۔ اڑتے۔ باز۔ شکار۔

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے سورج کی شعاعیں
شعروں کے لفافے ہیں کچھ تجربے ہیں میرے، کچھ میری دعائیں

نکلو گے سفر پر جب، یہ ساتھ میں لے لینا، شاید کہیں کام آئیں

اس تروینی میں جو ''بوسکی کے لیے'' لکھی گئی ہے، باپ کی نصیحت ہے جو بیٹی کے لیے مصرعوں میں لکھی گئی ہے، یہ نصیحت تمناؤں، تجربوں اور دعاؤں کے خمیر سے بنی ہے۔ تمنا دل کے الاؤ سے سوز و گداز لیتی ہے۔ تجربے کتابوں میں نہیں بلکہ بال سفید کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ دعائیں خریدی نہیں جا سکتیں۔ یہ قدریں مادی نہیں بلکہ معنوی ہیں۔ شاعر نے یہاں اگرچہ پیکروں اور استعاروں میں مطلب پیش کیا ہے لیکن معنی آفرینی ان پیکروں کی ظاہری اور باطنی علامات سے ظاہر ہے۔ خوابوں کے خط باپ کی آرزو اور تمنا ہے بیٹی کے لیے۔ چاند علامت ہے حُسن کا محبت کا، سکون کا، اطمینان اور آسودگی کا۔ سورج علامت ہے ترقی کا، کامیابی اور سرخ روئی کا۔ یہاں باپ مصرعوں کے قالب میں اولاد کو تجربے اور دعائیں دے رہا ہے جو صرف تعلیم اور تعلم سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے راستے پر ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے سے ملتے ہیں اس لیے باپ کہتا ہے عملی زندگی میں تنہا سفر کرو گے تو شاید ضرورت پڑے گی اس لیے اِسے اپنے زادِ راہ کی گٹھری میں باندھ لینا۔

یہ نظم اگرچہ بظاہر شاعر کی نورِ نظر سے منسوب ہے لیکن یہ صلائے عام ہے جس میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کامیاب تجربوں کی اہمیت اور نصیحتوں کی قدر و قیمت بتائی گئی ہے۔ اس تروینی کی حسن آفرینی یہ بھی ہے کہ یہاں تیسرے مصرعے کی شمولیت سے معنی زندگی کے سفر پر جمع ہونے لگتے ہیں یعنی سفر کے لیے راستوں کے پیچ و خم پر اجالے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو چاند اور سورج کی دین ہے اور واقفیت اور مہارت درکار ہوتی ہے جو تجربوں سے حاصل ہوتی ہے اور ان تمام نکات کو رکھتے ہوئے بھی الہامی مدد یعنی دعا اور نیک خواہشات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تیسرے مصرعے نے نہ صرف معنی میں اضافہ کیا بلکہ نئے معنی بھی پیدا کیے۔

تینوں مصرعے ایک ہی بحر میں، سیدھے سادے الفاظ سے بنائے گئے ہیں۔ تمام مصرعوں میں ایک بھی اضافت نہیں، نادر اور جدید معانی کے دریچے ''خوابوں کے خط'' چاند کے آئینے'' اور ''شعروں کے لفافے'' سے کھولے گئے ہیں۔ صنعت مراعات النظیر میں چاند، سورج، شعاعیں اور خط، شعروں، لفافے شامل ہیں۔ یہ نظم عام فہم ہے اس کے ابلاغ میں کوئی دشواری نہیں۔

شعلہ سا گزرتا ہے مرے جسم سے ہو کر
کس لَو سے اُتارا ہے خداوند نے تم کو

تنکوں کا مرا گھر ہے کبھی آؤ تو کیا ہو

اس عشقیہ ترویٔنی میں عاشق اور معشوق کی واردات کو پیش کیا گیا ہے۔ معشوق نہ صرف شعلہ بدن ہے بلکہ شعلۂ فشاں اور شعلہ انگیز ہے۔ اسی لیے عاشق کا بدن بھی شعلے بدن سے شعلہ ور ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے شمع کی لَو سے پروانہ۔ یہ دو مصرعے کامل شعر ہیں۔ اِسے غزل کے عمدہ شعروں میں تغزل کی بنیاد پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ ردیف اور قافیے سے مستثنیٰ مصرعے۔ بحر میں رواں دواں ہیں۔ تیسرے مصرعے نے اس بیانیہ عشقی واردات کو سوالیہ عشق وحیرت کا مرقع بنادیا۔ شعلۂ شمع کا تاج اور لَو تاج پر طرّہ ہے جو یہاں معشوق کا سراپا ندرتِ بیان میں آسان الفاظ میں ''لَو سے اتارا'' گیا ہے۔ پہلے معشوق کا اثر عاشق پر دکھایا گیا ہے پھر شعلہ بدن کی تعریف اور تحلیل کر کے معنی کو معراج تک پہنچا دیا گیا ہے۔ نیز عاشق کی کم مائیگی اور معشوق کی برتری اس کی جلالت اور اہمیت دکھائی گئی ہے۔ شعلے اور تنکے کے ملاپ سے کیا ہوتا ہے۔ تجربہ دکھا چکا ہے۔ اگرچہ پروانہ شمع کی لو سے ٹکرا کر فنا ہو جاتا ہے لیکن اس فنا سے اُسے ابدی بقا حاصل ہوتی ہے۔ تیسرا مصرعہ صنعت ایہام میں میرا گھر شاعر کا گھروندا یا شاعری کا بدن بھی ہوسکتا ہے۔ پوری ترویٔنی میں مصرعے کی آخری وجہ سے ایک خوبصورت دلکشی ہے۔ اس ایک مصرعے نے پہلے دو مصرعوں کو فلک بوس کر دیا۔

نہ ہم مڑے نہ کہیں راستہ مڑا اپنا
نشیب آئے کہیں، اور کہیں فراز آئے

میں نیچے نیچے چلا تم بلندیوں پہ رہیں

عشقیہ ترویٔنی ہے۔ عاشق اور معشوق کی جدائی کے راز کو تیسرے مصرعے نے بیان کر دیا ہے۔ یہاں مضمون جدید ہے۔ ندرتِ بیان کے ساتھ ساتھ تیسرے مصرعے نے ابہامی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر عاشق اور معشوق کی جدائی کو الگ الگ راستوں پر چلنے یا خوشی وغم میں ساتھ نہ دینے کی وجہ بتائی جاتی ہے لیکن یہاں گلزار نے عاشق ومعشوق کو ایک ہی راستے پر گامزن بتایا ہے یہی نہیں بلکہ زندگی کے غم وخوشی، آسان اور مشکل حالات میں بھی ایک دوسرے کا شریک بتایا ہے چنانچہ ان دو مصرعوں میں یکسانیت دکھا کر فکری، علمی، اقتصادی فرق کے دروازے کھول دیے ہیں کہ عاشق نیچے یا پائین تہوں میں تھا اور معشوق بلندیوں کا حامل تھا جس نے اس وصل کو فصل میں تبدیل کر دیا۔ مضمون آسان الفاظ میں بغیر کسی اضافت اور ادق الفاظ کے ایک ہی بحر میں سمویا گیا ہے۔ پوری ترویٔنی کے مصرعوں میں الفاظ کی تکرار اور صنعتِ تضاد کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

صنعت تکرار = مڑے، مڑا۔ کہیں، کہیں۔ آئے، آئے۔ نیچے نیچے

صنعت تضاد = نشیب، فراز۔ نیچے، بلند۔ ہم، تم

صنعت ابہام = نیچے اور بلندیوں کو اوپر اور نیچے کے علاوہ Status کے اونچ نیچ یا فکر وعلم وفن کے دو کناروں کو بھی لیا جاسکتا ہے۔

اس ترویٔنی کے تیسرے مصرعے نے پہلے دو مصرعوں میں جو تشنگی تھی اس کو سیراب کر کے نئے مضمون کا گل کھلایا ہے جس کی وجہ سے اس کا اثر بڑھ گیا ہے۔

بے لگام اڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
''میکسیکن'' فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے

تھان پر باندھی نہیں جاتیں سبھی خواہشیں مجھ سے

غالبؔ نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

غالبؔ کے عاشق گلزارؔ نے خواہش کو بے لگام وحشی گھوڑا بتایا ہے اور ''میکسیکن'' گھوڑوں کی تلمیح پیش کر کے سامع اور قاری کو اپنے تجربے میں شریک کیا ہے۔ یہاں پوری ترویٔنی کا مرکز خواہش ہے جس کو نادر تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن ترویٔنی کے تیسرے مصرعے نے نہ صرف اس کے معنی کو وسعت دی بلکہ مضمون کو دو آتشہ کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے ہزاروں خواہشیں نکلنے کے بعد بہت زیادہ خواہشیں سینے میں دفن ہی رہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ خواہشیں میرے اختیار یا کنٹرول میں نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو میں رام نہیں کر سکتا۔ یہ پورا شعر صنعت مراعات النظیر میں ہے۔ جیسے لگام، گھوڑے، تھان وغیرہ۔ خوبصورت تلمیح اور متحرک تشبیہ بھی ''میکسیکن'' گھوڑوں کی ہے۔ شاعر نے نرم اور رائج انگریزی الفاظ میکسیکن، فلم وغیرہ کو اچھا برتا ہے جس سے اردو آنے والے اور موجودہ دور سے جڑی ہوئی ہے۔

سامنے آئے مرے دیکھا مجھے بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر

کل کا اخبار تھا بس دیکھ لیا رکھ بھی دیا

یہ ایک عشقیہ وارداتی ترویٔنی ہے۔ اس ترویٔنی کا سارا طلسم ''کل کے اخبار'' میں بند ہے۔ اچھی شاعری کی پہچان یہ بھی ہے کہ منظر کشی ایسی کی جائے کہ وہ مرقع کشی ہو جائے یعنی مناظر الفاظ کی وجہ سے اسٹیج ہو جائیں۔ یہاں پہلا شعر عشقیہ یادداشت ہے جس کو تیسرے مصرعے نے داخلی واردات بنا دیا ہے۔ تیسرے مصرعے نے نہ صرف وسعت بیانی عطا کی بلکہ معنی کو نیا رنگ بھی دیا۔ پس معلوم ہوا کہ گلزارؔ نے ایک معمولی شعر کو ''کل کے اخبار'' کے طلسم سے شعریت کے فلک پر سورج بنا دیا۔ تصور میں لائیے ایک گزرے ہوئے کل کے اخبار کو جو ٹیبل پر دھرا ہے۔ آپ اس سے واقف ہیں اس میں کچھ ایسی خبریں ہیں جو آپ کو خوش کرتی ہیں آپ انھیں پسند کرتے ہیں اور بعض کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں بہرحال تمام اخبار پر ایک لمحہ نظر ڈال کر ہٹا دیتے ہیں۔

یہاں مصرعوں میں الفاظ ایسے جمائے گئے ہیں کہ یہ مصرعے نثری سطریں معلوم ہوتی ہیں جو اچھی شاعری اور روزمرہ کی پہچان ہے۔ شبلی کہتے ہیں اچھا شعر وہ ہے، جس کی نثر نہ ہوسکے یعنی وہ خود نثر کی طرح سے لکھا گیا ہو۔ اس نئی صنف کی خوبی یہ بھی ہے کہ تیسرے مصرعے کی بدولت معنی

آفرینی کے نئے دروازے کھل رہے ہیں اور شاعر شاعری کی تاثیر اور وسعت میں اضافہ کر رہا ہے اور یہی اچھی اور بڑی شاعری کی شناخت بھی ہے۔

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک، مگر اک دن
جو مڑ کے دیکھا تو وہ دوست میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکّے کھو بھی جاتے ہیں

اس تروینی میں انسان کی خودغرضی، احسان فراموشی، جو ہر دور کا المیہ رہا ہے بیان کیا گیا ہے۔مشہور ہے خوشی میں سب ساتھی اور غم میں اپنا سایہ بھی دور بھاگتا ہے۔شعر کے دومصرعے کسی بھی عنوان میں لیے جاسکتے ہیں یعنی دوست دیرینہ یعنی ہمدم جو ہم قدم بھی تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔تیسرے مصرعے نے اس ساتھ چھوڑنے کی وجہ بتادی۔یہاں گلزار نے پھٹی جیب کو نئے محاورے کے ساتھ منطق سے بھی جوڑا ہے کہ جب جیب پھٹی ہوتو چند سکّے گر جاتے ہیں، یہ ایک تجربہ اور مشاہدہ ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔یعنی معلوم ہوا کہ اگر تروینی کا تیسرا مصرعہ جاندار اور محکم ہوتو معنی میں کمال حاصل ہوسکتا ہے۔اس تروینی کا مصرع بھی روز مرہ میں ہے، جس کی نثر نہیں ہوسکتی، کیونکہ خود نثر کے مانند بحر میں لکھا گیا ہے۔ پہلے شعر کی واردات کو تیسرے مصرعے کی منطق سے محکم کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔

اسی طرح کے مضمون کو ایک اور تروینی میں کچھ الفاظ بدل کر پیش کیا ہے۔ جہاں دوست خود نہیں چلا گیا بلکہ اسے کوئی لے گیا اور پھر وہ نہیں آیا اور اس کی جگہ خالی پڑی رہی لیکن یہاں مضمون بالکل الگ ہے پھر بھی تجربے اور مشاہدے کی پیکر سازی میں جدت ہے۔ یہاں جو دوست اور احباب شاعر کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے انھیں موت نے چھین لیا اور پھر وہ نہیں لوٹے ان کی جگہ لیکن شیلف سے نکلی ہوئی کتابوں کی جگہ کی طرح خالی ہی رہی۔شیلف سے جو کتاب نکل جاتی ہے اس کی جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں کتاب یہاں سے اٹھالی گئی ہے۔ ہمارے برصغیر کی ایک کمزور تہذیبی روایت کتاب کو لینے کے بعد اس کے واپس نہ کرنے کی بھی ہے۔ چنانچہ شاعر نے بہت ہی سادہ اور عام فہم طریقے سے مطلب ادا کیا اور پھر پہلے دومصرعوں کے رمز کو تیسرے مصرع سے وسعت دے کر اصل معنی کی طرف ذہن کو متوجہ کیا۔تروینی کے تیسرے مصرع سے اس کی شعریت اور معنی آفرینی کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ رباعی کے آخری مصرعے سے لیکن رباعی میں ہمیشہ وہی مضمون جس کو تینوں مصرعوں میں اٹھایا گیا ہے ایک خاص طریقے سے پیش کر کے نکھارا جاتا ہے۔جس تروینی کے بارے میں ہم نے اوپر چند سطروں میں ذکر کیا ہے وہ اس طرح ہے۔

کچھ مرے یار تھے رہتے تھے مرے ساتھ ہمیشہ
کوئی آیا تھا انھیں لے کے گیا پھر نہیں لوٹے

شیلف سے نکلی کتابوں کی جگہ خالی پڑی ہے

اکیسویں صدی میں اردو شاعری کو پھیلنے اور باقی رہنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت بھی ہے جس کے لیے فن میں سہولتیں پیدا کرنا ضروری ہے۔آج کا انسان پہلے کے انسان سے زیادہ مصروف اور پُر تحرک ہے وہ آج کی ٹکنالوجی کی وجہ سے ساری دنیا سے جڑا ہوا ہے اس کا مشاہدہ اور تجربہ کئی گنا ہے۔کنویں کے مینڈک کے لیے ساری کائنات اس کا کنواں ہے لیکن عقاب کے لیے صحرا، مرغزاروں اور کوہساروں کی پستیاں اور بلندیاں شکار حاصل کرنے کے لیے اپنی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ قدیم یا متوسطین شعرا محدود نظر تھے۔ وہ تو اتنے بلند تھے کہ آج ہم ان کی وسعت نظر کو پہنچ بھی نہیں سکتے، یہاں ہم عوام اور عام لوگوں کی وسعتِ فکری اور وقت کی فراہمی کے ساتھ فن کی وابستگی کو واضح کر رہے ہیں کہ اگر فن میں انھیں سہولتیں نہ ہوں تو یہ خیالات یہ جدید تخیلات سینے ہی میں دم توڑ دیں گے، کوشش یہ ہو کہ جذبات داخلی اور خارجی واردات الفاظ کا جامہ پہن کر کاغذ پر ظاہر ہوں۔

اک نوالے سی نگل جاتی ہے یہ نیند مجھے
ریشمی موزے نگل جاتے ہیں پاؤں جیسے

صبح لگتا ہے کہ تابوت سے نکلا ہوں ابھی

گلزار نے اس تروینی کو ندرت فکر سے آراستہ کیا ہے۔آج کے سائنسی علم کے مطابق نیند اور موت میں مشابہت ہے، شاید نیند آدھی موت ہو اسی لیے موت کو ابدی نیند بھی کہتے ہیں جس طرح ریشمی موزے چسپاں طور پر پاؤں کو ایسا پہن لیتے ہیں کہ پاؤں ہوتے ہوئے بھی نہیں معلوم ہوتے۔اُسی طرح نیند انسان کے حواس کو ایسا نگل لیتی ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردے کی طرح بے حواس رہتا ہے۔یہاں تروینی کے تیسرے مصرعے نے نیند کو موت کے دامن سے جوڑ دیا ہے جس کے لیے تابوت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس تروینی کا داخلی عمل جو سرسوتی کی طرح نہاں ہے''موت'' ہے جو تیسرے مصرعے میں آکر ظاہر ہوتا ہے۔شاعر نے تابوت کے لفظ سے مضمون کو نیا رخ دیا ہے۔صنعت مراعات النظیر میں نوالے، نگل، پاؤں اور موزے شامل ہیں۔

اتنے عرصے بعد ہینگر سے کوٹ نکالا
کتنا لمبا بال ملا ہے کالر پر

پچھلے جاڑوں میں پہنا تھا یاد آتا ہے

شاعری جذبات اور محاکات نگاری ہے۔سبب سے مسبب کو جاننا مجاز مرسل ہے جو محاسن شاعری میں داخل ہے۔شاعر نے لمبا بال کالر پر لکھ کر معشوق کے گلے لگنے کا جواز پیش کیا ہے۔اس شعر کا حُسن یہ ہے کہ کہیں بھی معشوق، ملاقات یا عشقیہ واردات کا لفظی تذکرہ نہیں لیکن ان تمام کے نہ ہوتے

ہوئے بھی مضمون پورا روشن ہے۔حالؔی نے یادگارِ غالبؔ میں:

جب میکدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا سب سے بڑا حُسن یہ ہے کہ پورے شعر میں کہیں بھی شراب، ساقی اور دیگر لوازمات کے بیان کے بغیر معنی ظاہر ہیں۔

پہلے دو مصرعوں سے معلوم ہوا کہ شاعر کی ملاقات معشوق سے ہوئی تھی۔ برصغیر کی حسن نگاری میں لمبے بال بھی شامل ہیں۔تیسرے مصرعے نے نہ صرف اس ملاقات کے وقت کا تعین کیا بلکہ اِسے ایک یاد بنا کر جدائی کی منظر نگاری بھی کردی جو عشقیہ شاعری کی دردو کسک شمار کی جاتی ہے۔ترو ینی میں ہر قسم کے عام فہم مستعملہ الفاظ استعمال ہوسکتے ہیں جیسے ہینگر، کالر، کوٹ وغیرہ۔

یہاں ترو ینی کی بدولت ایک تجربے یا ایک واقعے نے ایک انوکھے پرتاثیر مضمون کو جنم دیا جو شاید غزل یا مثنوی وغیرہ میں ممکن نہ تھا۔

کچھ اس طرح خیال ترا جل اٹھا کہ بس
جیسے دیا سلائی جلی ہو اندھیرے میں

اب پھونک بھی دو، ورنہ یہ انگلی جلائے گی

یہ ترو ینی عشقیہ کیفیات کی عکاس ہے۔عشق سوز و سوزش، درد و جلن، تڑپ اور گداز کا حامل ہے۔معشوق کا خیال اور تصور جو وقتاً فو قتاً شعلے کی طرح دل میں اٹھتا ہے کہ تاریک خانۂ دل میں روشنی کے ساتھ آگ بھی لگا دیتا ہے بالکل اُسی طرح جیسے ایک دِیا سلائی اندھیرے میں شعلہ اور روشنی پیدا کرتی ہے۔ یہ دو مصرعے یا ترو ینی کا مکمل شعر غزل یا نظم کا عمدہ شعر بن سکتا ہے یہاں محاکات ایک سطحی ہیں ایک انوکھا خیال ہے جو دقیق بیانی سے تراشا گیا ہے۔

اب تیسرے مصرعے نے پورے مضمون میں نئی روشنی بھر دی۔ یہی ندرت اور شعر آفرینی ہے۔اگر جلتی دیا سلائی ہاتھ میں جلتی رہے تو انگلی جل جائے گی۔اگر یاد کے شعلے سینے میں بھڑکتے رہیں تو سینے کو خاک کردیں گے، پھر درد و گداز کا احساس بھی ختم ہوجائے گا۔اس لیے اِسے کبھی کبھی بجھا دینا بھی پڑتا ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ عشق میں فنا ہو کر بقا کے مقام کو حاصل کیا جائے۔میر انیسؔ کا شعر ہے:

شمع کشتہ ہوں، فنا میں ہے بقا میرے لیے
خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے

تمام صفحے کتابوں کے پھڑ پھڑانے لگے
ہوا ڈھکیل کے دروازہ آ گئی گھر میں

کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو

عشقیہ ترو ینی ہے۔ہوا کے جھونکے کے اثر کی منظر نگاری ہے جو شدت سے دروازہ کھول کر گھر میں آئی اور کتابوں کے صفحوں کو چھیڑنے لگی۔ یہ منظر ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور اس تجربے سے ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔یعنی پہلے شعر کے دو مصرعے ایک حالت اور کیفیت کو بیان کررہے ہیں جس میں چنداں تاثیر نہیں لیکن تیسرے مصرعے جس کا گمان بھی پڑھنے والے کو نہ تھا خالی تصویر میں عشقیہ رنگ بھر دیتا ہے۔ حُسن کی بیشمار ادائیں ہیں جن میں ناز و نخرے، روٹھنا، دشنام کرنا، غرور و گھمنڈ، تعریف و تجلیل، کے ساتھ ساتھ عاشق کی منت سماجت اور حُسن کے پاؤں تلے آنکھیں بچھانا بھی شامل ہے۔شاعر کہہ رہا ہے کاش کبھی تم بھی یہ رسمی اخلاقی اور حسنی رکاوٹوں کو چھوڑ کر میرے پاس آجاتیں تو بات بنتی۔سچ تو یہ ہے کہ سچے عشق میں بناوٹ نہیں بلکہ دل سے دل کو راستہ ہے۔اسی لیے اس کا اثر شدید اور لافانی ہے۔

غالبؔ کا ایک شعر معشوق سے بلا تکلف جھپٹ کر بوسہ لینے پر ہے۔

ہست تفاوت بسی ہم ز رطب تا نبیذ
لذت دیگر دہد بوسہ جو دشنام شد

یعنی فرق ہے کھجور جو میٹھا ہے اور اس کی شراب جو کڑوی ہوتی ہے مگر کھجور کی مٹھاس چند لمحوں کے لیے اور شراب کا سرور طولانی ہے پس جو بوسہ معشوق سے زبردستی دشنام کے ساتھ ہوا اس کا اثر اور مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

یہ معلوم ہوا کہ بناوٹ اور رسمی دعوت وغیرہ کے بغیر معشوق ہوا کی طرح دروازہ ڈھکیل کر آجائے تو اس کا مزا اور مقام کچھ اور ہی ہوگا۔عاشق خوشی اور بے خودی سے بے قرار ہوگیا جس طرح ہوا کے جھونکے سے کتاب کے صفحات پھڑ پھڑانے لگے۔

ترو ینی کی قدر و قیمت تیسرے مصرعے کی بدولت ہوئی جو پہلے شعر کے معمولی اور کم اثر مضمون کو بالکل نئی زندگی دیتی ہے۔ ہر قسم کی پیکر سازی ترو ینی کی جمالیات میں اضافہ کرسکتی ہے۔

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

اچھی شاعری کی علامت یہ بھی ہے کہ مضمون نگاری استعارات، علامات اور اشارات میں کی جائے۔مشہور ہے ''برہنہ حرف نگفتن ہنر گویائیست'' یعنی شاعری کا ہنر عریاں طریقہ سے نہ کہنا ہے، مطالب کو تہہ داری، گہرائی، اور رمز و رموز میں بیان کرنا قادرالکلامی اور شعری حسن آفرینی ہے۔

اس ترو ینی میں شاعر نے مصرعہ دوم کو محور بنایا ہے۔آنکھ کے شیشے دراصل شاعر کی زندگی کی پیکر تراشی ہے جو بگڑ یا چٹخ چکے ہیں۔یعنی مدت سے شاعر کی زندگی کے خدوخال گردش میں ہیں جس کی وجہ سے احساس بھی بگڑے ہوئے ہیں اور اس کی اس حالت سے لوگ گریز اور کنارہ کشی کررہے ہیں۔اور ہر شخص صرف اس ایک پہلو کی جلوہ نمائی کرتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے کہ نمودار ہو یعنی لوگ

مطلب پرست ہیں سب مجھ ہی سے فیض اور نفع اٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میرا کیا حال ہے۔

اس تروینی میں شاعر نے چٹخے ہوئے عینک کے شیشوں سے مضمون نگاری کی یعنی جب دل ٹوٹا ہو جب قسمت کھوٹی ہو، جب زندگی روٹھی ہو تو کوئی چیز بھی مکمل اور صحیح نہیں ملتی۔ یہ گردش فلک ہے اور یہ زمانے کی ریت۔ اس تروینی کا مضمون نادر، تجربہ گہرا، اور اثر شدید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان سے انسان کی ملاقات دلوں کی ملاقات نہیں بلکہ مصلحتوں کی بازی گری ہے۔ یہ ملمع سازی ہے اسی لیے تو دلوں کے شیشے بھی چٹخے ہوئے ہیں، دل کے شیشے میں جو بال آجائے تو وہ عشق کا وبال ثابت ہوتا ہے۔

اس تروینی میں صنعت مراعات النظیر میں صورت، آنکھ، نظر، صنعت تکرار میں ٹکڑوں ٹکڑوں، اور صنعت تضاد میں پوری، ٹکڑے، کوئی، سبھی وغیرہ بھی شامل ہیں۔

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

سیدھی سادی عشقیہ تروینی ہے جہاں عاشق کی پہچان معشوق کے سبب ہے۔ کیونکہ وہ فنافی المعشوق کی منزلوں پر گامزن ہے۔ امیر خسرو کہتے ہیں تو مجھ جیسا ہو گیا اور میں تجھ جیسا۔ تو میری جان بن گیا اور میں تیرا جسم۔ اس لیے اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تجھ اور مجھ میں کچھ فرق باقی ہے:

تو من شدی من تو شدم تو جاں شدی من تن شدم
تا کس نگوید بعد ازیں تو دیگری من دیگرم

یہاں شاعر نے نیا مضمون نکالا ہے کہ تیری صورت جو میری آنکھوں میں بھری ہے تو مجھے کنج عزلت میں جس کسی نامعلوم شخص کو دیکھتا ہوں تو آشنا معلوم ہوتا ہے یعنی تیری آشنائی بہت ہے تیری شہرت اور ملاقات ساری دنیا سے معلوم ہوتی ہے یہاں رقیبوں کی کثرت ہے ہر ایک مجھ سے کسی قسم کا رشتہ رکھ رہا ہے کیونکہ وہ سب تجھ سے جڑے ہوئے ہیں۔

قتیل شفائی کا شعر ہے:

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

اس شعر میں رقابت اور حسد کا جذبہ ظاہر ہے لیکن اس تروینی کا کمال یہ ہے کہ یہ آگ زیرِ خاکستر کی طرح پوشیدہ ہے ورنہ شاعر یہ نہ کہتا کہ تجھ سے رشتہ کرنا سارے جگ سے رشتہ ہے۔ ہر ایک تجھ سے نسبت یا آشنائی رکھتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں صنعت ایہام عمدگی سی برتی گئی ہے۔ یعنی ایک معنی یہ رشتہ جو قرب اور رشتہ داری سے قائم رہتا ہے اور دوسرے معنی میں وہ جو دھاگا جس میں دانے پروئے جاتے ہیں جو بھی رشتے کے معنی لیں معنی مکمل طور پر ظاہر ہیں۔

تیسرے مصرعے نے مضمون کو وسعت بھی دی ہے۔

تم ایک بوند ہو گر کے گھٹا سے پتے پر
سجھ رہے ہو کہ جنگل تو گونج اٹھا ہوگا

گرجتے بادلوں سے بھی یہاں تو پر نہیں ہلتا

یہ انسانی فکر کا المیہ ہے جو انا کے لہو سے پلتا ہے۔ یہاں معمولی سی شخصیت بھی خود کو عظیم ہستی مانتی ہے۔ اسی لیے دنیا کی تاریخ میں ثبت ہے کہ ایک بوالہوس کی سیہ کاری نے شہروں کو خاکستر کر دیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ خود شناسی، جہان شناسی اور خدا شناسی کا دروازہ ہے جہاں قطرے میں دریا کی حقیقت اور ماہیت کو بتایا گیا ہے۔ ایک عمدہ فارسی شعر ہے کہ یہ خیال مت کر اگر تو مر جائے گا تو دنیا ختم ہو جائے گی، بلکہ ہزاروں شمعیں جل کر راکھ ہو گئیں پھر بھی محفل جاری ہے:

گماں مبر کہ در تو بگذشت جہاں بگذشت
ہزار شمع را کشتند و محفل باقیست

بڑے بڑے سورما دنیا سے خالی ہاتھ بے بس اور بے کسی میں چلے گئے۔ یہاں انسان کو اس کی ارزش سے واقف کیا جا رہا ہے اور اس میں عبرت کا بھی درس شامل ہے۔ پوری تروینی صنعت مراعات النظیر یعنی بوند، گھٹا، گرجتے، بادلوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ تینوں مصرعوں میں "گ" کی تکرار گر، گھٹا، گونج، گرجتے وغیرہ نے نغمگی کو بڑھا دیا ہے۔ یہاں محاورہ "پر نہیں ہلتا" خوبصورت مقام پر باندھا گیا ہے۔

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی نشانی ہے

زندگی سب پہ کیوں نہیں ہے

بڑی خوبصورت تروینی ہے۔ اس کا پہلا شعر خود عمدہ کامل شعر ہے۔ آج تک دنیا میں کوئی شخص ایسا پیدا نہ ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو۔ دنیا میں ہر شے سب پر لاگو نہیں، ہر ایک قانون میں کچھ کچھ استثنا موجود ہے۔ صرف موت ہی ایسی چیز ہے جس کا فرمان اور عمل سو فیصدی ہے، ہر چیز فانی ہے اور یہی موت کا انصاف ہے کہ ہر ایک پر آتی ہے۔ شاعر نے مصرعے دوم میں موت کو انصاف کی علامت قرار دیا ہے جو بالکل صحیح ہے۔ موت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصف نہیں۔

تروینی کا ایک خاص منصب اس کے معنی کو بدل دینا بھی ہے جسے یہاں پہلے شعر کے مطلب کو تیسرے مصرع نے دھندلا کر دیا اور ایک جذباتی اور کیفیتی سوال اٹھایا کہ موت کی ضد جو زندگی ہے کیوں سب کو نصیب نہیں ہوتی یعنی یوں تو سب زندہ ہیں لیکن زندگی زندگی میں فرق ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض زندوں پر کبھی زندگی نہیں آتی۔ یہاں دنیا میں سب کچھ ہے لیکن انصاف نہیں ہے اور شاید اسی لیے کہتے ہیں۔ World is not fair یہ تروینی الفاظ کی تکرار جیسے سب، اور ہے کی وجہ سے مترنم ہو گئی ہے۔

صنعت تضاد نے زندگی اور موت کو جمع کر دیا ہے۔ تیسرے مصرعے نے معاشرے مُلک، عوام، حکمران اور حالات کو جھنجھوڑا ہے۔ انسانی حقوق کی گفتگو شاعری کو بڑی شاعری اور پیامبری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس تروینی میں مختلف صنعتیں خود بخود جمع ہوگئی ہیں جیسے مصرعۂ اول اور مصرعۂ آخر میں آتی اور نہیں آتی وغیرہ۔

زندگی کیا ہے جاننے کے لیے
زندہ رہنا بہت ضروری ہے

آج تک کوئی بھی رہا تو نہیں

یہاں پھر شاعر نے زندگی سے بحث کی ہے۔ اردو شعرا نے زندگی کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کو اگر جمع کریں تو دفتر بن سکتا ہے مگر پھر بھی زندگی کا مطلب ادھورا ہی رہے گا۔ کسی نے کہا:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

چکبستؔ نے کہا:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی جزا کا پریشاں ہونا

گلزارؔ نے زندگی کے مسئلہ کو سہل ممتنع سے حل کر دیا کہ زندگی جاننے کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد سوال اٹھایا کہ اس فانی دنیا میں کوئی بھی تو زندہ نہیں رہا۔ یہاں صنعت ابہام اور ایہام میں گفتگو ہے۔ ایک سیدھے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کی زندگی فانی ہے اور کوئی بھی ہمیشہ زندہ نہ رہا جو زندگی کی تعریف کر سکتا اور دوسرے یہ کہ جسے لوگ زندگی سمجھ کر گزار رہے ہیں یہ زندگی نہیں۔ جس پہلو سے دیکھیں معانی درست ہیں۔ ایسے مطالب شاعری کے فلسفے کے اشعار میں بحث کیے جاسکتے ہیں یا ہر قسم کے مطالب میں بھی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ پوری تروینی بات چیت کی طرح ہے کہیں مصرعہ بیانیہ ہے کہیں سوالیہ لیکن سیدھا سادہ۔

ایک بار خودکشی کی کوشش تھی
موت کا ڈر نکل گیا تھا دل سے

زندہ رہنے کا ڈر نہیں جاتا

پھر اس تروینی میں موت اور زندگی کے مسائل ہیں۔ انسانی نفسیات اور Psychic میں موت کو اگر مسلسل سوچا جائے اور موت کے بعد کی زندگی کے تصور کو مسلسل اپنایا جائے تو موت کا خوف کم ہو جاتا ہے۔ انسان جب اپنی زندگی ختم کرنے کی ٹھان لیتا ہے جسے عام زبان میں خودکشی کہتے ہیں اُس کو موت کا خوف نہیں رہتا یا خوف کے سوچنے کے احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ خودکشی آج کے دور کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ شاعر نے اس تروینی میں خودکشی کے ایک پہلو خوف نہ ہونے پر زور دے کر ندرت بیانی کی ہے۔ شاعر یہ بتا رہا ہے کہ موت اور زندگی دونوں کا ڈر انسان کو رہتا ہے اور زندگی کا خوف موت کے خوف سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ جو شخص خودکشی کر کے بچ گیا، اس کے پاس موت کا خوف تو نہیں مگر زندہ رہنے کا خوف باقی ہے۔ گلزار یہاں ہمیں گلاس میں آدھا حصہ خالی دکھا رہے ہیں جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس تروینی میں صنعت مراعات النظیر میں زندہ، موت، خودکشی کے علاوہ تضاد الفاظ موت، زندہ شامل ہیں۔ ایسی تروینیاں گیرائی کے ساتھ گہرائی کی حامل ہیں۔

موت اور زندگی، جینا اور مرنا، گلزار کی شاعری میں مختلف جہتوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ مگر ہر مقام پر کم و بیش مطلب اور معانی دوسرے ہیں۔ یعنی گلزار ان الفاظ سے موضوع کے مطابق پیکر تراشی کرتے ہیں اور اس عمل سے ترسیل اور ابلاغ میں فرق نہیں پڑتا۔ آیئے ایک اور تروینی دیکھئے:

موت کے بعد بہت لوگوں نے زندہ رکھا
زندہ تھا جب تک لوگوں نے مارا اس کو

ہاں منٹو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا

اس تروینی میں موت اور زندگی کو دوسرے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ زندہ رہنا صرف سانس کے اُتار چڑھاؤ پر منحصر نہیں بلکہ انسان اپنے ہنر، کارناموں اور کاموں کی بدولت صدیوں زندہ رہتا ہے جسے عام فہم میں زندۂ جاوید کہتے ہیں۔ اسی کی طرف ذوقؔ نے بھی اشارہ کیا ہے:

ع: رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

جوشؔ نے اپنی ایک نظم میں برصغیر کی تہذیب اور ہنرمندوں کی ناقدری پر کہا ہے کہ جب تک ہنرمند زندہ رہتا ہے اُسے تکلیف اور اذیتیں دیتے ہیں لیکن اس کے مرنے کے بعد خوبصورت اس کی سنگ مرمر کی قبر بنا دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال کو بھی ان کی حیات میں زحمت دی گئی۔ ان کی قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن آج بہت لوگ ان کی تصویر کا لیبل اپنے کوٹ اور ان کی تصویر اپنے آفس میں رکھتے ہیں۔ اگر فہرست بنائی جائے تو درجنوں ایسی ہستیاں ہوں گی جن سے زمانے نے انصاف نہ کیا۔ جہاں تک منٹو کا تعلق ہے افسوس اس کا ہے کہ ان کے ہنر کی قدر عوام نے کی مگر اس کی قیمت ادا نہ ہوئی وہ مشکل سے اپنے گھر کا کاروبار چلاتے ہیں لیکن ان کے ہنر سے دوسرے لوگ مادّی اور فنی فائدہ اٹھاتے رہے اور اٹھا رہے ہیں۔

اگلا پل جینے کے لیے
پچھلے پل کو وداع تو کرلو

کل جو گیا وہ گیا نہیں ہے

عمدہ تروینی ہے۔ وقت کا دھارکل آج اور کل میں بانٹا جاتا ہے جس سے دنیا کے کاروبار چلتے ہیں۔ یہاں لمحہ یا پل درحقیقت ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم ہوتا ہے۔ حال کا وجود خود خطرے میں ہے کیوں کہ ہر لحظہ وہ ماضی کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ روایت کا تعلق ماضی سے ہے جدیدیت کا تعلق مستقبل سے ہے اور اس کے درمیان حال ہے۔ گلزار ماضی سے تجربے، تہذیب، تربیت، تعلیم اور تاریخ سے منسلک رہنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی قدریں ہیں جن سے ہم مستقبل میں عزت کی زندگی جی سکیں گے۔ مصرعہ دوم میں وداع کا لفظ، یعنی رخصت ہوتے وقت گلے مل لو ایک رابطہ برقرار رکھو کیوں کہ جو کل گیا ہے وہ اپنے مقام پر موجود ہے۔ شاعر اس تروینی میں یہ تاکید کررہا ہے کہ روایت سے جوڑ ضروری ہے یہی جوڑ زندگی گزارنے کا سرمایہ ہے۔ روایت گزر کر بھی گزرتی نہیں بلکہ قائم رہتی ہے۔

یہاں چھوٹی بحر میں الفاظ کی تکرار پل، پل۔ گیا گیا، کے علاوہ تضاد کے الفاظ اگلا، پچھلے۔ نہیں، ہے، شامل ہیں۔ تیسرے مصرعے کی کرشمہ سازی مصرعوں کو نئے معنی عطا کرتی ہے۔ ویسے دیکھنے میں آسان اور سہل تروینی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غور کرنے پر اس کی تہہ داری اور وسعت کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ اس مختصر تجزیے کے آخر میں ایک طنزیہ تروینی اردو ہندی زبان کے مسئلے پر پیش کرتے ہیں۔

وہ دونوں دعویدار تھے اپنی زبان کے
اُردو تری زباں نہیں، ہندی مری نہیں

دو بے ادب کو انگریزی میں لڑتے ہوئے دیکھا!

برصغیر میں زبان کا مسئلہ جذباتی ہونے کی وجہ سے عالم اور عامی دونوں اس جھگڑے میں ملوث ہے۔ گذشتہ ایک صدی سے سیاسی مذہبی اور خصوصی مفادات کی خاطر اردو ہندی مسئلے کو مشتعل کیا جارہا ہے یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ ایسے پُرآشوب دور میں گلزار صاحب کی تروینی طنزیہ ہوتے ہوئے سچائی کی نقیب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کو آب وتاب وہ لوگ دے رہے ہیں جنھیں دونوں زبانوں سے سروکار نہیں۔ اردو، ہندی دونوں برصغیر کی زبانیں ہیں، زیادہ تر بول اور الفاظ مشترک ہیں۔ رسم الخط اور شاعری کے فن میں الگ الگ راہیں ہیں لیکن ایک دوسرے سے نبرد آزما نہیں۔ برصغیر میں چوبیس (۲۴) سے زیادہ زبانیں موجود ہیں۔ یہ زبانیں تہذیبی، تربیتی، ثقافتی اور علمی طور پر ایک دوسرے سے کچھ حاصل کرتی ہیں۔ کوئی بھی زبان کسی کی میراث نہیں۔ ہر شخص کسی بھی زبان کو اپنا سکتا ہے۔ اردو ہندی کے دعویدار عام طور پر وہی ہیں جنھیں دونوں زبانیں نہیں آتیں ان کو ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ تیسرے مصرعے نے یہاں طنزیہ طور پر بتا دیا کہ وہ جو اردو ہندی کے دعویدار تھے خود ان زبانوں میں بات نہیں کرسکتے تھے اس لیے ایک خارجی زبان انگریزی میں لڑرہے تھے۔ یہاں زبان کی تکرار، تری، مری کا تضاد اور بے ادب کا تیسرے مصرع میں وجود تروینی کو نرم سلیس اور پُرکار بنادیتا ہے۔

''چھیل چھبیلے''

کچھ ایرے ہیں، کچھ غیرے ہیں
کچھ نتھو ہیں، کچھ خیرے ہیں
کچھ جھوٹے ہیں، کچھ سچے ہیں
کچھ بڈھے ہیں، کچھ بچے ہیں

کچھ ململ ہیں، کچھ لٹھے ہیں
کچھ چیچے ہیں، کچھ چٹھے ہیں
کچھ تِلیر اور بٹیرے ہیں
کچھ ڈاکو اور لٹیرے ہیں

کچھ روٹی توڑ مچھندر ہیں
کچھ دارا، کچھ سکندر ہیں
کچھ اپنی بات کے پکے ہیں
کچھ جیب تراش اُچکے ہیں

کچھ ان میں ہر فن مولا ہیں
کچھ رولا ہیں، کچھ غولا ہیں
کچھ تاک دھنا دھن تاکے ہیں
کچھ الٹے سیدھے خاکے ہیں

کچھ ان میں رنگ رنگیلے ہیں
کچھ خاصے چھیل چھبیلے ہیں
کچھ چورا چوری کرتے ہیں
کچھ سینہ زوری کرتے ہیں

ہر چند بڑے ہشیار ہیں یہ
شہ زور ہیں یہ، سردار ہیں یہ
اب قوم کی خاطر مرتے ہیں
اسلام کا بھی دم بھرتے ہیں

شورش کاشمیری

کبھی اُس سے بات کرنا

مامون ایمن
(نیویارک)

''بے کرانیاں'' پر تبصرہ سے پہلے یہ معروضیات ملاحظہ کیجیے۔اس تبصرہ میں بالواسطہ باتیں شامل ہیں۔ بجا، لیکن اس تبصرہ میں، اِدھر اُدھر بلاواسطہ باتوں کے چھینٹے بھی شامل ہیں۔ کیوں؟ وہ قاری بھی شاعرہ پروین شیر کے نام اور ادبی کام سے واقف ہو جائے جو شمالی امریکہ کی ادبی سرگرمیوں سے واقفیت نہیں رکھتا۔اس طور میں ذرا ذرا سے تناظر اور تقابل کے اذکار سے، پروین شیر نامی اس شاعرہ کا تعارف نسبتاً آسان تر ہو جائے گا۔اس طور کی ایک وجہ اور بھی ہے اردو زبان وادب کے روایتی مراکز میں مقیم شائقینِ ادب کو اس بات کا احساس ہی نہیں کہ پاک وہند سے ہزاروں میل دُور رہنے والے، کئی خواتین وحضرات اردو زبان وادب سے باقاعدگی سے جُڑے ہیں۔اور ان کی تخلیقات میں عیار کا درجہ نظر آتا ہے۔ مجوزہ عیار یہ باور کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ آج شمالی امریکہ میں واقع دو بڑے شہر، نیویارک اور ٹورانٹو بھی اردو زبان وادب کے دو بڑے اور اہم مراکز ہیں۔ نیویارک، امریکہ کی ایک شمال مشرقی ریاست، نیویارک میں واقع ہے۔ ٹورانٹو کینیڈا کی ایک شمال مشرقی ریاست، اونٹیریو کا سب سے بڑا شہر ہے۔ان دونوں شہروں کے درمیان تقریباً چار سو میلوں کا فاصلہ ہے۔ جس کا سفر آسان بھی ہے اور عام بھی۔ یوں ان دونوں شہروں میں مقیم شعراء،شاعرات اور ادباء ایک دوسرے کے قریب ہیں اور اُن کی تخلیقات سے بہت حد تک واقف بھی۔۔۔ پروین شیر امریکہ میں ایک نووارد ہے۔ اُس کی زندگی کینیڈا کی ایک شمال مغربی ریاست مینی ٹوبا کے مرکزی شہر، وِنی پگ میں گزری ہے۔ یاد رہے کہ وِنی پگ اور ٹورانٹو کے درمیان تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ وِنی پگ اردو زبان وادب کا کوئی بڑا یا قاعدہ مرکز نہیں اگرچہ وہاں بھی اردو بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔لہٰذا یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ پروین شیر کی زندگی کے روز وشب کو اردو کا کوئی باقاعدہ ماحول حاصل نہ تھا۔

پروین شیر کا تعلق موجودہ ہندوستان کی ایک شمال مشرقی ریاست بہار کے مرکزی شہر پٹنہ سے ہے۔ وہ سولہ برس کی عمر میں حساب کے ایک اُستاد ڈاکٹر وارث شیر سے بیاہ کے بعد وِنی پگ آئی تھی جہاں اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا تھا۔ ڈگری حاصل کی تھی اور گورنمنٹ کینیڈا سے نی ٹوبا فلم کی درجہ بندی میں ملازمت کی تھی۔ پروین شیر بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہے۔ نیز وہ ایک باقاعدہ مصوّرہ بھی ہے۔

سولہ برس کی عمر میں، بہر حال ایک اُلھڑ بالی عمر ہے اُس عمر میں عام طور پر شعر گوئی کے شعور کا شعار عام نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں مصوّری سے ربط ایک قطعی الگ بات ہے۔ لہٰذا قاری پروین شیر کی عمر کے اُس حصہ سے بھی رُوشناس ہونا چاہتا ہے کہ اُس حصہ کا پروین شیر کی شعری لفظیات سے براہِ راست ربط ہے۔

''بے کرانیاں'' اور پروین شیر کی دیگر کتابوں میں شامل لفظیات قاری کو چونکاتی ہیں۔ان لفظیات میں بلوغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شمالی امریکہ میں مقیم کوئی شاعرہ یا شاعر ایسا نہیں جس کی نثر نگاری کو پروین شیر کی نثر نگاری کے سامنے رکھا جا سکے۔اس ضمن میں پروین شیر کا یہ کہنا ہے کہ میری لفظیات کے معیار پر ہندوستان کے کئی نامور نقادوں نے بھی حیرانی کا اظہار کیا ہے۔''میرا بچپن رسالوں میں گزرا ہے۔شادی کے بعد بھی میں رسالوں کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتی تھی۔'' بہر حال یہ بات کسی تردّد یا تکلف کے بغیر کہی جاسکتی ہے۔ پروین شیر کی نثری لفظیات کا معیار، شمالی امریکہ میں مقیم شعراء، شاعرات اور ادباء کی تحریروں سے برتر ہے۔

''بے کرانیاں'' میں پانچ اربابِ نظر کے تبصرے شامل ہیں۔اُن اربابِ نظر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور حضرت شمس الرحمٰن فاروقی کے نام نمایاں ہیں۔ یہ دونوں صاحبان اب عمر اور صحت کے اُس حصہ میں ہیں جہاں جم کر کوئی بسیط مضمون لکھنا ممکن نہیں ہوتا۔اس دونوں تبصروں میں اس شاعرہ کے متون اور مفاہیم اور ذات کو سراہا گیا۔''بے کرانیاں'' نامی یہ مجلد کتاب "7"x10 سائز میں دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔اس کی تاریخ اشاعت ۲۰۱۸ء درج ہے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔(۱) اردو نظم (۲) مجوّزہ اردو نظم کا انگریزی زبان میں ڈھیلا ڈھالا انگریزی متنی ترجمہ (۳) ہر نظم کے سامنے شاعرہ کی مصوّری کا ایک رنگدار نمونہ۔

یوں یہ کتاب ایک سہہ لسانی کتاب کا درجہ پاتی ہے کہ مصوّری بھی ایک زبان ہے۔ پروین شیر نے اردو صنفِ نظم کو چار عدد سہہ لسانی کتابیں پیش کی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ اہتمام، نوعیت کے اعتبار سے اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے۔ایک اور بات۔مترجم نے اردو متون اور مفاہیم کو۔۔۔

ٹورانٹو، کینیڈا میں مقیم ایک شائقِ ادب انجینئر بیدار بخت صاحب نے ان نظموں کے ترجمے بہت کامیابی سے کیے ہیں۔انگریزی زبان میں اس مشّاقی سے ڈھالا ہے کہ ہر نظم اپنی ذات میں ایک موثر اصل نظم بن کر اُبھرتی ہے۔

مصوّری کے نمونوں کے بغیر بھی یہ کتاب معنوی طور پر ایک درجہ رکھتی ہے۔ پروین شیر نے مصوّری کے ان نمونوں میں رنگوں، لکیروں اور دائروں کو زبانیں دے کر وہ بات/ باتیں کہنے کی سعی کی ہے جو متعلقہ نظم میں نہ کہی جاسکی تھیں یا تشنہ تھیں، شاید۔

پروین شیر بیوگی کے بعد ستمبر ۲۰۱۶ء میں ریاست نیوجرسی کے ایک شہر جرسی سٹی میں قیام کے لیے آئی تھی کہ اُس کا بیٹا بھی اب اسی شہر میں رہتا ہے۔ ادبی طور پر جرسی سٹی بھی نیویارک شہر کا باقاعدہ حصہ ہے۔اس شاعرہ نے پہلی ہجرت ہندوستان سے کینیڈا کی جانب کی تھی۔اس کے لیے شوہر کے علاوہ وہاں ہر شے

اجنبی تھی۔اس نے دوسری ہجرت کینیڈا سے امریکہ کی جانب کی تھی۔امریکہ میں اس کا شوہر بھی نہیں۔اس کے بیٹے بھی الگ رہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا یہی دستور ہے۔ یوں، اب اس کے روز وشب میں تنہائی کے وہ سائے ہیں جو اُسے کرنوں کی خبر دیتے ہیں۔وہ ان کرنوں سے جذبِ رائگانی تجنے کے لیے، الفاظ، متون، برش اور رنگوں کا سہارا لیتی ہے۔وہ سہارا ''خود کلامی'' کا ہم نوا ہے۔

''خود کلامی'' کا منظر واضح ہے لیکن اس کا پس منظر کیا ہے؟

''خود کلامی ایک عالمی عمل ہے۔اس عمل میں الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں اور اشارے اور کنایے بھی۔ یہ عمل عام طور پر پاگل پن کا نہیں، ذہانت کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ اس طرح فرد اپنے سوالات کے جوابات خود تلاش کرتا ہے۔خود کو اپنی زندگی کا احساس دلاتا ہے، خود کو ماحول اور معاشرہ کے نقوش میں تلاش کرتا ہے۔ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرتا ہے، اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے راستے اور جواز تلاش کرتا ہے۔ یہ الفاظ دیگر فرد اس عمل سے اپنی زندگی کا سفر اپنی ہی تراشیدہ رہ گزار میں کرنا چاہتا ہے۔اس تمہید کا مقصد؟ ''بے کرانیاں'' میں شامل بہت سی نظمیں ''خود کلامی'' کے زمرہ میں آتی ہیں۔ دیگر تارکینِ وطن کی طرح، پروین شیر بھی اپنے سابق وطن کو یاد کرتی ہے۔

ان نظموں میں ''کل، آج، کل'' کی باتیں ہیں۔ان باتوں کا پیام واضح ہے۔ ''اے کاش، میں اپنے ماضی میں لوٹ جاؤں، اُس ماحول کو دوبارہ اپنا لوں جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا ہے، اے کاش، اے کاش'' لیکن ''اے کاش'' والی تمنا شاذ ہی پوری ہوتی ہے کہ امریکہ یا کینیڈا آنے والے تارکینِ وطن شاذ ہی واپس جاتے ہیں۔ وہ یہیں رہتے ہیں، اجنبی آوازوں میں اپنی بولی بولتے ہیں اور ایک دن مٹی کی چادر اوڑھ کر اپنی اولاد، تہذیب اور ہر یاد اس ملک کو سونپ کر خاموشی سے ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ان کے بچے تیسری نسل پر پہنچ کر اپنے آباء واجداد سے نا آشنا ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر جھونکے، ہر موڑ کی منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ اجنبیت۔

مندرجہ بالا دونوں تمہیدوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اس کتاب میں شامل ایک نظم ''ایک بار پھر'' (صفحہ ۵۴) تبصرہ کے لیے چُنی گئی ہے۔۔۔اس نظم میں زمان بھی ہے اور مکان بھی، اس نظم میں ہجرت بھی ہے اور تمنا بھی۔ سابق وطن کی جانب لوٹ جانے کی تمنا۔ ایک ایسی تمنا جس کا بَر آنا اُس خواب کی مانند ہے جس کا دامن تعبیر سے تہی ہو۔اس نظم کا بنیادی متن قاری کو یہ باور کراتا ہے کہ پروین شیر اُس سفر کی خواہاں نظر آتی ہے جس کے مقدر میں منزل کا نشان نہیں۔ یہ خواہش ایک ہاری جنگ کی کہانی ہے۔

نظم ''ایک بار پھر'' کے تانے بانے ''سبب/نتیجہ'' سے ملتے ہیں۔اس نظم کی تہہ داری کا براہِ راست ربط وضاحتوں سے ہے۔ مجوزہ وضاحتوں کے لیے اس شاعرہ نے جن الفاظ کا سہارا لیا ہے وہ حاضر ہیں۔ ''تجدید، رشتے، پیمان، ساعتیں، خیاباں، زندگی، ہوا، تنہائی، شبنم، شعلہ زاروں، ابر پاروں، رنگ (اسم) جہاں، رستے (ظرفِ مکاں) حدّت، گذری (ظرفِ مکاں)۔۔۔گذری، بھیگی، مضمحل، تازہ، اندوہ گیں، طرب (صفات) وغیرہ۔

اس نظم کا رشتہ ''ہجرت'' سے ہے۔ ہجرت کی کوکھ سے جنم لینے والی ''یادوں'' سے ہے۔ ہر یاد کی تان ایک خواہش پر ٹوٹتی ہے۔ اُس خواہش کا نام ہے ''واپسی''۔ ہجرت کا عمل کوئی آج کا عمل نہیں، حال ہی میں گزرے کسی کل کا عمل نہیں۔ یہ عمل ایک پرانا عمل ہے بہت پرانا عمل۔اس عمل میں تسلسل ہے۔ یہ ابھی کل ہی کی بات ہے جب ایشیائی نسل کے لوگ اُس وقت امریکہ آئے تھے جب ان دونوں براعظموں کے درمیان میں بحرالکاہل نام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نہ تھا۔ آج وہ لوگ ریڈ انڈین کہلاتے ہیں۔

لوگ امریکہ کیوں آتے ہیں؟ بہتر مالی حالات، شادی، سیاسی/مذہب آزادی، زندگی کے تحفظ، معاشرتی/سماجی برتری، اعلیٰ تعلیم، اور یا اپنے اعزّاء واقرباء کی مدد کے لیے وغیرہ وغیرہ۔ شاعرہ پروین شیر کی ہجرت کا تعلق ایک سماجی رسم ہے۔ ''لڑکی بیاہ کر اپنے گھر جاتی ہے وہ گھر جہاں اُس کا شوہر رہتا ہے'' پروین شیر بیاہ کر اپنے دولہا کے پاس ہندوستان سے کینیڈا آئی تھی۔ وہ اس نئے ملک میں برسوں رہنے کے بعد اب اپنے پرانے ملک کی جانب لوٹ جانا چاہتی ہے۔ کیوں؟ (اس نئے ملک میں) ''زندگی اندوگیں ہے'' اس جواز کے دامن میں بہت سے سوالات ہیں۔ وہ سوالات اُس کی ذات کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ معاشرہ سے نہیں خود سے کہتی ہے ''میں شعلہ زاروں سے نکل کر، ابر پاروں کی جانب لوٹ جانا چاہتی ہوں۔ میں ایک بار پھر وہاں جانا چاہتی ہوں جہاں سے میں آئی تھی۔'' جی ہاں، وہ واپس جاسکتی ہے کہ اُس کے پاس ضروری وسائل موجود ہیں۔ لیکن یہ اغلب ہے کہ وہ واپس نہ جائے۔ ایک بنیادی سوال اس کی مجوّزہ خواہش کو برف کے ایک زنداں میں محصور کر دیتا ہے۔

''میں واپس جاؤں بھی تو کس کے پاس؟ انجانے ماحول میں؟ کہ وقت نے بیشتر آشنا چہرے، مٹی کی چادر میں چھپا لیے ہیں''

برف کے اس زنداں میں وہ تمام تارکینِ وطن محصور ہیں، جنھوں نے پردیس کو دیس کہہ کر اپنی زندگیاں گزار لی ہیں۔ یہ مجبوری ایک المیہ ہے، صدیوں پرانا، جاری رہنے والا ایک المیہ۔ یہ المیہ انفرادی ہونے کے باوجود ایک اجتماعی المیہ ہے۔ ''ایک بار پھر'' میں اُسی المیہ کے رُخ سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

پروین شیر! تیری اس خواہش کے پس منظر میں کروٹیں لینے والا کرب، صرف تیرا ہی المیہ نہیں۔ یہ تو زمانوں کا کرب ہے، وہ کرب جس کا کوئی مداوا نہیں۔

''ایک بار پھر'' نامی اس نظم میں یہ شاعرہ خود کلامی کے آئینہ میں، بظاہر صرف اپنا چہرہ دیکھتی ہے، لیکن اس عکس کے پس منظر میں دو اور مخاطب چہرے بھی ہیں۔ معاشرہ، ماحول۔ یہ چہرے پروین شیر کی مجوزہ تمنا کی صراحت کرتے ہیں۔ بقول مصحفی:

ترے کوچہ ہر بہانے، مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

''لکھو کہ نوکِ قلم زندگی سنوارے''

عقیل دانش
(یوکے)

خوش فکر شاعرہ، ژرف نگاہ ناقد، معتبر کہانی کار اور معروف افسانہ نگار رضیہ اسماعیل کی ایک اور تخلیق اردو قارئین کے لیے منظرِ عام پر آ گئی ہے۔ ''مٹی کی آواز'' اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور ''دائروں کا سفر'' افسانچوں کا انتخاب۔ گزشتہ چار دہائیوں سے اُن کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اور وہ نثر و نظم میں اپنی تخلیق کے پھول کھلا رہی ہیں۔ نظم، غزل، قطعات، ماہیے، مضامین، نقد و نظر افسانے اور افسانچے، رپورتاژ، طنز و مزاح انہوں نے ہر میدان میں اپنے نقش ہائے پا ثبت کیے ہیں۔ اور ان نقوش پر کتنے ہی قلمکاروں نے چلنے کی سعادت پائی ہے۔ ایک بہت معتبر، مصروف، ہمدرد اور قابل ذکر سماجی کارکن اُن کی زندگی کا ایک رخ ہے اور دوسرا رُخ اُن کی لوح و قلم سے وابستگی۔ اپنی تنظیم آ گہی کے زیرِ اہتمام انہوں نے فکر و فن کے کتنے ہی چراغ جلائے ہیں اور چمکتی دمکتی محفلوں سے دیارِ غیر میں شعر و ادب کے پیاسوں کی پیاس بجھائی ہے۔ گزشتہ دنوں ''افسانچے'' کی ابتدا پر جو بحث شروع ہوئی تھی اس پر اُن کا تجزیہ آخر مانا جاتا ہے۔ پوپ کہانی یا افسانچے کے انگریزی زبان میں خالق سے اُنہوں نے مذاکرات کر کے اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچا دیا ہے۔ رضیہ اسماعیل کی زیرِ ذکر تخلیق میں افسانوں اور افسانچوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جس میں پھول بھی ہیں، شگفتگی بھی ہے، کانٹے بھی ہیں اور آنسو بھی۔ انسانی نفسیات کے خوبصورت تجزیوں اور معاشرے کے خوبصورت اور تلخ زاویوں نے اس تخلیق کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ اُن کا رواں اسلوب، سادہ لیکن دل میں اُتر جانے والی زبان قاری کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں کہانی ختم کرے۔ ''مٹی کی آواز'' کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

''پتہ نہیں کب چپکے سے فرخ بھائی عینی آپا کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ وہ عینی آپا کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ عینی آپا سے جدائی کا سوچ کر ہی اُن کے چہرے کی رنگت زرد پڑ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا اگر عینی آپا انہیں نہ ملیں تو وہ زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ ادھر عینی آپا کی حالت بھی فرخ بھائی سے کچھ مختلف نہ تھی''

ملاحظہ فرمایا آپ نے محبت کی شدت کو کتنے سادہ اور پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن کے ہر افسانے اور افسانچے کی روح زبان کی سادگی اور تاثر ہے۔ افسانے کے متعلق گزشتہ چند دہائیوں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ انہیں سماجی، نفسیاتی، تجریدی اور علامتی خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ہم ادب کے ایک معمولی قاری ہیں ہمارے خیال میں افسانہ ہو یا افسانچہ اُس کی بنیاد ''حیرت'' ہے۔ افسانہ کا پلاٹ کیسا ہو، کرداروں کو کس طرح پیش کیا جائے، زبان کیسی ہو، دروبست کیا ہو، ہماری دانست میں یہ سب باتیں ہیں۔ اگر آپ کوئی افسانہ شروع کرنے کے بعد اُسے ختم کیے بغیر نہ رہ سکیں اور افسانے کا متحیر کشاں کشاں آپ کو افسانے کے اختتام تک لے جائے اور آپ جانے پر مجبور ہو جائیں تو یہی افسانے یا افسانچے کی خوبی ہے۔ رضیہ نے یہ ''رمز'' پالیا ہے اُن کا ہر افسانہ قاری کو انجام تک پہنچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ یہی اُن کی کامیابی ہے۔ افسانے کی کامیابی کے لیے ''سوچ'' ایک بنیادی امر ہے۔ رضیہ کے افسانے کا اختتام قاری کو زندگی اور رشتوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی امر رضیہ کے افسانوں کو مؤثر اور معتبر بنا دیتا ہے۔ زندگی کے بہت ہی بنیادی حقائق میں امارت اور غربت ہے۔ رضیہ نے اپنے افسانچے میں کتنی خوبصورتی سے اس حقیقت کو قلمبند کیا ہے۔

''زمانہ طالب علمی میں ہمیں ایک مضمون لکھنے کو دیا گیا تھا۔ موضوع تھا ''امیر غریب'' پاکستان ایک امیر ملک ہے مگر یہاں غریب لوگ بستے ہیں'' خیر اُس وقت تو موضوع کی گہرائی کا اندازہ ٹھیک سے نہ ہو سکا مگر برسوں بعد غور کرنا شروع کیا تو سمجھ آئی کہ پاکستان صرف امیر لوگوں کے لیے ہی امیر ملک ہے وگرنہ نانِ جویں کو ترستے ہوئے غریب لوگوں کے لیے تو یہ ملک ہمیشہ سے ہی غریب رہا ہے کیونکہ:

ؔ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

رضیہ نے کتنی خوبصورتی سے ایک بیّن حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔
ہمیں یقین ہے کہ ''مٹی کی آواز۔ دائروں کا سفر'' صاحبانِ علم و ہنر سے داد و تحسین حاصل کرے گا۔ ہم رضیہ صاحبہ سے یہی گزارش کر سکتے ہیں:

ؔ لکھو کہ نوکِ قلم زندگی سنوارے

''سوال''

لوگوں سے وہ سوال نہ کرو جو خدا نے انسانوں سے کرنے ہیں مثلاً:
تمہارا مذہب کیا ہے؟
تم نے عبادت کی؟
تم نے روزہ رکھا؟
لوگوں سے وہ سوال کرو جو انسان کو انسان سے کرنے چاہیے۔ مثلاً
کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے؟
کیا تم بھوکے ہو؟
کیا تمہیں کچھ چاہیے؟

مستنصر حسین تارڑ

''تیرہ بخت دنیا''

اے شریف انسانو

ساحرلدھیانوی

(●)

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی
اس لئے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے
برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے
جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدان کشت وخوں ہی نہیں
حاصل زندگی خرد بھی ہے
حاصل زندگی جنوں ہی نہیں
آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں
جنگ وحشت سے بربریت سے
امن تہذیب و ارتقا کے لئے
جنگ مرگ آفریں سیاست سے
امن انسان کی بقا کے لیے
جنگ افلاس اور غلامی سے
امن بہتر نظام کی خاطر
جنگ بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن بے بس عوام کی خاطر
جنگ سرمائے کے تسلط سے
امن جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن پر امن زندگی کے لیے

○

قلوپطرہ۔۔۔اقتباس

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

وقت کے سیل سے
خوابوں کے جزیرے ابھرے
ہر جزیرے میں نئے شہر کی بنیاد پڑی
ہر نیا شہر بنا
مصر کا تازہ بہروپ
اپنی قسمت کہ ہمیں کوئی زلیخا نہ ملی
ورنہ بازار میں بکنے سے بھی کچھ آر نہ تھا

لوگ کہتے ہیں کہ پتھر سے تراشو اصنام
ہم نے جو بت بھی تراشا
قلوپطرہ میں ڈھلا!
ہم نے جب دل کو ٹٹولا
خلشِ دل کا سبب
پھول کی پتی کی صورت کوئی کانٹا نکلا
حسن کو ہم نے سدا شعلہ بداماں دیکھا
ایک اک جلوے کو مشتاقِ شہیداں پایا

حسنِ قاتل کا فسوں
جس کے ہزاروں بہروپ
اک قلوپطرہ نے کیا کیا نہیں قالب بدلے
ہر زمانے میں نیا روپ، نیا نام رہا
ہم پہ بھی گزری جو اوروں پہ کبھی گزری تھی
حال پوچھو نہیں
سوچو نہیں
''کیا تھے، کیا ہیں''!
دوستو!
تم نے قلوپطرہ کو دیکھا ہے کبھی
مارک انطونی کے لب
آج بھی ہیں نوحہ کناں
اس کی آواز سے اب تک ہیں فضائیں معمور
آج بھی سوچتا ہے جیسے وہ خود اپنا مآل
''دیکھنے دو، مجھے، کیا حال ہے باطن کا مرے
اب بھی کچھ باقی ہیں کیا میری انا کے آثار''

''کوئی اپنا ہوتا''

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کناڈا)

حسرت ہے کوئی اپنا ہوتا
گدگداتا، اٹھکیلیاں کرتا، رُوٹھ جاتا تو مناتا مجھکو
جھانکتا میرے احساس کے دریچوں سے مجھے، سینے سے لگتا، کہتا
کیا ناراض ہو مجھ سے، بولو نا، یوں گُم صُم نہ رہو، یوں چُپ نہ رہو،
جان جاتی ہے تمہیں دیکھتے یوں بیٹھے ہوئے، گا ہے گا ہے
کاش، اے کاش!

مجھکو خوف نہیں تنہائی کا، نہ ہی ڈستا ہے اکیلا پن بھی کبھی
ایک حسرت ہے، کوئی اپنا ہوتا، میرا اپنا،
تڑپ اُٹھتا مجھ میں اُترنے کے لیے، روح میں سرائیت کرتا،
کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔
جسے بھی چاہا، ٹوٹ کر چاہا میں نے، کہ سرشت میں ہے ایک لافانی
جذبۂ الفت، محبت، لامتناہی محبت۔ پھر بھی آج کوئی نہیں
جسکو میں اپنا کہوں، سرتاپا مکمل میرا اپنا ہو۔
مجھکو محسوس کرے، میرے درد کی تہہ ناپے، میرے اندر جھانکے
مگر کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔۔!!

☆

علم و کمال

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

وہم و گمان کی دنیا، خواب و خیال کی دنیا
حسن و جمال کی دنیا، ہجر و وصال کی دنیا
اب تُو عطا ہمیں کر اے محسن و معطیِ اعلیٰ
حکمت و علم و حقائق اور کمال کی دنیا

○

لہو کا پرچم

یونس شرر
(نیویارک)

کروڑوں سالوں کے ارتقاء سے
میں دیکھو، نیچے اُتر رہا ہوں
گزشتہ صدیوں کی ساعتوں کے
پُرانے کپڑے بدل رہا ہوں
میں ایک ایسا چراغِ شب ہوں
ہوا کے ہاتھوں پہ جل رہا ہوں
کہ امنِ عالم کی مجلسوں میں
سلامتی کی نئی حدیں ہیں
زمین چھینو! اسیر کر لو
نئے قواعد ، نئی شقیں ہیں
جمع و تفریق کے عمل نے
گماں کو ممکن بنا دیا ہے
اُصول اور ضابطوں پر
نیا سکندر بٹھا دیا ہے
تعین کردہ، فیصلوں کی
قرار دادیں بھی رد ہوئی ہیں
نوکیلے بوٹوں کی آہٹیں پھر
اُداس نسلوں کو کر گئی ہیں
عظیم انساں کا فکر و فن بھی
پرانے سکّوں میں ڈھل رہا ہے
نظامِ نو کی گردشوں میں
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے
حصارِ ایسے کھنچے ہوئے ہیں
کہ مقتلوں سے گزر رہا ہوں
مجاز، تاجر بنے ہوئے ہیں
لہو کا پرچم لئے کھڑا ہوں
فضا کو مصلوب کر دیا ہے
ہوا کو معتوب کر دیا ہے

بہت ہو چکا

مشیر طالب
(نیویارک)

بہت ہو چکا ، یہ غضب ہو چکا
یہ کرب و بلا بے سبب ہو چکا
مگر اب یہ سب کچھ نہ ہم ہونے دیں گے
بڑھو گے تمہارے قدم توڑ دیں گے!
لڑائی سے ہم کو محبت نہیں ہے!
تمہیں شانت رہنے کی عادت نہیں ہے
یہ عادت تمہاری تمہیں لے نہ ڈوبے!
ہمارا غضب یہ تمہیں نہ ڈبو دے!
ہے تنبیہہ ہماری نہ ہم سے الجھنا!
الجھ ہی گئے گر تو پھر یاد رکھنا!
اماں نہ ملے گی پھر جگت میں!
نہ متھرا نہ کاشی نہ پھر ہندودت میں!
ہماری تمہاری بھلائی ہے اس میں!
کہ وہ بات چھوڑیں لڑائی ہے جس میں
تمہارا ، تمہیں دھرم محبت سکھائے!
ہمارا بھی مذہب یہی کچھ بتائے!
لڑائی چھڑی تو رکے نہ رُکے گی
فقط دونوں پاسے یہ جنتا مرے گی!
لڑائی کسی بات کا حل نہیں ہے
یہ پیاسے کو پانی کا بادل نہیں ہے!۔

○

زمینی صحیفہ

علی محمد فرشی
(راولپنڈی)

سُرخ بتی بجھ چکی تھی
گاڑیاں کالی سڑک کو روندتی
آگے گزرتی جا رہی تھیں
اور میں اب تک وہیں
ہارنوں کے شور میں
جامد
کھڑا تھا
جیسے میرے پاؤں پر
فالج کا حملہ ہو گیا ہو

آسمانی شرٹ پہنے
ایک لڑکا
پنسلیں ہاتھوں میں تھامے
یوں کھڑا تھا
جیسے اُسکی پنسلیں
تقدیرِ آدم لکھ چکی ہوں
اور اُس کا نام لکھنا رہ گیا ہو

میں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا
اور اس میں سینت کر رکھی کرنسی
اس کے سر پر وار دی
لیکن ابھی تک پاؤں میرے
اور اب تو انگلیاں بھی۔۔۔

○

حج پہ حج

شوق انصاری
(فیصل آباد)

اِن کی نیّت میں کجی
حج پہ حج حج پہ حج
سال بھر لُوٹ کر
چل دیے رب کے گھر
خاک مذہب کی لگی
حج پہ حج حج پہ حج
بغض میں مبتلا
ساختہ پارسا
سب بناوٹ کی دھج
حج پہ حج حج پہ حج
کیا فخر مال پر
شرم کر حال پر
بے محابانہ سج
حج پہ حج حج پہ حج

○

کچھ تو ہیں زمانے کے

تسنیم کوثر

(لاہور)

زندگی کے ماتھے پر
درد کی لکیروں نے
جال سا بنا ہے جو
اُس کے تانے بانے میں
غم کے شامیانے میں
رنگ بے وفائی کے
پھول نارسائی کے
بے حسی کی گرمیوں میں
رتجگوں کے موتی ہیں
اور دکھوں کی جھالر میں
ٹنکے ہوئے جو تارے ہیں
کچھ تو ہیں زمانے کے
اور کچھ تمہارے ہیں

○

برسات کے دن اور بازیافت

شہاب محمد الطاف

(حیدرآباد، دکن)

وہ دن رات بڑے کٹھن تھے
نہ دن ہی اپنے تھے، اور نہ رات ہی اپنی تھی
ہر طرف وحشت کا عالم تھا
بڑی آزمائش تھی، گرما کا موسم تھا
پھر دن بدلے، ساون آیا
بادل گرجے، پانی برسا
کھیت لہلہائے، لوگ مسکرائے
ایک خوشی کی لہر چھائی، کہ برسات کے دن آئے
ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئی
دھوپ سے جلی آنکھوں نے راحت پائی
اس بار موسم کیا بدلا تھا
حالات بھی کروٹ لینے لگے
لوگ بازیافت کی بات کرنے لگے
اپنی لٹتی ہوئی میراث پر رشک کرنے لگے
اور ہر دل میں ایک آرزو سمانے لگی
کہ جیسے برکھا کے آنے سے فضا خوشگوار و رنگین ہونے لگی
اُسی طرح اگر لوگ جاگیں گے تو بازیافت ہوگی
اپنے عظیم اقدار کی، لٹتی ہوئی میراث کی
جس کے نگہبان کوئی نہیں
مشرق میں نہیں مغرب میں نہیں کہیں بھی نہیں

○

ایک صدی کا قصّہ

مدھو بالا

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

مدھو بالا کو ہندی فلموں کی وینس کہا جاتا تھا۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی۔ اُسکا اصلی نام ممتاز تھا۔ اُسکا باپ عطا اللہ خان پشاور کی امپیریل تمبا کو کمپنی میں کام کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک فقیر عطا اللہ خان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اُسکی نگاہ چھوٹی ممتاز پر پڑی۔ اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ اُسکے منہ سے نکل گیا کہ یہ لڑکی بڑی نصیب والی ہے۔ اسے بہت عزت، بہت شہرت، بہت دولت غرض اسے وہ سب کچھ ملے گا جسکی ہر انسان تمنا کرتا ہے مگر یہ زیادہ دنوں تک اُن سب چیزوں کا لطف نہیں اُٹھا پائے گی کیونکہ اسکی زندگی بڑی مختصر ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ فقیر چلا گیا۔ گھر والوں نے اسے دیوانے کی بڑ سمجھ کر بھلا دیا۔ اسی بیچ عطا اللہ خان کی نوکری کسی وجہ سے چھوٹ گئی اور وہ اپنے بال بچوں کو لے کر دلّی چلے آئے۔ تمام تر کوشش کے باوجود یہاں بھی عطاء اللہ خان کا دھندا نہ چلا تو مشہور موسیقار مدن موہن کے والد نے مدھو بالا کو آکاش وانی ریڈیو دلّی پر بچوں کے پروگرام میں کام دلوا دیا مگر اُن پیسوں سے روٹی روزی چلنا دشوار تھا۔ لہٰذا مدن موہن کے والد کے مشورے اور راہنمائی پر عطاء اللہ خان فلمی دنیا میں قسمت آزمانے کے لیے بمبئی چلے آئے۔ بمبئی میں اس خاندان کا قیام شہر سے دُور ڈاک یارڈ کے علاقہ میں تھا۔ ابھی کچھ روز ہی بمبئی میں قیام کے گزرے تھے کہ ڈاک یارڈ کے علاقہ میں آگ بھڑک اُٹھی جس نے آن کی آن میں ساری کھولیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بڑے اور نوجوان تو کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو گئے مگر عطاء اللہ خان کی تین بچے جل کر خاکستر ہو گئے۔ اگر اُس روز مدھو بالا فلم دیکھنے نہ گئی ہوتی تو انڈین سینما کی ایور گرین کوئین مدھو بالا کے متوالے اپنی من پسند ہیروئن سے محروم رہ جاتے۔

اُسوقت مدھو بالا کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ عطا اللہ خان نوکری ڈھونڈنے کے سلسلے میں اکثر فلمی اسٹوڈیوز کا طواف کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ مدھو بالا کو بھی لے کر جاتا تھا۔ مدھو بالا تب نو سال کی تھی جب اُسے فلم ''بسنت'' میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس فلم کی ہیروئن ممتاز شانتی تھی اس لئے مدھو بالا کو اس فلم میں بے بی ممتاز کا نام دیا گیا۔ اس فلم کے بعد اُس نے کیدار شرما کی فلم ''نیل کمل'' سائن کی جس میں اُسکا ایک چھوٹا سا رول تھا۔ اس فلم میں ہیروئن کا رول کیدار شرما کی بیوی ادا کرنے والی تھی۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ فلم کی شوٹنگ شروع ہونے سے قبل ہی اُس کی موت ہو گئی۔ مدھو بالا چونکہ اس فلم میں کام کر رہی تھی اسلئے اُس نے فلم کے سارے ڈائیلاگ ازبر کر لئے تھے۔ کیدار شرما کو نہ جانے اس لڑکی میں کیا خوبی نظر آئی کہ اُسنے کسی اور ہیروئن کو لینے کی بجائے اس کم سن لڑکی کو ہی ہیروئن بنا ڈالا۔ اُس وقت اس لڑکی کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ یہ فلم کچھ خاص کمال نہ دکھا سکی۔ مدھو بالا کی قسمت کا ستارہ پھر گم نامی کی کالی بدلیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

کمال امروہی اشوک کمار کے لئے ایک فلم ڈائرکٹ کرنے والے تھے جس کا نام ''محل'' تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں تھے جو دیکھنے میں بڑی معصوم لگے پر ہو بڑی خوبصورت۔ وہ کسی نئی ہیروئن کو ''محل'' میں کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔ ایک دن کمال امروہی کی ملاقات مدھو بالا سے ہو گئی۔ اُسے یہ لڑکی ہر زاویے سے اپنی فلم کے لئے موزوں لگی سو اُسنے مدھو بالا کو ''محل'' میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم نے مدھو بالا کی قسمت ہی بدل کے رکھ دی۔ فلم سپر ہٹ ہو گئی۔ مدھو بالا کو اس فلم سے بے پناہ شہرت ملی۔ اس فلم سے دو ستاروں کا جنم ہوا۔ ایک مدھو بالا، دوسری لتا منگیشکر۔ کہتے ہیں نا کہ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ اس فلم کے ساتھ ہی مدھو بالا کا حسن اس حد تک نکھر گیا کہ وہ وینس کہلائی جانے لگی۔ بقول شمی کپور کے کہ جب وہ پانی پیتی تھی تو وہ اُسکے گلے سے پانی اُترتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ اتنی گوری تھی وہ۔ دلیپ صاحب سے مدھو بالا کی پہلی ملاقات ''جوار بھاٹا'' کی کاسٹنگ کے دوران ہوئی تھی۔ بمبئی ٹاکیز کی روح رواں دیویکا بوس اس لڑکی کی فنی صلاحیتیں دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔ یہ دیویکا رانی ہی تھی جس نے اُسکا نام ممتاز سے بدل کر مدھو بالا رکھ دیا تھا۔ پہلے اُسے فلم ''جوار بھاٹا'' میں لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا مگر بعد میں پتا نہیں کیا ہوا کہ اُن کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ شاید اُسکی کم سنی کی وجہ سے۔

مدھو بالا کی پہلی ملاقات دلیپ کمار سے بمبئی ٹاکیز کے اسٹوڈیو میں ہی ہوئی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس شرمیلے اور مدماتی آنکھوں والے نوجواں کو پسند کرنے لگی تھی۔ بس یہ افسوس رہا کہ وہ دلیپ کمار کے ساتھ کام نہ کر پائی۔ اُسکی یہ آرزو بہت جلد پوری ہو گئی جب اُنہیں فلم ''سنگھار'' کے لئے سائن کیا گیا۔ اس فلم کی کئی ریلیں بنیں مگر یہ فلم پوری نہ ہو سکی اور یہ فلم ڈبے میں پڑی رہ گئی۔ کئی سال بیتے۔ دلیپ کمار اور مدھو بالا خاصی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ اسی بیچ اُنہیں فلم ''ترانہ'' کے لئے سائن کیا گیا۔ اُس وقت مدھو بالا اٹھارہ سال کی نوخیز کلی تھی جس پر شباب ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ اس فلم میں وہ ایک دوسرے کے بیحد قریب آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن مدھو بالا نے اپنی ہیر ڈریسر کے ہاتھ اُردو میں لکھا ایک رقعہ اور ایک گلاب کا پھول دلیپ صاحب کو بھیجا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا کہ اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو یہ پھول قبول کیجئے۔ دلیپ صاحب نے جب یہ چٹ کھول کے پڑھی تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ اُن کے سان گمان میں نہ تھا کہ مدھو بالا اس طرح اُن سے اپنے پیار کا اظہار کرے گی۔ دلیپ صاحب نے اس چھٹی کا مثبت جواب دے دیا۔ اس طرح یہ دو ستارے پیار کی ڈور میں بندھ گئے۔

''ترانہ'' کی فلم بندی کے دوران ان کا پیار پروان چڑھتا گیا۔ اس فلم کی خوبی یہی ہے کہ اس میں جتنے بھی رومانٹک سین ہیں وہ اتنے اچھوتے اور

حقیقت افروز ہیں کہ دیکھنے والے مسحور ہوکر رہ جاتے ہیں۔ادھر وہ دلیپ کمار کے عشق میں گرفتار ہوچکی تھی اور اُدھر پریم ناتھ مدھو بالا کے پیار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ دونوں اچھے دوست تھے۔مدھو بالا جب صبح صبح سیر پر نکلتی تھی تو وہ نکلنے سے پہلے پریم ناتھ کے ساتھ فون پر بات کرتی تھی اور اُسے صبح کی ورزش کرنا یاد دلاتی تھی۔پریم ناتھ مدھو بالا کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔وہ مدھو بالا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔جب اُس نے دیکھا کہ مدھو بالا دلیپ کمار کی چاہ میں اسقدر ڈوب چکی ہے کہ اس نام کے سوا اُسے اور کوئی نام سنائی نہیں دیتا تو وہ اُن کے بیچ سے ہٹ گیا۔دونوں ایک دوسرے کی چاہ میں اس حد تک دیوانے ہو چکے تھے کہ ایک دن بھی وہ ایک دوسرے سے ملے بنا رہ نہیں پاتے تھے۔مدھو بالا کا باپ عطا اللہ خان سائے کی طرح بیٹی کے ساتھ پھرتا رہتا تھا۔اُس نے مدھو بالا پر ڈھیر ساری پابندیاں عائد کر کے رکھی تھیں۔اُسنے اپنی بیٹی کو ایسے دبا کے رکھا تھا کہ وہ اُسکے کسی بھی فیصلے کے خلاف چوں بھی نہیں کر پاتی تھی۔دلیپ کمار تو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔وہ اور مدھو بالا چھپ چھپ کر مل لیا کرتے تھے۔ستارہ دیوی کا کہنا ہے کہ جب بھی اُنہیں ملنا ہوتا تھا تو وہ اپنے ایک دوست سوشیلا رانی پٹیل یا کے آصف کے گھر پر مل لیا کرتے تھے۔اُن دنوں کے آصف ستارہ دیوی کے ساتھ رہتا تھا۔جب یہ دونوں وہاں آجاتے تھے تو کے۔آصف اور ستارہ دیوی باہر چلے جاتے تھے اور ان دو پریمیوں کو اکیلے چھوڑ دیا جاتا تھا۔یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلتا رہا۔اُنہوں نے اپنے معاشقے کو اس طرح چھپا کے رکھا تھا کہ اُنکے رومانس کی خبر دو چار لوگوں تک ہی محدود تھی۔پہلی بار وہ ایکساتھ فلم ''انسانیت'' کے پریمیئر میں دیکھے گئے تھے۔دلیپ کمار اُسے اپنے ساتھ پریمیئر پر لے آئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب مدھو بالا پونے میں فلم ''نقاب'' کی شوٹنگ کر رہی تھی تو دلیپ کمار بمبئی سے پونے چلا جاتا تھا اپنے دلبر سے ملنے کے لئے۔وہ جب فلم ''انسانیت'' کی شوٹنگ مدراس میں کر رہا تھا تو وہ عید کا تیوہار مدھو بالا کے ساتھ منانے کے لئے ہوائی جہاز سے بمبئی آگیا تھا اور عید منا کر واپس چلا گیا تھا۔مدھو بالا اگر بمبئی میں شوٹنگ کر رہی ہوتی تو وہ اُسے دیکھنے کے لئے سیٹ پر آجاتا تھا۔وہ اُسے ایک گلاب کا پھول پیش کرتا۔تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ کر اُسے نہارتا اور پھر خاموشی سے چلا جاتا تھا۔یہ چند لمحے مدھو بالا کو بے پناہ خوشی اور بے پایاں کیف وسرور دے جاتے تھے۔

عطا اللہ خان کے لئے مدھو بالا سونے کا انڈے دینے والی مرغی تھی۔یہ مدھو بالا ہی تھی جس نے ایک مڈل کلاس فیملی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی تھی۔عطا اللہ خان کے پاس سب کچھ تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس سے عیش وعشرت کے سامان چھن جائیں۔جب اُس تک یہ خبر پہونچی کہ مدھو بالا دلیپ کمار سے پیار کرتی ہے تو اُسکے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔اُسے لگا کہ پنچھی پر تولنے لگا ہے۔اس سے پہلے کہ یہ سونے کی چڑیا پھُر ہو جائے اُسنے مدھو بالا پر ڈھیر ساری پابندیاں نافذ کیں۔وہ اُس پر اسقدر حاوی ہو چکا تھا کہ وہ اُسکی مرضی کے خلاف ایک قدم نہیں اُٹھا سکتی تھی۔دلیپ کمار عطا اللہ خان کو قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔وہ اُسے پٹھان ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔عطا اللہ خان کا وطیرہ کچھ اس طرح کا تھا کہ کوئی بھی اُس سے خوش نہ تھا۔وہ تو کبھی کبھی اپنے سایے پر بھی شک کرنے لگتا تھا۔دلیپ صاحب چاہتے تھے کہ مدھو بالا اس بندھن سے اپنے آپ کو آزاد کر لے مگر مدھو بالا نے اپنے آپ کو اس بندھن میں کچھ اس طرح سے جکڑ کے رکھا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنے آپ کو اس بندھن سے آزاد نہیں کر پا رہی تھی۔دلیپ کمار نے اُسے کتنی بار اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنے پر اُکسایا مگر وہ باپ سے اسقدر خائف تھی کہ پیار کی شدت بھی اُس کے ڈگمگاتے ارادوں میں گرمی نہ بھر سکی۔وہ ہر بار دلیپ صاحب کے سامنے لاچاری ظاہر کرتی۔وہ اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔وہ ایک جذباتی لڑکی تھی۔وہ اپنے پریوار سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔وہ اپنے پریوار کو ہر طرح سے شاد اور آباد دیکھنا چاہتی تھی اور اُسکے بعد ہی وہ دلیپ کمار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔دلیپ صاحب مدھو بالا کی ان دلائل سے برہم ہو اُٹھتے تھے۔

مدھو بالا دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔وہ جتنا پیار دلیپ صاحب سے کرتی تھی اُس سے کہیں زیادہ وہ اپنے پریوار کو بھی چاہتی تھی۔دلیپ صاحب نے اُس کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے تو اُسے اپنے پریوار کے ساتھ سارے رشتے ناتے توڑنے ہونگے تبھی وہ اُس کا ہاتھ تھام سکتی ہے۔مدھو بالا کو اپنے پریوار سے لاتعلق ہونا کسی بھی قیمت پر منظور نہ تھا۔دلیپ کمار عطا اللہ خان کی فطرت سے واقف تھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مدھو بالا کو اُسکی زندگی میں آنے نہیں دے گا اسلئے مدھو بالا کے باپ کا منہ بند رکھنے کے لئے جب دلیپ صاحب نے اپنی پہلی فلم ''گنگا جمنا'' بنانے کا اعلان کیا تو اس فلم کے ساتھ یہ طے کیا کہ جو بھی اس فلم سے منافع ہوگا وہ ساری کی ساری رقم وہ عطا اللہ خان کو دے دیں گے۔مدھو بالا اس بات سے بھی راضی نہ ہوئی۔مدھو بالا کا یہ ڈھلمل پن دلیپ کمار کے اضطراب اور بے قراری کو اور زیادہ بڑھا رہا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ سن 1956 میں فلم ''ڈھاکے کی ململ'' کی شوٹنگ چل رہی تھی، جو کہ اوم پرکاش کی ذاتی فلم تھی جسمیں مدھو بالا کے ساتھ اوم پرکاش بھی کام کر رہا تھا۔اوم پرکاش کو دلیپ صاحب اوم بھیا کہہ کر بلاتے تھے۔وہ اُسے اپنے سگے بھائی کی طرح مانتے تھے۔دلیپ صاحب گھر سے یہ ٹھان کے نکلے تھے کہ آج وہ مدھو بالا سے مل کر شادی کے بارے میں حتمی فیصلہ لے لیں گے۔وہ گھر سے نکل کر سیدھے مدھو بالا کے میک اپ روم میں پہونچ گئے۔ دلیپ کمار نے سیٹ پر بیٹھے اوم پرکاش کو نیچے مدھو بالا کے میک اپ روم میں آنے کا بلاوا بھیجا۔اوم پرکاش جب میک اپ روم میں پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ دلیپ کمار اور مدھو بالا کمرے میں بیٹھے تھے۔دونوں کافی تناؤ میں نظر آرہے تھے۔ دلیپ صاحب نے اوم پرکاش کو بیٹھنے کے لئے کہا۔اوم جی جب بیٹھ گئے تو دلیپ صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ آج جو فیصلہ لینے والے ہیں وہ اُسکے گواہ بنے رہیں

گے۔اسکے بعد اُس نے مدھو بالا سے کہا کہ اُسے اسی وقت اُسکے ساتھ اُسکے گھر پر چلنا ہوگا جہاں ایک قاضی بیٹھا اُنکا انتظار کر رہا ہے۔اُسے آج ہی اُسکے ساتھ ازدواجی رشتے میں بندھنا ہوگا اس شرط کے ساتھ کہ اُسے اپنے گھر والوں سے سبھی رشتے ناتے توڑنے ہونگے اور آج کے بعد وہ پھر کبھی اپنے باپ سے نہیں ملے گی۔مدھو بالا کو یہ شرط کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔دلیپ صاحب نے اُسے متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اس بار اُسکے ساتھ چلنے کو راضی نہ ہوئی تو یہ اُنکی آخری ملاقات ہوگی۔اس کے بعد وہ پھر کبھی اُسکی زندگی میں لوٹ کر نہیں آئے گا۔مدھو بالا خاموشی کی مورت بنی بیٹھی رہی۔جب اُسکی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملا تو دلیپ کمار اپنا آپا کھو بیٹھے۔وہ غصے سے اُٹھ کر چلے گئے۔آٹھ سال کے پیار کا رشتہ ایک پل میں ختم ہوگیا اور اوم پرکاش بے بسی اور لاچارگی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

عطا اللہ خان اب پہلے سے بھی زیادہ سخت اور محتاط ہوگیا تھا۔وہ ایک پل بھی اپنی بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔کہتے ہیں کہ ایک بار آر کے کرنجیا نے اپنے فلمی میگزین میں مدھو بالا کی کور فوٹو چھاپی۔یہ فوٹو ہالی وڈ کے ایک پروڈیوسر نے دیکھی۔وہ اس تصویر کو دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ وہ اس لڑکی کو ہالی وڈ کی فلم میں لینے کے لئے بے چین ہوگیا۔جب آر۔کے۔کرنجیا یہ خوشخبری لے کے عطا اللہ خان کے پاس پہونچا تو اُس نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اُسکی بیٹی چھچ کانٹے کا استعمال کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہے۔چھچ کانٹا محض ایک بہانہ تھا۔وہ اپنی بیٹی کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دلیپ کمار اور مدھو بالا الگ ہونے کے باوجود کئی بار ملے۔وہ عطا اللہ خان سے نظر بچا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔بی آر چوپڑہ نے ان دونوں کو اپنے بینر تلے بننے والی پہلی فلم کے لئے سائن کیا تھا۔اس فلم کا نام ''نیا دور'' تھا۔اس فلم کا چالیس دن کا آوٹ ڈور شوٹنگ شیڈول بھوپال میں شوٹ ہونا تھا۔یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا کہ آخری وقت عطا اللہ خان نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکایا۔اُس نے بی۔آر۔چوپڑہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مدھو بالا بمبئی سے باہر نہیں جائے گی۔اگر اُسے مدھو بالا کے ساتھ شوٹنگ کرنی ہے تو بمبئی میں سیٹ لگا کر کرے۔بی۔آر۔چوپڑہ فلم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے تھے اسلئے وہ بضد رہا کہ مدھو بالا کو بھوپال چلنا ہی ہوگا۔جب عطا اللہ خان نے دیکھا کہ اُس پر پانسہ اُلٹا پڑ رہا ہے تو اُس نے بی۔آر۔چوپڑہ پر یہ الزام لگایا کہ اُس نے یہ شوٹنگ شیڈول اپنے ہیرو دلیپ کمار کے کہنے پر بھوپال میں رکھا ہے تا کہ وہ اُسکی بیٹی کے ساتھ کھل کر رومانس کر سکے۔بی۔آر۔چوپڑہ عطا اللہ خان کی اس بہتان تراشی سے کافی برہم ہوا۔بات اتنی بڑھ گئی کہ چوپڑہ کو مدھو بالا کو فلم سے الگ کرنا پڑا اور اُسکی جگہ وجینتی مالا کو لینا پڑا۔عطا اللہ خان بی۔آر۔چوپڑہ کی اس حرکت سے اسقدر تلملا اُٹھا کہ اُسنے بی۔آر۔چوپڑہ پر مقدمہ دائر کر دیا۔چوپڑہ نے بھی جوابی کیس دائر کر دیا۔بی۔آر۔چوپڑہ کا کیس کافی مضبوط تھا۔اُس نے مدھو بالا کے ساتھ تحریری معاہدہ کیا تھا۔اس معاہدے کی خلاف ورزی اُس نے کی تھی اس لئے اُس پر حرجانہ عائد ہوتا تھا۔یہ مقدمہ اُن دنوں کافی دلچسپی کا باعث رہا۔سینکڑوں لوگ عدالت کی کاروائی دیکھنے کے لئے صبح سویرے ہی عدالت میں پہونچ جاتے تھے۔دلیپ کمار کو بحیثیت گواہ اس کیس میں آنا پڑا۔اُسنے بھری عدالت میں وہ سب کچھ کہا جو سچ تھا۔اُس نے مدھو بالا پر معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کا الزام عائد کیا۔اُس نے جو کچھ بھی مدھو بالا کے خلاف کہا وہ سن کے مدھو بالا بھونچکی رہ گئی۔اُسنے اپنے وکیل آر۔ڈی۔چڈھا سے کہا کہ یقین نہیں آتا کہ کٹہرے میں جو شخص میرے خلاف زہر اُگل رہا ہے یہ وہی شخص ہے جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا۔یہ وہی آدمی ہے جس پر میں نے اپنا تن من نچھاور کر دیا۔دلیپ صاحب بولتے چلے گئے۔جب مدھو بالا کے وکیل نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ بھول گیا کہ جس کے خلاف وہ الزام تراشی کر رہا ہے یہ وہی عورت ہے جو کبھی اُسکے دل کا سرور بنی ہوئی تھی۔جس سے وہ بے پایاں پیار کرتا تھا۔جواب میں دلیپ کمار نے کہا کہ وہ مدھو سے پیار کرتا تھا، پیار کرتا ہے اور زندگی کے آخری لمحے تک کرتا رہے گا۔

مدھو بالا کیس ہار گئی۔عدالت کے فیصلے سے ان دو پریمیوں کے ملن کی آخری اُمید بھی معدوم ہوگئی۔دونوں ایک وسرے سے بہت دور چلے گئے۔مدھو بالا دوہرے غم سے دوچار تھی۔ایک طرف عدالت کا فیصلہ اُنکے خلاف گیا تھا، دوسری طرف دلیپ کمار سے اُسکا رشتہ ختم ہوگیا تھا۔دونوں اب بھی ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔مدھو بالا تھی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پھنسی ہوئی تھی۔دلیپ کمار اب بھی اُس سے شادی کرنے کے لئے تیار تھے مگر اس مرتبہ مدھو بالا نے یہ شرط باندھ لی کہ اُسے اُسکے باپ سے معافی مانگنی ہوگی۔دلیپ کمار خود ایک ضدی پٹھان تھے۔وہ بھلا عطا اللہ خان کے آگے کیسے جھکتے۔بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

ایک دن اُسنے فلم فیئر کے رپوٹر بنی روبن کو انٹرویو کے لئے گھر پر بلا لیا۔اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب بھی وہ مدھو بالا سے ملتا تھا تو اسٹوڈیو میں ہی دونوں کی ملاقات ہوجاتی تھی۔یہ پہلا موقع تھا جب اُسے اسٹوڈیو کی بجائے گھر پر ملنے کے لئے کہا گیا تھا۔گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے سیدھے مدھو بالا کے بیڈ روم میں پہونچا دیا گیا جہاں مدھو بالا درد و غم کی مورت بنی بیٹھی تھی۔یہ ملاقات دو گھنٹے تک چلی۔اس انٹرویو میں وہ بس اپنے یوسف کے بارے میں بولتی رہی۔وہ بنی روبن کی معرفت دلیپ کمار تک یہ پیغام پہونچانا چاہتی تھی کہ وہ آج بھی اُس سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔وہ اسقدر ٹوٹ چکی تھی کہ انٹرویو کے آخیر میں وہ بنی روبن کے کاندھے پر سر رکھ کر بچے کے مانند پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

بنی روبن نے دلیپ کمار تک مدھو بالا کا یہ پیغام پہونچانے کی سر توڑ کوشش کی۔دلیپ کمار تھے کہ مدھو بالا کے بارے میں کچھ بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔بنی روبن نے ایک دن موقع دیکھ کر دلیپ کمار کو گھیر لیا۔اُس نے دلیپ کمار سے کہا کہ مدھو بالا آج بھی اپنے دل میں تمہارے لئے پیار کی مشعل جلائے

بیٹھی ہے۔ جواب میں دلیپ کمار نے بڑے روکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں کہا کہ کونسی مشعل اور کیسا پیار۔ یہ وہ زمانہ نہ تھا جب چھوٹی سی بات کو بھی میڈیا اُچھال دیتا ہے۔ بنی روبن نے ساری باتیں اپنے دل میں دبا کے رکھیں۔

مدھو بالا کی دنیا دیوانی تھی جب کہ وہ اپنے یوسف کی دیوانی تھی۔ اب وہی یوسف اُسکا نام لینے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ جانے مانے رائٹر ابرار علوی کا کہنا ہے کہ جب وہ فلم ''مسٹر اینڈ مسز 55'' کی شوٹنگ محبوب اسٹوڈیو میں کر رہے تھے تو اُنہیں ایک سین میں ایک فوٹو گرافر کی ضرورت پڑ گئی۔ اُنہوں نے کسی اسسٹنٹ کو سٹوڈیو سے کوئی تصویر لانے کے لئے بھیج دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ جو فوٹو لے کر آیا تھا وہ کسی اور کی نہیں بلکہ دلیپ کمار کی تھی۔ مدھو بالا نے وہ فوٹو دیکھ کر شوٹنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُسکا کہنا تھا کہ وہ یہ تصویر دیکھ کر سین پر دھیان نہیں دے پائے گی۔ یہ عالم تھا عشق کا۔ وہ اپنے پریتم کے نام کی مالا جپ رہی تھی جب کہ اُسکے چاہنے والوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو مدھو بالا پر بری طرح فریفتہ تھے۔ بھٹو بمبئی کے ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بمبئی میں اُنکی کروڑوں کی جائیداد تھی۔ وہ مدھو بالا پر اسقدر فریفتہ ہو چکے تھے کہ وہ سویرے سویرے ''مغل اعظم'' کے سیٹ پر پہونچ جاتے تھے اور گھنٹوں مدھو بالا کو نہارتے رہتے تھے۔ بھٹو بڑے خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ وہ دلفریب باتوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ بھٹو پیشے سے وکیل تھے اور وکیل تو باتوں کے دھنی ہوتے ہیں۔ مدھو بالا بھٹو کی باتوں پر خوب ہنسا کرتی تھی۔ اُسے اُسکی بذلہ سنجی پسند تھی۔ وہ اُس کے ساتھ پوری طرح سے گھل مل چکی تھی۔ وہ کبھی ساتھ میں بیٹھ کر لنچ کرتے تھے۔ کبھی وہ بھٹو کے چٹکلوں پر بے تحاشا قہقہے لگاتی تھی۔ بھٹو شادی شدہ تھے۔ اُنکی پہلی بیوی شیرین بیگم لاڑکانہ (سندھ) کے ایک امیر زمیندار کی بیٹی تھیں جب کہ دوسری بیوی نصرت ایک ایرانی لڑکی تھی۔ وہ مدھو بالا کو بھی اپنی زوجیت میں لینا چاہتے تھے۔ وہ پہلے ہی لاڑکانہ اور کراچی کے چکر لگایا کرتے تھے۔ مدھو بالا سے اگر اُسکی شادی ہو جاتی تو اُنہیں سندھ کے ساتھ ساتھ بمبئی کے بھی چکر لگانے پڑتے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ مدھو بالا نے شادی کی پیشکش ٹھکرا دی کیونکہ وہ دلیپ کمار سے الگ ہونے کے باوجود اب تک اُسے بھلا نہیں پائی تھی۔

فلم ''مغل اعظم'' کا معاہدہ مدھو بالا نے سن 1950 میں کے۔ آصف کے ساتھ کیا تھا، جب اُنکا رومانس پورے شباب پر تھا۔ فلم کو مکمل ہونے میں دس برس لگے۔ ان دس برسوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ مدھو بالا اور دلیپ کمار الگ ہو چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ کے۔ آصف کے لئے سب سے کٹھن اور صبر آزما کام یہی تھا کہ وہ اپنے ہیرو ہیروئن سے کام کیسے لیں جن کی آپس میں بول چال بند تھی۔ وہ دونوں مخالف سمت سے سیٹ پر آ جاتے تھے۔ اپنے اپنے ڈائیلاگ یاد کرتے تھے اور شاٹ دے کے اپنے اپنے میک اپ روم میں چلے جاتے تھے۔ عطا اللہ خان سیٹ پر ایک چوکیدار کی طرح ہر پل موجود رہتا تھا۔ اُسکی عقابی نظریں ہر آن مدھو بالا پر ٹکی رہتی تھیں۔ ایسے حالات میں سمجھوتہ ہونا تو دور وہ ایک دوسرے کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مدھو بالا کے چہرے پر دلیپ صاحب کو مور پنکھ پھیرنے والا سین کرنا تھا تو کے۔ آصف یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ عطا اللہ خان یہ سین ہونے نہ دے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی اڑچن کھڑی کر دے گا اسلئے اُس نے اپنے پروڈکشن منیجر جمنا داس گاندھی کو اشارہ کیا کہ وہ اس بڈھے کو تاش میں تب تک اُلجھائے رکھے جب تک یہ سین پورا نہیں ہوگا۔ عطا اللہ خان تاش کھیلنے کا بڑا شوقین تھا۔ کے۔ آصف نے وہ سین حسب پسند بغیر کسی تعطل کے فلمبند کیا۔

مدھو بالا کو دل کا روگ لگ چکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ اُن دنوں آج کی طرح ساری سہولیات فراہم نہ تھیں کہ ایک ہی نشت میں روگ کا پتا لگایا جا سکے۔ مدھو بالا کی بیماری کی شروعات فلم ''بہت دن ہوئے'' کے سیٹ پر ہوئی تھی جب اُس نے خون کی اُلٹی کر دی تھی۔ گھر والوں نے ہمیشہ اُسکی بیماری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ وہ دور تھا جب مدھو بالا کی قسمت اپنے عروج پر تھی۔ وہ ایک طرف دل کے ہاتھوں لٹ چکی تھی دوسری طرف وہ دل کو روگ لگا بیٹھی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ اُسکی زندگی کا سنہرا دور تھا جب کہ اُسکی ایک کے بعد ایک فلم کامیابی سے ہمکنار ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے ''کالا پانی''، ''پھاگن''، ''برسات کی رات''، ''ہوڑہ برج''، یا ''چلتی کا نام گاڑی''۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت بھوشن اور پردیپ کمار بھی مدھو بالا سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے مگر وہ ایک ہی آدمی سے پیار کرتی تھی جس کا نام یوسف خان یعنی دلیپ کمار تھا۔ فلم ''چلتی کا نام گاڑی'' کی فلمبندی کے دوراں وہ کشور کمار کے قریب آ گئی۔ کشور کا بھی اپنی پہلی بیوی ریما سے طلاق ہو چکا تھا۔

مدھو بالا دل کی شدید بیماری میں مبتلا تھی، یہ تو کچھ لوگ جان گئے تھے مگر وہ کونسی بیماری میں مبتلا ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ طرح طرح کی دوائیاں استعمال کرتی تھی مگر بقول غالب کے ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔''

مدھو بالا کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ 1960 میں اُس نے لنڈن جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ لنڈن جانے سے پہلے کشور کمار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اصل میں وہ دلیپ کمار کو جلانے کے لئے یہ شادی کر رہی تھی۔ اُسکے گھر والے اس شادی کے حق میں نہ تھے۔ عطا اللہ خان نے اُسے بہترا سمجھایا کہ وہ جلد بازی نہ کرے۔ پہلے وہ ڈاکٹر کی صلاح لے اور پھر ازدواجی رشتے میں بندھ جائے مگر وہ نہ مانی اور کشور کمار کے ساتھ کورٹ میرج کر لی۔ کشور کے گھر والے اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ اُنکی خوشنودی کی خاطر مدھو بالا نے ہندو رسم و رواج کے مطابق بعد میں کشور کمار سے لگن کیا۔ اور اُسکے بعد وہ علاج معالجے کے لئے لنڈن چلی گئی۔ وہاں جب بیماری کی تشخیص ہوئی تو مدھو بالا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسکے دل میں سوراخ تھا۔ اُن دنوں اس روگ کا علاج دستیاب نہ تھا۔ اُنہوں نے اسکا آپریشن کرنے سے منع کر دیا اور اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ

پائے گی۔اُسے مکمل آرام کرنا چاہے اور کام کاج سے احتراز کرنا چاہے۔وہ آنکھوں میں آنسو اور دل میں بے پناہ درد لئے واپس وطن لوٹ آئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کشور کمار کو جب مدھو بالا کی بیماری کی حقیقت معلوم پڑ گئی تو اُس نے اُسے اپنے میکے میں چھوڑ دیا۔مدھو بالا کی بہنوں نے کشور کمار پر کئی طرح کے الزامات عائد کئے جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کشور کمار نے مدھو بالا کی خاطر اپنے جنسی جذبات کا گلا گھونٹا اور اُسے الگ رہنے پر مجبور کیا۔وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر نے کشور کمار کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اُس نے اپنی بیوی سے کسی طرح بھی جسمانی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی تو اُسکی موت فی البدیہہ ہوسکتی ہے۔مدھو بالا سے اُس نے یہ بات چھپا کے رکھی۔مدھو بالا ایک بیوی کے ناطے اُس سے اس چاہ کا تقاضا کرتی رہی مگر وہ اُسے ٹالتا رہا۔جب بات حد سے بڑھنے لگی تو کشور کمار اُسے اُسکے میکے چھوڑ کر آ گیا۔یہ ایک اور ستم تھا جو اُسے سہنا پڑ رہا تھا پر وہ اتنی بہادر تھی کہ یہ جان کر بھی کہ وہ ایک سال سے زیادہ جینے والی نہیں ہے اُسنے کئی فلمیں سائن کیں جن میں سے کئی مکمل بھی ہوئیں۔گھر والے اُسکے کھانے پینے میں کافی احتیاط برتنے لگے تھے۔وہ باہر کا کھانا کبھی نہیں کھاتی تھی۔پانی بھی وہ ایک خاص کنوئیں کا ہی پیتی تھی۔

جب وہ لنڈن سے لوٹ کر آئی اور اُسنے کام کرنے کا اعلان کیا تو پورے پرنٹ میڈیا نے اس خبر کو شہ سرخیوں میں چھاپا۔پہلی فلم جو اُس نے سائن کی وہ تھی راجکپور کے مد مقابل فلم ''چالاک''۔وہ جس دن اسٹوڈیو میں فلم کی شوٹنگ کرنے گئی ،اسٹوڈیو میں دیوالی کا سا سماں تھا۔اُسکی آمد پر فوٹو گرافر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔وہ حسب عادت مسکرا رہی تھی مگر وہ کافی مضمحل اور تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔چند دنوں کی شوٹنگ کے بعد وہ ایک دن اسٹوڈیو میں چکرا کے گری اور اُسکے بعد وہ پھر کبھی اُٹھ نہیں پائی۔اُسکے چہرے کا رنگ ڈھل گیا۔اُسکی شوخ مسکراہٹ درد و یاس کے دبیز پردوں میں کہیں چھپ گئی۔وہ غم و یاس کی مورت بنی گھر کے پلنگ پر پڑی رہتی تھی۔اب تو ملنے جلنے والوں میں بھی کمی آنے لگی تھی۔اس فلم نگری کے بارے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ یہاں چڑھتے سورج کی سبھی پوجا کرتے ہیں،ڈوبتے سورج کو کوئی نہیں پوچھتا۔

ایک دن مدھو بالا نے شکتی سامنت کو اپنے گھر پر بلا لیا۔اُس دن اُس نے اپنے چہرے پر ڈھیر سارا میک اپ تھوپ لیا تھا۔شکتی سامنت اُسے اس روپ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔اُس نے مدھو بالا سے پوچھا کہ پہلے تو وہ کبھی بھی میک اپ نہیں کرتی تھی ،آج اُسنے اتنا میک اپ کیوں کیا ہے۔وہ روتے ہوئے بولی کہ وہ اب تک جس مدھو بالا کی شبیہہ اپنی آنکھوں میں بسائے بیٹھے ہیں وہ نہیں چاہتی کہ وہ شبیہہ تار تار ہو جائے۔اصل میں بیماری کے سبب اُسکے چہرے کی آب و تاب پوری طرح سے ڈھل چکی تھی۔ایک پھول تھا جسے بھری بہار میں خزاں سے ہم کنار ہونا پڑا تھا۔وہ پوری طرح سے مرجھا چکی تھی۔اپنی خوبصورتی کا بھرم رکھنے کے لئے اُسنے پہلی بار اتنے سارے میک اپ کا سہارا لیا تھا۔وہ اپنی روداد سنائے جا رہی تھی اور اسکے بعد وہ شکتی سامنت کے کاندھے پر سر رکھ کر پھپک پھپک کر روتی رہی۔

مدھو بالا کے گر پڑتے ہی سب نے اُس سے آنکھیں پھیر لیں۔وہ پل پل مرتی رہی۔وہ جینا چاہتی تھی۔دلیپ کمار نے اُسے ایک بار پھر علاج معالجے کے لئے لنڈن جانے کی پیشکش کی مگر مدھو بالا جانتی تھی کہ وہاں جانا اب بے سود ہے کیونکہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔وہ بس اپنے پلنگ پر کئی مہینوں تک پڑی رہی۔اُس کا انتقال 36 برس کی عمر میں ہوا۔وہ پورے شباب کے عالم میں جوان مرگ ہوگئی۔کمال کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹروں نے اُسکی جینے کی مدت ایک سال طے کی تھی جب کہ وہ چھ سال تک زندہ رہی۔جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس وقت دلیپ صاحب لنڈن میں تھے۔یہ منحوس خبر سنتے ہی وہ فوراً وطن واپس لوٹے۔جب وہ بمبئی کے ائیر پورٹ پر اُترے تو گھر جانے کی بجائے سیدھے شانتا کروز قبرستان چلے گئے جہاں اُنہوں نے فاتح پڑھی اور مدھو بالا کی قبر پر پھول چڑھائے۔اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ بیٹھ کر بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

مدھو بالا تو اس جہان فانی سے کوچ کر گئی تھی اور جو لوگ اُسکے آگے پیچھے منڈھلاتے رہتے تھے وہ ایک ایک کر کے اُسے بھولتے چلے گئے مگر ایک شخص ایسا تھا جو اُسکی موت کے بعد بھی اُسے بھلا نہیں پایا۔وہ شخص تھا یوسف خان عرف دلیپ کمار۔میں نے خود دیکھا ہے کہ جب بھی مدھو بالا کا زکر ہوتا تھا تو وہ یہ نام سنتے ہی درد کے انگاروں پر لوٹنے لگتے تھے۔اُنکی آنکھوں میں درد چھلکنے لگتا تھا۔وہ اب بھی اُن کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی جب بھی اُسکا نام لیا جاتا تھا تو دلیپ صاحب کے دل کا تار تار جھنجنانے لگتا تھا اور وہ چپ چاپ اس درد کو پیتے چلے جاتے تھے۔مدھو بالا تو چلی گئی مگر دلیپ صاحب کے دل میں ایک کسک ،ایک خلش بن کر رہ گئی۔جب بھی دلیپ کمار کو مدھو بالا کی یاد آتی تھی تو اُسکی یاد اُسے لہولہور لا دیتی تھی۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا تھا۔افسوس کہ ان دو پریمیوں کا ملن نہ ہوسکا۔اگر ملن ہو جاتا تو شاید یہ پریم کہانی اپنے اندر اتنی لطافت اور اتنی لذت چھپائے نہ ہوتی۔جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے یہ پریم کہانی اسی طرح دہرائی جائے گی۔

''سیاسی کارکن''

ایک پختہ سیاسی کارکن کے لیے مطالعہ اشد ضروری ہے۔مطالعہ کے بغیر قوت فیصلہ پیدا نہیں کی جا سکتی۔مطالعہ کے بغیر سیاست نفع کی بجائے نقصان کا باعث بنتی ہے۔تیسری دنیا کے ممالک میں استعمار کے مسلط کردہ پارٹیوں کے لیڈر بنیادی سیاسی مطالعے سے بھی محروم ہے۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈر عوام کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کے طلسم میں بند نظر آتے ہیں۔

نیلسن منڈیلا

''دھرتی دامان''

کملی جہی ایہہ کون اے

حنیف باوا
(جھنگ)

اُوچی لمی
تِلی پتنگ
پت جھڑ دے اک پتّے وانگ
سکّی سڑی
پُھل گلاب دی پتی جہی
ہلکی پُھلکی، ایہہ کون اے
نہ اکھیاں وچ کجلا پایا جِنے
نہ بلھیاں تے ملیا سکّ
نہ موہڈے تے وال کھلارے
کالا جھونا گل وچ پایا جِنے
پیراں دے وچ جیدے
جُتّی منگویں جہی
ایہہ کون اے بھلیو
جہڑی
اپنی جھوک دیاں گلیاں دے وچ
غوجھاتی ہو کے پھردی
جو
نہ بولے نہ چالے
بس اگّے وڈّھ وڈّھ
بُرچھا گردی دتے
مظلوماں نوں۔۔۔
وار و واری گل نال لا کے
روندی جاوے
بس روندی جاوے
دُکھ اونہاں توں کھوہندی جاوے
جھلی جہی ایہہ کون اے
ایہہ بی بی رانی کون اے
جہیڑی
دکھیاراں دے۔۔۔
اتھروآں دے ہر تبکے نوں
اک ماں دے وانگ
اپنے کالے جھونے وچ
بوچن لیتی
کلم کلّی
کدی اس بُوہے ول جاندی
کدی اوس بوہے ول
مشیت
ساڈے راجے بھوج وی
اپنی اوچی ماڑی دے
اک نکے جہے جھروکے وچوں
نمانی جہی گنگو تیلن
اس کافر جہی نوں تکیا ہووے
تک کے مشیت
ہسّا ہووے

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

محبی گلزار جاوید صاحب، تسلیم

''چہارسُو'' جولائی اگست ۲۰۱۹ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بتہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اعزاز کے لائق جانا، اگرچہ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ آپ نے لگ بھگ پچیس (۲۵) برس پہلے سلسلہ جنبانی کی تھی اور ایک سوالنامہ بھیجا تھا۔ جو بھی تاخیر ہوئی، اور میرے تساہل سمیت تاخیر کے جو بھی اسباب رہے ہوں، اس کا ذمہ دار میں اور صرف میں ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ کہ آپ نے ایک نیا، دوسرا یا تیسرا، سوالنامہ بھیج کر مجھے شرمندہ اور زیربار کیا۔ نیز فیصل عظیم کی وساطت سے آپ کی تاکید اور یاددہانی بھی مجھ تک پہنچی تھی۔

آپ نے کہاں کہاں سے مضامین تلاش کئے یہ آپ کا حوصلہ تھا۔ پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر حنیف فوق، محمد علی صدیقی، انور سدید، افسر ماہ پوری، منظر علی خاں، اکرام بریلوی، اور محمود واجد سب کے سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ اُن سب کی مغفرت فرمائے۔ آخرالذکر (محمود واجد) کا مضمون میری شاعری پر پہلی تحریر ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی (مدیران: اعجاز صدیقی، کرشن چندر، اور مہندر ناتھ) کے شمارے بابت مارچ اپریل ۱۹۶۱ء میں میرے پہلے شعری مجموعے ''رگِ ساز'' کے منظرِ عام پر آنے کے چھ برس قبل شائع ہوا تھا۔

چند روز پہلے میرے کرم فرما ڈاکٹر سید تقی عابدی نے رسالے کے ملتے ہی پُرخلوص شکایت کی کہ انہیں ''چہارسُو'' کے اس شمارے کا علم نہیں تھا ورنہ وہ اس کے لئے میری شاعری سے متعلق کوئی مقالہ قلمبند فرماتے۔ مشمولات کی حد تک سوائے سوالنامے کے جوابات کے میں بھی قطعاً لاعلم تھا۔ البتہ میں نے کچھ مشاہیر کے خطوط کی عکسی نقلیں فراہم کی تھیں، سو مجھے گمان ہوا کہ اُن میں سے دس پندرہ آپ کے (یا فیصل عظیم کے؟) نزدیک غیر اہم یا غیر معروف نام ٹھہرے ہوں گے۔ ان کی عدم موجودگی کا یہی جواز رہا ہوگا یا پھر صفحات کی کمی آڑے آگئی ہوگی۔ سوالنامے کے جوابوں کے سلسلے میں بھی آپ کی قینچی کہیں کہیں ردّی کی ٹوکری کی معاونت کرتی محسوس ہوئی۔ نتیجے میں اُن مقامات پر بات نامکمل یا وضاحت طلب نظر آئی۔

رئیس امروہوی، خادم حسین صدیقی (صدر نشین، الائیڈ بینک آف پاکستان)، شبنم رومانی، رشید امجد، نسیم سحر، اور مشہود حسن رضوی کی تحریروں سے اقتباسات درج کرکے آپ نے میری مزید قدر افزائی کی۔ ص۔۳۰ پر میر تقی میر کا ایک شعر (تیسرا) میرے کھاتے میں درج ہوگیا ہے۔ شاید انوار شریف (لاہور) کی میرے مجموعوں تک رسائی نہیں رہی ہوگی۔ رسالے کی پشت پر لگی آٹھ تصویروں میں سے بیشتر آپ نے فیس بک سے اکٹھی کی ہوں گی۔ شاید اس سلسلے میں ایک ذرا سی تفصیل مناسب رہے گی۔ تصویروں کا پس منظر یکے بعد دیگرے یوں ہے:

پچھلے برس (۲۰۱۸ء میں) پاکستان کی سیاسی رہنما ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کے ہاتھوں سے آٹوا، کینیڈا میں فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینس کی تقریب میں انعام لیتے ہوئے۔ اب وہ وزیر اعظم عمران خاں کی کابینہ میں شامل ہیں۔

چار مہینے قبل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، کی سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس میں روسی ادیبہ ڈاکٹر لُدمیلا وسیلوا کے ساتھ جنہوں نے روسی زبان میں لکھی ہوئی اپنی کتاب یہ کہہ کر پیش کی کہ اس میں ''آپ کا تذکرہ اور آپ کی نظموں کے حوالے ہیں''۔ انہوں نے کتاب کے متعلقہ صفحات بھی نشان زد کئے۔

فیض احمد فیض کے ساتھ کی تصویر نومبر ۱۹۸۰ء کی ہے جب وہ آٹوا، کینیڈا، تشریف لائے تھے۔

۱۹۸۸ء میں علی صدیقی مرحوم کے زیر اہتمام منعقدہ چار روزہ عالمی کانفرنس، نئی دہلی، میں مشہورِ زمانہ، یگانۂ روزگار فلمی شخصیت دلیپ کمار کے ہاتھوں سے الطاف حسین حالی ورلڈ اردو ایوارڈ لیتے ہوئے۔

۱۹۹۱ء کی تصویر ہماری بیٹی سیمیں کی شادی میں کراچی کے اواری ہوٹل میں جمیل الدین عالی، طیبہ جمیل، سعید اختر درّانی، اور فاطمہ حسن کے ساتھ۔ ایک تصویر علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن، آٹوا گروپ، کے مشاعرے کے اختتام پر۔

۱۹۸۴ء ہوٹل جبیس کراچی کی تصویر پاکستان رائٹرس گلڈ کے زیر اہتمام منعقدہ مکتبہ افکار (صہبا لکھنوی) کے شائع کردہ میرے مجموعے ''بے نشان'' کی تقریب رونمائی کے موقعے پر کی ہے۔

سب سے نیچے کی تصویر: کینیڈا کے نئے گورنر جنرل رے نیتی شن کے اعزاز میں وزیر اعظم برائن ملرونی کے دئے گئے استقبالیہ کے دوران کی ایک جھلک۔

بہت کچھ لکھنا باقی رہ گیا۔ لیکن تجربہ ہے کہ آپ سارے تاثرات چھاپتے بھی نہیں، اور مجھے وقت بھی لگتا ہے اور محنت بھی پڑتی ہے۔ آپ کی اپنی مجبوریاں، میری اپنی مجبوریاں۔

حسابِ دوستاں در دل۔

انوار شریف، محمد انعام الحق، فیصل عظیم، فاری شاہ، اور عطیہ سکندر علی کے شکریے کے ساتھ۔ آپ کی توجہ کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

پس نوشت: میری غلطی سے ایک سوال کے جواب میں ٹائمس لٹریری میگزین درج ہوگیا جبکہ اصل نام ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ (The Times Literary Supplement TLS) ہے۔

ایک ضروری تصحیح: میرے انیس (۱۹) مکتوب نگاروں میں ایک ٹورنٹو کینیڈا میں مقیم میرے دوست، شاعر، اور نقاد اشفاق حسین ہیں اشفاق احمد نہیں۔

شاہین (کینیڈا)

میرے گلزار، خوش رہو۔

عمر بڑھنے کے ساتھ بے کیفی جگہ پا رہی ہے جس کے سبب کئی شماروں سے غیر حاضر ہوں۔ میرے لیے تو چہارسو جینے کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ نہیں معلوم قارئین چہارسو نے میری غیر حاضری پر کیا ردِ عمل ظاہر کیا۔

ہمیشہ کی مانند اس بار بھی تم نے ایک کوہِ گراں سر کیا ہے۔ شاہین صاحب مزاجاً ترقی پسند ہونے کے باوجود شاعری میں بہت گہرے اور تجربات کے آدمی لگتے ہیں۔ درد اور کسک کی ایک لہر بھی اُن کے کلام میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ تمہارے تلخ و تند سوالات کے جوابات بھی اُن کے مزاج کے ٹھہراؤ اور بُردباری کا پتہ دیتے ہیں۔ میرے خیال میں زیرِ نظر چہارسو اردو ادب کے قاری کے لیے ایک بیش قیمت دستاویز سے کم نہیں۔

افسانے سبھی موضوع اور برتاؤ کے لحاظ سے منفرد ہیں مگر ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے ایک جیتے جاگتے کردار کے گرد جس طرح کہانی کا تانا بانا بُنا اور جس قدر چست جملے استعمال کیے اُس نے کہانی کو ایک نیا رنگ، نیا ذائقہ اور نئے تجربات سے قاری کی تہذیب اور تربیت کی عمدہ کوشش کی ہے۔

''جشنِ بیقراری'' لکھنے پر دل کی ساری دعائیں تم پر نچھاور۔ اپنے مخصوص انداز کو نئے جملے اور محاوروں کی مدد سے چوکھا رنگ دے کر معاشرے کی ایسی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے جو تیسری دنیا میں قدم قدم پر بدصورتی کو ہوا دے رہی ہے۔ مجھے اس وقت جوش ملیح آبادی شدّت سے یاد آ رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے آخری دہے میں ساحر لدھیانوی کی نظم ''ثنا خوانِ تقدیس'' کے زیرِ اثر بازارِ حسن میں جسم فروشی پر پابندی لگائی گئی تو جوش صاحب نے فرمایا: ''گندگی کا ڈھیر اپنی جگہ پر نہ رہنے دیا گیا تو گلی گلی، محلے محلے اور گھر گھر گندگی کے ڈھیر لگ جائیں گے۔''

تابش خانزادہ نے سالوں سے قارئین چہارسو کو بڑی خوبصورتی سے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ اب دیکھئے وہ اس کو خوبصورت موڑ دے کر اختتام کو پہنچاتے ہیں یا نئے موضوعات و واقعات کی مدد سے قاری کی دلچسپی برقرار رکھتے ہیں۔

فیروز عالم سدا بہار تھے، سدا بہار ہیں اور سدا بہار رہیں گے۔ میرا بس چلے تو میں اُن کے تحریر کردہ طبّی مضامین کو کتابی شکل دے کر ہر گھر کے لیے لازمی قرار دے دوں۔

تشدد اور نفسانفسی کے دور میں ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ساہتیہ اردو اکادمی، چنڈی گڑھ سے آیا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ برادرِ محترم و مکرم مہندر پرتاپ چاند صاحب کو فخرِ ہریانہ کا خطاب، مبلغ تین لاکھ روپے نقد، قیمتی شال اور پلاک سے سرفراز کر کے نہ صرف اردو ادب کی عزت افزائی کی بلکہ احبابِ مہندر پرتاپ چاند کو بھی عزت بخشی ہے۔ مزید خوشی کی خبر یہ ہے کہ دیگر پچیس اہلِ قلم کو بھی مختلف ادبی خدمات کے صلے میں کئی طرح کے اعزازات و انعامات سے سرفراز کیا گیا جن میں سرِ فہرست میری منہ بولی بیٹی رینو بہل بھی شامل ہے۔ اس لڑکی نے جس طرح کم وقت میں زیادہ محنت کر کے خود کو نمایاں کیا ہے اُس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

پیارے بھائی گلزار جاوید، سلامت رہیں۔

چہارسو کا قرطاس اعزاز بنام سید ولی عالم شاہین ملا۔ اگرچہ پچاس سال سے امریکا میں رہنے کی وجہ سے میں شاہین صاحب کے نام یا انکے کام سے واقف نہیں تھا مگر انکے نام مشاہیر اردو ادب کے خطوط دیکھ کر ''ہوش ٹھکانے'' آ گئے کہ کیسے کیسے مایہ ناز قلم کار اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور آپ کس جانفشانی سے ان بظاہر گمنام ادیبوں کو تلاش کر کے ہم جیسے کم علم اور بیخبر لوگوں کے علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ویسے یہ تو گزشتہ ۲۸ سال سے آپ کا طرہ امتیاز رہا ہے کہ آپ نہایت خلوص سے ان گمشدہ جواہر کو تلاش کر کے انہیں عزت دیتے ہیں۔ آپ کی اس فراخ دلانہ فطرت سے جن لوگوں نے فیض اٹھایا ہے ان میں سر فہرست تو میں خود ہوں جو نہ تو کسی ''جوہر'' کی تعریف میں آتا ہوں نہ ہی کسی طور پر ادیبوں کی فہرست میں ہوں۔ آپ نے جس خلوص اور نیک نیتی سے میرا نمبر نکالا اس کی ایک مثال تو یہی ہے کہ موجودہ شمارہ جو میرے نمبر کے تقریباً چھ ماہ بعد آیا ہے اسکے خطوط میں بھی اس خاکسار کے لئے چند بہت اچھے خط ہیں۔ ان سب کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا اور آپکا بیحد شکریہ۔

اب شاہین صاحب کے لئے (جن کے نام کے دو حصے میرے ہم نام ہیں ایک سید دوسرا عالم، کیونکہ میرا قانونی نام سید فیروز عالم ہے)۔ لگتا ہے انکی راہ و رسم اور رابطے اردو کے بڑے بڑے لوگوں سے ہیں جن میں جمیل جالبی، ساقی فاروقی، احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی اور قمر رئیس شامل ہیں۔ میں تو ان لوگوں کی خاک پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ اس بات کا نا قابل تردید ثبوت ہے کہ شاہین صاحب کی تخلیقات اردو ادب میں اعلیٰ معیار کی قرار دی گئی ہیں اور انہوں نے ان لوگوں کی نظر میں خود کو منوایا ہے۔ اس شمارے میں میں نے بھی انکی چند تخلیقات پڑھیں جو بہت متاثر کن ہیں میں خود کو اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ لکھنے کے قابل نہیں پاتا۔ یہ ضرور لکھوں گا کہ ان پر محمود واجد کا ''تاروں کو چھونے کی ہوس'' نے مجھے بہت متاثر کیا۔

دوسرے مشمولات میں بشیر مالیر کوٹوی کا ''با مشقت'' اور محمد حامد سراج کا ''نماز قصر'' بہت پسند آیا۔ انہی پر سیمیں کرن کا مضمون بھی حاصل مطالعہ ہے۔ شاعری کا حصہ عموماً بعد میں پڑھتا ہوں، ابھی اسکا موقع نہیں ملا۔

اب ذکر ہو جائے ایک چونکا دینے والے افسانے کا اور یہ ہے آپ کے قلم کا کمال ''جشن بیقراری''۔ شروع کرتے ہی قاری اس کی گرفت میں آ جاتا ہے پھر آپ کی زبان، یہ تو میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ آپ کس کمال کی چٹخارے دار زبان لکھتے ہیں۔ مجھے آپ کا ''بتاتا ہوں کی جگہ بتلاتا ہوں'' لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ پھر شیخ صاحب کی شخصیت کا جو نقشہ کھینچا ہے جس میں انکی داڑھی پر چائے

پیتے اور رسک کھاتے ہوئے اسکا کوئی ٹکڑا انکی داڑھی پر اٹک جانے کی تصویر کشی!! افسانہ مختلف ادوار اور زمانوں پر مشتمل ہے۔ تقسیم سے پہلے کا زمانہ پھر گردش دوراں، نورے کا شیخ نور الٰہی بننا اور پھر موجودہ، کنبے کی خود غرضی اور مطلب براری، آپ کا افسانے کے بہاؤ پر مکمل کنٹرول رہا ہے اور آخیر۔۔ جہاں قاری کے ذہن پر ایک شدید جھٹکا اور پھر

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نا ہو ممکن

اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

بس کیا لکھوں آج تک اسکے سحر یا پھر یوں کہیں اس کے تجسس میں مبتلا ہوں۔ واقعئی آپ کا اپنا ایک اسلوب ہے جو سب سے جدا ہے۔ خوب بہت خوب۔ چہارسو کے قارئین کے لئے مجھے محبت اور عزت دینے کے لئے، بہت سے شکرانوں کے ساتھ نیک خواہشات۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

کمپیوٹر کی سکرین پر ولی عالم شاہین سے منسوب شمارہ نظر سے گزرا تو دل سے بے شمار دعائیں نکلیں۔ واللہ کیا خوب انتخاب، ترتیب و تنظیم ہے۔ دیارِ غیر میں رہ کر جو لوگ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اُن کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کر کے آپ ایک اہم کام کر رہے ہیں۔ میری نظر سے سعید نقوی، پروین شیر، یونس شرر، فیروز عالم اور اَب ولی عالم شاہین سے منسوب جتنے شمارے بھی گزرے ہیں سب اپنی جگہ خوب ہیں۔ سنا ہے اس سے پہلے آپ غضنفر نمبر بھی نکال چکے ہیں جس کی تعریف یہاں کے ادبی حلقوں سے سُن چکا ہوں۔ یقیناً آپ نے میرے حصے کی کاپی ارسال کی ہوگی جو محکمہ ڈاک کی کرم فرمائی کی نذر ہو گئی۔ زحمت نہ ہو تو غضنفر نمبر کی سافٹ کاپی دوبارہ ارسال کر دیجیے۔

جمیل عثمان (نیویارک)

جناب گلزار جاوید، آداب۔

چہارسو با قاعدگی سے موصول ہو رہا ہے۔ ہر شمارہ بھرپور اور پُر اثر تحریروں سے مزین ہوتا ہے۔ پچھلے شمارے میں گوشۂ فیروز عالم آپ کی عمدہ کاوش تھی۔ ڈاکٹر فیروز عالم یقیناً اسی عزت وقار کے حقدار ہیں۔

شمارہ مئی جون میں آپ نے پروفیسر غضنفر کو قرطاسِ اعزاز کے لیے منتخب کیا اور خوب کیا۔ سرحد پار بسنے والی علمی، ادبی شخصیت کی زندگی کے تمام گوشے منور کر دیے۔ اتنا کچھ ہے اس شمارے میں کہ کہیں کوئی تشنگی نہیں۔

شگفتہ نازلی کو چہارسو میں دیکھتی ہوں تو گزشتہ صدی کی آخری دہائی یاد آ جاتی ہے تب ان سے کافی ملاقاتیں رہیں۔ اکادمی ادبیات لاہور کے دفتر میں اکثر ہم اکٹھے ہوتے تھے۔ اب وہ لاہور میں ہیں اور میں بھی مگر ملاقات چہارسو کے طفیل ہوتی ہے۔ ان سب مہربانیوں کے لیے آپ کا شکریہ۔ پروین شاکر ٹرسٹ نے اسلام آباد میں کانفرنس میں بلایا تھا تب میری ساتھی طاہرہ اقبال بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بس آپس میں کوآرڈینیشن نہیں ہو سکا ورنہ میں بھی ان کے ہمراہ ویسٹریج تھری پہنچ جاتی۔ انشاء اللہ اب اسلام آباد آئی تو ضرور حاضر ہوں گی اور منیرہ شمیم اور جمیلہ شبنم کو بھی زحمت دوں گی تا کہ سب ایک جگہ مل بیٹھیں۔

تسنیم کوثر (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

سید ولی عالم شاہین نے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار اردو شاعری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے بھارت، پاکستان اور اب کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے دوران اپنے تجربات اور خیالات کو غزلوں، نظموں اور گیتوں کی شکل دے کر غیر معمولی ادبی خدمات انجام دی ہیں جن کی وجہ سے انہیں تینوں ممالک میں خوب پذیرائی ملی ہے اور اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اب تک ان کے سات شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان کی شاعری پر ونوابھاوے یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دی جا چکی ہے۔ تازہ شمارہ شاہین صاحب کے نام منسوب کرنے پر آپ دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے شامل ہیں۔ آپ کا لکھا ہوا افسانہ ''جشنِ بیقراری''، تقسیم ہند کے پس منظر میں فسادات، ہجرت اور مفاہمتی حالات کی ایک دلچسپ کہانی ہے جو بڑی خوبصورتی اور دلچسپ پیرایہ میں تحریر کی گئی ہے۔ جہاں کئی خاندان لٹ گئے تو وہاں دوسری طرف کئی نو دولتیے بن کر عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوئے۔ انہیں میں ایک نورا بھی تھا جو بقول ''مایا تیرے تین نام۔ پرسو۔ پرسا۔ پرس رام۔'' نورا سے نور الٰہی، شیخ نور الٰہی اور حاجی نور الٰہی بن گیا۔ البتہ دولت کے صحیح استعمال سے زاہد ہونے کی وجہ سے اپنے ہی خاندان میں ایک تماشا بن گیا۔

انل ٹھکر کا افسانہ ''برگِ آوارہ'' ایک دلچسپ تحریر ہے جو مذہب کے حوالے سے بھی فنی طور پر بہترین انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ افسانہ گداگروں کی دنیا اور ان کے طور طریقوں سے پردہ اٹھاتی ہے جو قاری کے لیے عام طور پر حیران کن ہے۔ محمد بشیر مالیر کوٹلی نے ''بامشقت'' میں ازدواجی زندگی میں غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کربناک نتائج کی ایک مثال پیش کی ہے جو باعث سبق ہے۔ ازدواجی زندگی میں خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کے لیے دونوں طرف احتیاط سے کام لینا لازمی امر ہے تا کہ کسی قسم کا شک وشبہ جنم نہ لے سکے۔ مذہب نے بھی اس حوالے سے بہترین حدود قائم کر رکھی ہیں۔ ''نمازِ قصر'' محمد حامد سراج صاحب کا افسانہ جذبات اور مذہبی اصولوں کے حوالے سے حساس دل سے نکلی ہوئی ایک دلچسپ تحریر ہے۔ بیٹی جو ماں باپ کے ساتھ جوانی تک ایک عمرِ عزیز گزار کر شادی کے بعد اپنے نئے گھر منتقل ہو جاتی ہے تو یکا یک ماں باپ کا گھر قانونی اور شرعی حوالہ سے اس کا گھر نہیں رہتا بلکہ جب وہ مختصر قیام کے لیے وہاں آتی ہے تو اس حوالہ سے وہ اپنے گھر سے باہر سفر میں ہوتی ہے اور اُسے مختصر نماز

یعنی نمازِ قصر بھی ادا کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

شاعری میں شاہین، یونس شرر، محمود شام، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل، عرش صہبائی، عارف شفیق، رفیع الدین ذکی، رومانہ رومی اور پروین شیر کا کلام متاثر کن ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

"چہارسُو" کا تازہ بہ تازہ شمارہ اپنے ادبی وقار کے ساتھ یوم وفات بابائے اردو مولوی عبدالحق یعنی ۱۶۔ اگست کو نظر نواز ہوا۔ سرورق پر شاہین صاحب کی تصویر دیکھ کر نوے کی دہائی میں سفر کیا اور مجموعہ "بے نشان" کی منفرد غزلیں ذہن میں آنے لگیں۔ ان کی نظمیں بھی مطالعے میں رہی ہیں مگر آپ نے تو کمال کیا ہے "براہِ راست" میں آپ کے سنجیدہ اور گہرے سوالات کے جوابات تفصیل سے دیے اُن کے جوابات میں اردو، انگریزی ادب اور مختلف علوم وفنون کے مطالعے کی جھلک نمایاں تھی۔ انڈیا سے ڈھاکہ، ڈھاکہ سے اسلام آباد پھر کینیڈا ہجرت والے سوالات کو ذرا گول کر گئے۔ آپ نے کیسے کیسے بڑے بڑے اہل علم و فن کے مضامین جمع کر دیے۔ پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر انور سدید، محمد علی صدیقی، اکرام بریلوی، حنیف فوق اور دیگر محمد علی صدیقی مرحوم کے یہ جملے اُن کی شاعری کے حوالے سے کتنے سچے ہیں۔

"شاہین کی شاعری کا بنیادی محور "بے زمینی" اور "بے نشانی" کا غم ہے۔" (ص۔۳۰)

نسیم سحر صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ "شاہین نے نظم میں بے شمار ہیئتی تجربات کیے ہیں۔" ۔ "آوارۂ شب" کے عنوان سے فاری شا نے غزلیات کا کیا شاندار انتخاب پیش کیا ہے۔ انوکھی غزلیں قافیے مختلف:

اک زخمِ دل و دیدہ ہی سرمایا ہے میرا
ہو، تک جو نہ کر پائے وہ درویشِ ادب ہوں

دنیا گھوم کے لوٹ آئے ہیں ڈھونڈیں اور ٹھکانے کیا
اچھے بُرے یہ لوگ ہیں جیسے سارے اپنے طور کے ہیں

عطیہ سکندر نے نظموں کے انتخاب میں محنت کی ہے۔ موضوعات کے تنوع کا خاص خیال رکھا ہے۔ فیصل عظیم نے شاہین صاحب کے اہم خطوط ترتیب دیے ہیں۔ ان سے شاہین صاحب کی ادب سے گہری وابستگی اور ادیبوں سے رابطے کی تصویر سامنے آتی ہے۔

"جشنِ بیقراری" افسانہ کیا ہے بین الاقوامی المیہ ہے دنیا کے جس خطے میں بھی ہجرت ہوئی وہاں ایسے ہزار ہا مناظر دیکھنے، سننے اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ مسلمانوں نے نبی کریمؐ کی ہجرت سے بھی سبق نہیں سیکھا۔ عوام (سب نہیں) نے آزادی کا مفہوم سمجھا اور اقلیتوں کی مجبوریوں سے ہر کسی نے فائدہ اٹھایا۔ اس ملک میں بھی ہزاروں حاجی شیخ نور الٰہی جیسے لوگ شرافت کا لبادہ اوڑھے آج بھی عوام اور ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ طاہرہ اقبال ایک معروف و کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانہ "بازا کا بُت" ان کے خاص ڈکشن سے مختلف ہے۔ افسانے کے تین پہلو ہیں۔ حُسن، جنس اور مفاد پرستی۔ ایک حسین ترین نامکمل مرد جس کو دیکھنے کے لیے لوگ منتظر اور بے قرار رہتے ہیں مگر دولت مند گھر والے اُس کے سبب شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ گھر میں قید رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ملک میں انتخابات میں بدلتے ہوئے حالات دیکھ کر بھرے جلسے میں اُسے اپنا سیاسی جانشین اور مستقبل کا راہنما قرار دیتا ہے۔ اختتام میں بلا کا طنز ہے۔ محمد حامد سراج کا افسانہ "نمازِ قصر" میں بچپن باپ بیٹی کی محبت اور شادی کے بعد بابل کا گھر پرایا۔ عنوان بھی بامعنی۔ اہل ٹھکر اور محترمہ عذرا اصغر کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم ادب کے ذریعے دکھی انسانیت کا مداوا کر رہے ہیں "ایمالائی ڈوسس" کی اہم معلومات کتنے سہل انداز سے بیان کی ہے۔ محترمہ رضیہ اسماعیل، عارف شفیق، اشرف جاوید، آصف ثاقب، محمود شام، قیصر نجفی اور اختر شاہ جہاں پوری کی غزلوں کے اشعار اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ محترمہ پروین شیر کی نظم "ذات کا سچ" اپنے باطن کی تلاش کا سفر ہے۔ نظم "کاش" میں موت کی حقیقت اور فانی دنیا کا فلسفہ ہے۔ علی محمد فرشی کی نظم "ستر ماؤں کا پیار" لاجواب ہے۔ دیپک کنول نے مکیش کی داستان حیات اپنے مخصوص انداز میں پیش کی ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

گلزار چہار سو رنگ، السلام علیکم۔

تازہ چہارسو آنکھوں کا تارا دل کا سہارا بن کر آیا۔ ورق بہ ورق چہارسو ادبی لطافتیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ رسالے کی کوئی خوبی کوئی افتاد پوشیدہ از چشمِ بیگانگاں دیگانگاں نہیں۔ دیکھنے سے دل از کف دادہ ہو۔ محترم شاہین کی شاعری اور خیالات کے سبھی رموز، نکات اور واجبات خیر اندیشانہ ہیں۔ شاہین کا سحر نگار قلم جذبات کے دور سے موسموں کی سیر کراتا ہے۔ یہ سفر محض شاہین رقم ہی ہوسکتا ہے:

کتنے جتنوں بعد یہ ہنر سیکھا ہے
گھر کے گلدانوں میں درد چھپالیں گے

دیپک کنول مکیش کے سُر سنگیت اور دلی جذبات کو بدرجہ احسن سرخ رو کیا ہے۔ یہ طرزِ خاص ایک منفرد انشا پردازی کا نمونہ ہے۔ نوید سروش (میر پور خاص) یاد کرتے ہیں۔ اُن کی یادِ خلوص چہارسو کی آئینہ دار ہے۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

عزیزم گلزار جاوید، خوش رہو۔

چہارسو باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جس لگن سے تم ادب کی خدمت کیے جاتے ہو اُسے دیکھ کر تمہارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا تمہیں اسی طرح ہمت اور توانائی فراہم کرے اور تم تادیر ادب کی یونہی خدمت کرتے رہو۔

شاہین غازی پوری پھر ولی عالم شاہین اور اب شاہین کو ایک زمانے

سے پڑھ رہی ہوں اُن کے ہاں ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کی لہر بہت مدھم اور درد کی لَے لیے ہوئے ہے۔ وقت نے اُنہیں جس طرح کے صدمات پہنچائے اور جس طرح کے تجربات کا انہیں سامنا رہا اُس کے بعد اس قدر بُردباری اور ٹھہراؤ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

شکیلہ رحمان (دوبئی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ کی محبتوں اور شفقتوں کا آئینہ دار جولائی ، اگست ۲۰۱۹ء کا ماہنامہ چہارسو قدرے تاخیر سے موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز اس مرتبہ عالی مرتبت اور منفرد اسلوب کے شاعر جناب شاہین کے نام ہے۔ ان کا کلام بہت عرصہ پہلے جرائد میں پڑھنے کا موقع ملا اس وقت سے اُن کی جگہ دل میں مستحکم ہوگئی تھی۔ اب چہارسو کے ذریعے انہیں تفصیل سے جاننے کا موقع میسر آیا۔ اُن کا فن اس قابل ہے کہ انہیں قرطاسِ اعزاز بخشی جائے۔

اس مرتبہ بہت سے افسانے شامل ہیں ہر افسانہ ایک لاجواب تخلیق ہے۔ سب سے بڑھ کر آپ کا افسانہ ’’جشنِ بیقراری‘‘ منفرد اسلوب لیے ہوئے ہے۔ اب تک آپ کے جس قدر افسانے پڑھنے کا موقع ملا وہ سب اس طرح اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ غزلیات سبھی اعلیٰ پائے کی ہیں البتہ شکیب جلالی کے ہاں اس کلام سے بہت بہتر کلام موجود ہے۔ نظموں میں خلیل جبران، پروین شیر اور علی محمد فرشی کی شاعری متاثر کن ہے۔ بساطِ بشاشت میں معین قریشی نے مقصود انور کا خاکہ بڑے دلکش پیرائے میں لکھا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو میں متنوع موضوعات پر تحریریں دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ آپ جس محنت اور مستقل مزاجی سے اردو ادب کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اس پر آپ کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

نئے شمارے میں شاہین غازی آبادی کے متعلق آپ کا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ اس سے ان کی شخصیت اور فن کا ایک خوبصورت امتزاج ابھر کے سامنے آتا ہے۔ افسانے کے درخشاں دور کے حوالے سے سیمیں کرن کی تحریر نہایت متاثر کن ہے۔ افسانے اور شاعری کے گوشے اپنی اپنی جگہ پر بہار دکھاتے ہیں۔

ماضی کے ایک خوبصورت گلوکار مکیش کے بارے میں دیپک کنول کا مضمون پڑھ کر بے حد لطف آیا اور ان کے متعلق بعض نئی معلومات سامنے آئیں۔ مکیش اگرچہ کے۔ ایل۔ سہگل سے بے حد متاثر تھے لیکن ان کی گائیکی کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔

ہارون الرشید (بالاکوٹ)

محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

قرطاسِ اعزاز کا اجراء چہارسو کا امتیاز اور اختصاص ہے۔ ایک مؤقر ادبی جریدے کی جانب سے اعترافِ خدمات کی اس سے زیادہ اچھی بلکہ بہترین دوسری صورت ممکن نہیں ہوسکتی۔ آپ کی اس کاوش کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ متعلقہ اور مذکورہ ادبی شخصیت کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا یہ انداز نہایت مستحسن ہے۔ چہارسو کے اس Contribution کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ فی الوقت میرے سامنے چہارسو کا تازہ شمارہ ہے جس کا قرطاسِ اعزاز شاہین کے نام ہے۔

سید ولی عالم شاہین غازی پوری بلاشبہ ایک نابغہ روزگار ادبی شخصیت ہیں جن کی مختلف تخلیقی جہات کا اس شمارے میں بحسن وخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ بالخصوص ’’براہِ راست‘‘ کے زیرِ عنوان آپ نے اُن کا جو انٹرویو کیا ہے وہ ادبی صحافت کی صنف کا بہترین نمونہ ہے۔ اس انٹرویو میں اُن کی شخصیت اور ادبی کام کا کوئی بھی پہلو تشنہ وضاحت نہیں رہا۔ یہ آپ کی منفرد خوبی ہے کہ متعلقہ شخصیت کی نگارشات اور تخلیقات سے آپ سوالات کشید کرلاتے ہیں جس سے مذکورہ شخصیت کے بیشتر ذاتی اور تخلیقی حوالے قارئین کے سامنے آجاتے ہیں۔ انٹرویو کے لیے آپ کے مرتبہ سوالات کو میں حسنِ ترتیب اور حسنِ استفسار سے تعبیر کروں گا۔ سوالات سے قبل مختصر اظہاریہ بھی خوب ہوتا ہے۔ جہاں تک شاہین کی ادبی خدمات کا تعلق ہے صنف نظم کے ضمن میں بے شمار ہیتی تجربات شاہین کی جدتِ طبع اور تخلیقیت کے غماز ہیں۔

شاہین کے نام قرطاسِ اعزاز میں شامل محمد انعام الحق کی تعارفی تحریر ’’پیغمبری گھرانہ‘‘ فیصل عظیم کی ترتیب وتہذیب بعنوان ’’عروسِ جمیل‘‘ میں درج نامور اور معتبر اُدبا کے مکتوبات بنام شاہین بھی بہت معلومات افزا ہیں۔ شاہین کے فن پر افسر ماہ پوری، پروفیسر ممتاز حسین، محمود واجد، انور سدید، اکرام بریلوی، حنیف فوق، محمد علی صدیقی اور منظر علی خان کی ناقدانہ آرا تحقیق وتنقید کے ہر طالب علم کے لیے قیمتی سوغات ہیں۔ ان سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیق کا کوئی بھی طالب علم کسی بھی ادبی شخصیت کے حوالے سے خاکہ وکتابیات برائے ایم فل/ پی ایچ ڈی ترتیب دے سکتا ہے (کم از کم اس کی شروعات کی بنیاد رکھ سکتا ہے) اس شمارے میں ترقی پسند تحریک پر شاہین کا مضمون اختصار میں جامعیت کی بہترین مثال ہے۔ یہ تجزیہ شاہین کی ناقدانہ بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔ چہارسو کا سلسلہ قرطاسِ اعزاز میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ میری لائبریری میں تمام شمارے موجود ہیں اور میرے تحقیق طالب علم ان سے بھرپور استفادہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ چہارسو کا ایک نمایاں تفرد جس کا میں کھلے دل سے معترف ہوں وہ ہے:

’’زرِ سالانہ دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ‘‘

کم از کم میری نگاہ سے کوئی ادبی جریدہ ایسا نہیں گزرا جس نے ادبی خزینوں کو اتنی فراخی اور فیاضی سے تشنگانِ ادب میں تقسیم کیا ہو۔ ’’چہارسوٗ‘‘ کی اشاعت میں ثباتِ تسلسل آپ کے عزمِ صمیم اور مقصد سے مکمل وابستگی کا ٹھوس ثبوت ہے۔

غفور شاہ قاسم (لاہور)

...... سمندر او پر جھاگ اندر موتی ......

طویل مدت سے برطانیہ میں مقیم محترم مقصود الٰہی شیخ اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت اور بطور خاص اپنی پوپ کہانیوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں نہایت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ تر حسّاس موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جس میں ان کے مشاہدے کی گہرائی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ وہ چند الفاظ میں ایسی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں جسے پڑھ کر قاری غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اردو زبان وادب کے لئے ان کی بے لوث خدمت کا یہ دورانیہ بہت طویل ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ آسمانِ ادب پر ماہِ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کی زیرِ نظر کتاب کا نام ''سمندر او پر جھاگ اندر موتی'' ہے جسے ماہِ کامل سے خصوصی نسبت ہے:

امواج ہیں بے تاب، سمندر بھی ہے بے کل
کرتا ہے فلک پر مہِ کامل جو اشارے

غالب نے کہا تھا: ''ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے'' یہ بات مقصود صاحب پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ ان کی عظیم ادبی کاوشوں پر بے جا تنقید اور نکتہ چینی کرنے والے بھی ہیں لیکن ان کی کچھ حیثیت نہیں کیونکہ:

اُس کی بلندی تک وہ پہنچیں پھول! یہ ہے ناممکن امر
بادل گو اُس کو ہیں چھپاتے، چاند چمکتا رہتا ہے

...... تنویر پھول

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۲۲۵، دستیابی: مکتبہ جامعہ ملیّہ، اردو بازار، دہلی۔

...... آخر کب تک۔۔۔؟ ......

ادب کی تخلیق میں شاعری اور افسانے کی دونوں اصناف اپنا مطلوبہ کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ دونوں اصناف تخلیق کار کی نفسیاتی، علمی اور نظریاتی خواص و کوائف کی بازیافت و تشکیل میں اپنا حصہ ادا کرتی ہیں۔ ہماری روایت میں اُردو، کشمیری اور ڈوگری میں شاعری کے علاوہ نثر میں فکشن اپنی موجودگی اور امکان پذیری کا احساس دلاتی ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، علی محمد لون، نور شاہ، پشکر ناتھ، امین کامل اور اختر محی الدین کے ساتھ وحشی سعید اس میدان میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وحشی سعید طالب علمی کے زمانے سے ہی افسانہ نگاری میں مخصوص دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے افسانوی مجموعے ''خواب حقیقت''، ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے'' وغیرہ منظرِ عام پر آ کر قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر گئے۔ ان میں زبان، کردار اور واقعات عمومی نوعیت سے انحراف کر کے جدت اور علامت کاری کے معنی خیز نمونے ہیں۔ وحشی سعید کا قلم رواں دواں ہے اور ان کا نیا افسانوی مجموعہ ''آخر کب تک۔۔۔؟'' اشاعت کا منتظر ہے۔ یہ افسانے بھی معاصر زندگی، معاشرت، سیاست اور حکومت کے پس منظر میں اقدار شکنی، حالات و واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس میں مختصر افسانے کے ساتھ طویل افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ افسانے تخلیقیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں کتنا دور کتنا پاس، نیکی کر دریا میں ڈال، آخر کب تک، ارسطو کی واپسی، سامری، سزا کس جرم کی، کیا راون مرے گا وغیرہ ہیں۔ یہ افسانے تاریخ، حکومت، تہذیب، سیاست، معاشرت اور انسانیت کے واقعات وحقائق کو تخیلی صورت میں تبدیل کرنے کے عمل کی صورت گری کرتے ہیں۔ مصنف نے ان افسانوں کی تشکیل کے لیے ایک خواب ناک دنیا کی تخلیق کی ہے۔ تاریخی واقعات وحالات کی تخلیقی صورت گری کرنا آسان نہیں ہے۔ وحشی سعید نے یہ کام پورے ادراک اور اعتماد سے انجام دیا ہے۔ یہ تاریخ کو افسانے میں بدلنے کا عمل ہے۔ یہ تاریخ واقعات کی تقلیب ماہیت کا عمل ہے جو واقعتاً وحشی سعید کے مخصوص ہے۔ ان کے افسانوں میں جو تاریخی واقعات، واردات اور شخصیات ابھرتی ہیں وہ حقیقت سے ماورا ہو کر تخیلی حقیقت کو خلق کرتی ہیں۔

...... پروفیسر حامدی کاشمیری

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، سری نگر، کشمیر۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
امجد فہمی
بلونت سنگھ کے بہترین افسانے
گوپی چند نارنگ
ساہتیہ اکادمی نئی دہلی
اردو افسانہ عہد حاضر میں
نسیم سحر